جنوری 2021
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
جاسوسی ڈائجسٹ
کراچی
www.pklibrary.com
pklibrary.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر کے سیریز کا نیا شاہکار......

فاتح یا مفتوح

روبینہ رشید

انسان
بس تُو اتنا
یاد رکھ کہ خاک
ہے... خاک پر ہے...
اور تجھے خاک میں جانا
ہے... مگر پوری دنیا پر
حکمرانی... حضرتِ انسان کا ازلی
خواب ہے... یہ الگ بات کہ اس خواب کی
تعبیر ہمیشہ نہایت دہشت ناک اور عبرت ناک
ہوا کرتی ہے... طاقت کے نشے میں سرشار خون
آشام درندوں کے قالب میں ڈھل جانے والے انسانوں کی
داستاں... جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہزاروں بلکہ
لاکھوں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے لیے تیار تھے...
ہتھیاروں اور اسلحے کے استعمال سے ہٹ کر جنگ جیتنے کے لیے اب
سائنس داں نئی حکمتِ عملی وضع کر رہے ہیں... قدرتی آفات کو خفیہ
ہتھیار بنا کر تباہی پھیلانے کے اس منصوبے میں کامیابی ان کے بالکل سامنے
تھی۔ اُن کے پاس سب کچھ تھا... اور جیت اگلے موڑ پر ان کی منتظر تھی... مگر
پھر وہ ہوا جو... ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا...

عالمی پیمانے پر تخلیق کردہ زرخیز ذہنوں کی تباہ کن سازشیں......

وہ اس وقت اس 20 منزلہ عمارت کی چھت پر موجود تھی۔

اس کے چاروں جانب سناٹا اور نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ایک طویل القامت، خوب صورت عورت تھی مگر اس وقت اس کا حسن گہنائے ہوئے چاند کے مانند لگ رہا تھا۔ اس کے صبیح چہرے پر دکھ نے گویا ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ درد و غم یوں بھی انسان پر بہت تیزی سے اپنے اثرات چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کی نیلی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آرہے تھے۔ چہرے پر مردنی سی چھائی ہوئی تھی مگر آنکھوں میں عجیب دیوانگی چمک رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکاتی تو اس کی نظروں کے سامنے یونیفارم میں ملبوس ڈیوڈ کا ہنستا مسکراتا چہرہ گھومنے لگتا۔ ان دونوں کی شادی کو دو سال ہی ہوئے تھے۔ اس سے قبل وہ پانچ سال سے ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ وہ ڈیوڈ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اور اب جبکہ وہ اس سیاہ بھدے سے تابوت میں واپس آکر منوں مٹی کے نیچے سو چکا تھا، اسے ہر سانس سینے پر دھرے بوجھ میں اضافہ کرتی محسوس ہو رہی تھی۔

''بس اب اور نہیں......'' اس نے سوچا اور گہری سانس لی۔

’’مسز ڈیوڈ...... مسز ڈیوڈ...... آپ آدھی رات کو یہاں کیا کررہی ہیں؟‘‘ عقب سے آنے والی پاٹ دار آواز نے اسے بُری طرح چونکا دیا۔ ان کی بلڈنگ کا نائٹ واچ مین رابرٹ دروازے کے قریب کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دبی طاقتور ٹارچ کی روشنی نے لمحے بھر کو اس کی آنکھیں چندھیا دیں۔ وہ ایک لمحے کو اسے دیکھتی رہی پھر کوئی جواب دیے بغیر تیزی سے آگے بڑھی۔ اگلے لمحے وہ منڈیر پر چڑھ چکی تھی۔

’’ارے...... ارے...... رکیے...... یہ آپ کیا کررہی ہیں؟ آپ گر جائیں گی...... ایک منٹ رکیں...... میری بات سنیں......‘‘ رابرٹ بھی تیزی سے آگے بڑھا تھا مگر اس دوران وہ منڈیر پر کھڑی ہوچکی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنی جانب لپکتے واچ مین کی طرف دیکھا، مسکرائی اور پھر آنکھیں بند کرکے چھلانگ لگادی۔ وہ جلد از جلد ڈیوڈ کے پاس پہنچنا چاہتی تھی۔ رابرٹ نے اچھل پکڑنا چاہا مگر اس کے ہاتھ ہوا میں لہرا کر رہ گئے۔ مایوسی کے عالم میں اس نے منڈیر سے نیچے دیکھنے کی کوشش کی۔ روڈ لائٹس کی مدھم روشنی میں وہ کسی ٹوٹی ہوئی گڑیا کے مانند زمین پر پڑی تھی۔ اس کے سر اور جسم سے نکلنے والا خون اس کے اردگرد کی زمین کو رنگین کررہا تھا۔

☆☆☆

ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے۔

یوں لگ رہا تھا جیسے سارا نیویارک سڑکوں پر نکل آیا ہو اور بات صرف ایک شہر تک محیط بھی نہیں رہی تھی۔ ملک کے کئی شہروں میں یہی صورتِ حال تھی۔ جلوس میں موجود لوگوں کے چہروں پر غم اور غصے کے آثار نمایاں تھے۔ ان میں سینئر سٹیزنز اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ ان کے ہاتھوں میں بینرز اور پوسٹرز موجود تھے جن پر لکھے مختلف نعرے کہہ رہے تھے:

ہمیں جنگ نہیں امن چاہیے...... فوجیوں کو واپس بلاؤ......

ہمارے بچوں کو جنگوں کی آگ میں مت جھونکو......

امن...... امن...... صرف امن......

مجمع حکومت اور حکومتی پالیسیوں کے خلاف کھلم کھلا نعرے لگارہا تھا۔

جلوس میئر آفس کی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ انہیں پروگرام کے مطابق وہاں دھرنا دینا تھا مگر بڑی شاہراہ پر پولیس ان کے استقبال کے لیے تیار تھی۔ وہ پہلے لاؤڈ اسپیکرز کے ذریعے مجمع سے رک جانے کی درخواست کرتے رہے۔ پولیس چیف نے منتظمین سے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر وہ پولیس کی موجودگی کی وجہ سے مزید بپھر گئے تھے۔ مذاکرات میں ناکامی کے بعد پولیس نے بزور انہیں آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے ایکشن کا آغاز کردیا۔ مجمع بھی دیوانہ وار پتھراؤ پر اتر آیا تھا۔ لوگ پٹ بھی رہے تھے اور پولیس والوں کی لاٹھیاں چھین کر ان سے ان کی پٹائی بھی کررہے تھے۔

مجمع میں موجود کچھ جرائم پیشہ افراد کی اس دوران گویا بن آئی تھی۔ انہوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسٹورز اور مارکیٹوں میں گھسنا اور لوٹ مار شروع کردی۔ سڑک پر ہر طرف وحشت رقصاں تھی۔ کہیں آگ لگی ہوئی تھی تو کہیں چیخ و پکار مچی ہوئی تھی۔ سڑک پر زخمی بکھرے پڑے تھے۔ جان بچا کر بھاگنے والے لوگوں کو کچلتے ہوئے جارہے تھے۔ فضا میں ہر طرف سائرن کی آواز گونج رہی تھی۔ آنسو گیس اور دھوئیں کی وجہ سے قریب کا منظر بھی واضح نظر نہیں آرہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ 2020ء کا نیویارک نہیں کوئی نوآبادی یا غیر ترقی یافتہ، مخالف کیمپ سے تعلق رکھنے والا بے بس ملک ہو...... جہاں فسادات کی آگ لگادی گئی ہو۔

☆☆☆

اس عالیشان کمرے میں موجود لمبی سی مستطیل میز کے ساتھ رکھی آرام دہ شاہانہ کرسیوں پر اس وقت چار افراد براجمان تھے جس میں ایک خاتون بھی شامل تھی۔ وہ سب اس وقت خاموشی سے سامنے دیوار پر لگی بڑی سی اسکرین کو گھور رہے تھے جس پر مختلف شہروں میں ہونے والے مظاہروں کی کوریج دکھائی جارہی تھی۔ آواز کے میوٹ (بند) ہونے کی وجہ سے کمرے میں سکوت طاری تھا۔ میز کی سربراہی کرسی اس وقت خالی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ انہیں کسی کا انتظار تھا۔ یہ ایک کافی بڑا، جدید لوازمات اور آلات سے مزین بورڈ روم تھا جس کے ایک حصے میں بڑی میٹنگز کا اہتمام کیا جاتا تھا جبکہ دوسرے حصے میں ون ٹو ون ملاقات اور آرام کی غرض سے صوفے وغیرہ رکھے گئے تھے۔

کمرے میں اس وقت ان چاروں کے علاوہ سیکریٹریٹ کے دو افسران بھی موجود تھے جن میں ایک مرد اور ایک خاتون تھی۔ اس وقت یہاں ان کی موجودگی کی وجہ میٹنگ کے دوران مدد کی فراہمی اور احکامات پر عمل کرنا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تو سب کی توجہ اس جانب

مبذول ہوگئی۔ وائس پریذیڈنٹ کو اندر آتا دیکھ کر وہ سب اس کے احترام میں نشستوں سے کھڑے ہوگئے۔

''برائے مہربانی آپ سب تشریف رکھیں۔'' وہ نرم لہجے میں کہتے ہوئے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس کے کمرے میں داخل ہونے کے بعد کمرے کے دروازے پر لگا سرخ بلب جل اٹھا تھا۔ وہ درمیانی قامت اور متوازن جسامت کا مالک تھا۔ اس کی شخصیت خاصی متاثر کن تھی مگر اس کی آنکھوں میں سرد مہری اور رعونت نمایاں تھی۔

''جو کچھ شہر اور ملک میں اس وقت ہو رہا ہے، آپ سب اس سے بخوبی واقف ہیں۔'' وائس پریذیڈنٹ نے سنجیدگی سے گفتگو کا آغاز کیا۔ ''یہ سب کسی لحاظ سے بھی ملک کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہر طرف انارکی پھیل رہی ہے۔ آخر ہمارے ادارے ان لوگوں سے نمٹنے میں کامیاب کیوں نہیں ہو رہے؟'' جملے کے اختتام پر اس نے اپنی بائیں سمت بیٹھے پولیس چیف کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''آپ درست کہہ رہے ہیں سر، اس وقت سچویشن تھوڑی خراب ہے اور اس کی وجہ سے بھی آپ واقف ہیں۔ گزشتہ دو ماہ میں بین الاقوامی طور پر پیش آنے والے واقعات اس کے ذمے دار ہیں۔ لوگ بپھرے ہوئے ہیں، مختلف محاذوں سے ہمارے فوجیوں کی لاشیں آرہی ہیں جن کے خاندانوں اور دوستوں میں غم، غصہ بن کر دوڑ رہا ہے۔ صرف یہی نہیں خودکشیوں کا ریشو (اوسط) بھی یکلخت بڑھ گیا ہے۔ یہ ایک بڑا اور اجتماعی انسانی المیہ ہے اس لیے ایک حد سے زیادہ سختی بھی ممکن نہیں ہے۔'' پولیس چیف نے جواب دیا۔ وہ قدرے پستہ قامت اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں میں کسی سانپ کے مانند مسلسل حرکت کررہی تھیں۔ اس کے سر پر ایک بھی بال نہیں تھا۔

''ہوں...... مگر ہمیں اس صورتِ حال سے جلد نکلنا ہوگا مسٹر جیمز، آپ اس سلسلے میں کیا کررہے ہیں؟'' وائس پریذیڈنٹ نے دوسرے شخص سے سوال کیا۔ وہ طویل القامت اور خاصا دبلا پتلا شخص تھا۔ وہ پبلک ڈیلنگ کا نامور نام تھا۔

''ہم اس پر کام کررہے ہیں۔'' جیمز نے متانت سے کہا۔ ''میں نے کچھ سفارشات تیار کی ہیں، ان پر جلد از جلد عملدرآمد ہو جائے تو آسانی ہوگی۔'' وہ فولڈر وائس پریذیڈنٹ کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''اندرونی پریشر کی وجہ سے بین الاقوامی پالیسیوں پر عملدرآمد [illegible] مشکل ہوتا جا رہا ہے۔'' [illegible]

خاتون بولی۔ وہ ایک خوب صورت عورت تھی۔ اس کا نام شیری اسمتھ تھا۔ اس کا تعلق خارجہ امور سے تھا۔

''درست ہے۔'' وائس پریذیڈنٹ نے جواب دیا۔ ''ملک کا مفاد اور پالیسی ہر چیز سے اہم ہے اور ہم دنیا پر مکمل اور تنہا حکمرانی کے منصوبے کی راہ میں کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کرسکتے۔ اس وقت اہم سوال یہ نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں کا کیا کریں۔'' وہ اسکرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ایسا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے ہم آسانی کے ساتھ بغیر کوئی نقصان اٹھائے اور سامنے آئے بغیر اپنا مشن مکمل کرسکیں؟''

''جی سر ہم آپ کو اپنے مکمل تعاون اور بہترین کوششوں کا یقین دلاتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض بھی ہے اور عہد بھی......'' خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ مضبوط جسامت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر سختی اور درشتگی نمایاں تھی اور آنکھوں سے سفاکی جھلک رہی تھی۔

''شکریہ جم...... مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' وائس پریذیڈنٹ مسکرایا پھر بولا۔ ''آپ سب اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہمارے پاس دنیا کے بہترین اور خطرناک ترین ہتھیار موجود ہیں...... جدید سے بھی جدید ترین ٹیکنالوجی سے لیس طیارے ہیں۔ ایٹم بم، نیوٹرون، کیمیائی بم غرضیکہ ہر وہ طریقہ موجود ہے جس سے ہم زمینی، فضائی اور بحری کسی بھی جنگ میں دوسروں کو تباہ و برباد کرسکتے ہیں مگر اس میں ہمارے لوگوں کی جانیں بھی جاتی ہیں۔ دوسری جانب ہمارے خلاف پروپیگنڈا بھی مضبوط ہوتا ہے۔ لہٰذا اب طے یہ کیا گیا ہے کہ ہمیں اپنا ایکشن پلان بدلنا ہوگا...... بظاہر سب کچھ بالکل ویسا ہی رہے گا جیسا کہ ابھی ہے مگر ہمیں جنگ، حملے، کامیابی اور فتح کے لیے الگ راستہ اپنانا ہوگا۔''

''کیسا راستہ......؟'' جم نے پوچھا۔

''مستقبل میں جنگیں ہتھیاروں سے نہیں حکمت سے جیتی جائیں گی جم......'' وہ مسکرایا۔

''سر کیا آپ کچھ تفصیل بیان کریں گے؟'' جیمز نے بے صبری سے پوچھا۔

''بالکل آپ کو ساری تفصیلات ملیں گی مگر اس کے لیے ہمیں دو تین دن کا انتظار کرنا ہوگا۔ فی الحال آپ کے لیے یہ جاننا کافی ہونا چاہیے کہ مسٹر پریذیڈنٹ نے اس اہم اور گیم چینجر پروجیکٹ کی سربراہی کے لیے مجھے انچارج بنایا

ہے اور آپ سب میری ٹیم کے مرکزی کردار ہیں۔ ہمیں مل کر ایک نئی تاریخ لکھنی ہے، کیا آپ اس کے لیے تیار ہیں؟'' اس نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

''سو فیصد سر......'' جیمز بولا۔

''جی جان سے مسٹر وائس پریذیڈنٹ......'' شیری نے گرم جوشی سے کہا۔

''ہم آپ کے احکامات کے منتظر ہیں۔'' جم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین تھا گائیز۔'' وائس پریذیڈنٹ نے جواباً کہا۔'' آج کی میٹنگ کے حوالے سے جیمز کی سفارشات پر فوری کام شروع کیا جائے گا۔ کل مسٹر پریذیڈنٹ قوم سے خطاب کریں گے جس میں ان سفارشات کو بھی شامل کر دیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ جلد قابو میں آجائیں گے۔ ہم طاقت اور محبت سے اس مسئلے کو حل کرلیں گے۔'' وہ بات مکمل کر کے کھڑا ہوگیا۔ یہ میٹنگ برخاست ہونے کا اعلان تھا۔

☆☆☆

اس کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ سیاہ آنکھیں تشویش اور غصے سے سکڑی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ریسیور اب تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس فون کال نے اس کا دماغ گھما دیا تھا۔ اس نے غائب دماغی سے ایک نظر ریسیور پر ڈالی پھر اسے کریڈل پر پٹخ دیا۔ اگلے لمحے اس نے ریسیور دوبارہ اٹھایا اور ایک نمبر دبا دیا۔

''یس سر......'' دوسری جانب سے اس کی سیکریٹری جولیا کی چہچہاتی آواز سنائی دی۔

''اندر آؤ۔'' اس نے اتنا کہہ کر ریسیور پھر پٹخ دیا۔

اگلے ہی لمحے وہ چراغ کے جن کی طرح اس کے سامنے موجود تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پیٹرسن میکنزی کو انتظار کے لفظ سے بھی نفرت تھی۔ اس کے ذاتی اسٹاف میں سے لوگ غلطیوں کے بجائے ہمیشہ تاخیر کی وجہ سے ہی فائر ہوتے تھے۔ وہ امریکا اور دنیا بھر میں سب سے بڑی اسلحہ ساز فیکٹریوں کا مالک تھا۔ اس کے لیے مشہور تھا کہ وہ خود نہیں جانتا کہ اس کے پاس کس قدر دولت ہے۔ اس کے باوجود کاروبار سے اس کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ وہ صبح سے رات تک دفتر میں ہی الجھا رہتا تھا۔

''جولیا...... فوراً بگ فائیو میٹنگ ارینج کرو...... انہیں بتادو کہ معاملہ سنجیدہ اور فوری نوعیت کا ہے۔ میٹنگ کل کسی وقت طے ہونی چاہیے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے سر۔'' اس نے ہاتھ میں موجود نوٹ بک میں کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ابھی سب ارینج کر کے آپ کو کنفرم کرتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر جیسے آئی تھی ویسے ہی غائب ہوگئی۔ اس کے جانے کے بعد پیٹرسن میکنزی نے اپنے گھنے بھورے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور پھر اپنی انتہائی آرام دہ کرسی کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی عمر ساٹھ کے قریب تھی۔ جوانی میں اس کا شمار خاصے ہینڈسم مردوں میں ہوتا ہوگا اب بھی دوستوں کی محفلوں میں اسے سپرمین کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آنکھیں بند کرلینے کے بعد اس کا ذہن مزید تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ وہ کل کی میٹنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر اسے ملنے والی خبر درست تھی تو انہیں فوری ایکشن کی ضرورت تھی۔

☆☆☆

جیکب اسٹیفن اپنی لیب میں موجود تھا۔

معمول کے مطابق اس وقت اسے اپنی خواب گاہ میں ہونا چاہیے تھا مگر آج کل وہ کچھ خاص تجربات میں مصروف تھا اور ایسے وقت میں وہ ہمیشہ ہی معمولات کی قید سے باہر نکل جاتا۔ اس کی عمر ابھی صرف تینتالیس سال تھی اور اس عمر میں وہ دنیا کے نامور جیولوجسٹس میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے خصوصی کمپیوٹر کی بڑی سی اسکرین پر نظریں جمائے کام میں مصروف تھا۔

میز پر رکھی اس کی کافی دوسری بار رکھے رکھے ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت لیب میں بالکل تنہا تھا۔ لیب کا آخری اسٹاف اس کا اسسٹنٹ کچھ دیر قبل ہی اس کی اجازت سے گھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔ یہ کافی اسی نے جیکب کے لیے بنائی تھی۔

''اسمتھ تم اب تک گئے نہیں؟'' دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

''مسٹر جیکب...... اسمتھ نہیں، یہ ہم ہیں۔ کیا آپ سے کچھ بات ہوسکتی ہے؟'' نہایت قریب سے آنے والی غیر مانوس بھاری بلکہ قدرے اکھڑ آواز سن کر وہ اچھل سا پڑا۔ اس کے بالکل سامنے دو لمبے چوڑے افراد کھڑے تھے۔ انہوں نے سیاہ رنگ کا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ چہروں پر مسکراہٹ تھی مگر آنکھوں کی درشتگی اس مسکراہٹ سے قطعی میل نہیں کھا رہی تھی۔

''تت...... تم لوگ کون ہو؟ اندر کیسے داخل ہوئے؟ کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟'' اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"میری ضرورت......؟ اس بات کا کیا مطلب ہے؟" جیکب اس اچانک افتاد پر گھبرا تو گیا تھا مگر وہ دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ کمپیوٹر کے ساتھ بنے بٹن کی طرف بھی بڑھا رہا تھا۔ وہ سیکیورٹی الارم تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ اسی طرح فوری مدد حاصل کرسکتا تھا۔

"نہیں مسٹر جیکب آپ ایسی کوئی حرکت نہیں کریں گے۔" اس کے سامنے کھڑے دوسرے شخص نے جیب سے پستول نکال کر اس کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔ "سیدھے کھڑے ہوجایئے اور اپنے ہاتھ سر کے پیچھے رکھ لیجیے۔"

"تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" جیکب کے پاس ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

"تم مجھے اغوا کررہے ہو؟ مگر کیوں؟"

"یہ سب جاننا فی الحال آپ کے لیے ضروری نہیں ہے۔" وہ بولا اور پھر تیر کی سی تیزی سے اس نے اپنا ہاتھ جیکب کے چہرے پر رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کپڑا تھا جس میں موجود کلوروفارم نے جیکب کو لمحے بھر میں ہوش و حواس سے بیگانہ کردیا۔

پہلے والے شخص نے لپک کر اسے کندھے پر اٹھالیا جبکہ دوسرے شخص نے سائیلنسر والے ریوالور کا رخ سامنے لگے کیمرے کی جانب کیا اور گولی چلادی۔ لمحے بھر میں لیب خالی ہوچکی تھی اور جیکب اسٹیفن اغوا ہوچکا تھا۔

☆☆☆

آج صبح سے اسٹیفی کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔

اس پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری تھی جسے وہ خود بھی سمجھ نہیں پارہی تھی۔ وہ پانچ سال سے وائس پریذیڈنٹ کے اس دفتر سے منسلک تھی۔ دفتر میں بطور اسسٹنٹ سیکریٹری اہم میٹنگز کے نوٹس بنانا اور دیگر انتظامی امور اس کی ذمے داری تھے۔ وہ اپنی اس ملازمت سے مطمئن تھی۔ یہ اس کے لیے گویا سونے کی کان ثابت ہوئی تھی۔ یہاں ہونے والی اکثر میٹنگز اس کے لیے نئے مواقع لے کر آتی تھیں۔ انڈسٹریز سے متعلق افراد پالیسی میں کسی نئی تبدیلی کے حوالے سے قبل از وقت معلومات اور ٹپس کے عوض اسے اچھا خاصا معاوضہ خوشی سے ادا کرتے تھے۔

"کیا بات ہے اسٹیفی تمہاری طبیعت کچھ ناساز لگ رہی ہے۔" آرنلڈ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ وہ سیکریٹری تھا۔ اسٹیفی نے اس کا نک نیم "اسٹوپڈ" رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنے کام میں خوب مہارت رکھتا تھا۔ سیکریٹریٹ میں اس سے بہتر کاپی رائٹر کوئی نہیں تھا۔ اتنے برسوں سے اسٹیفی اس کی ناک کے عین نیچے ہزاروں ڈالرز کماتی آئی تھی مگر اسے کانوں کان خبر تو کیا اس پر شک تک نہیں ہوا تھا۔

"نہیں...... ویسے تو میں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنی پیشانی مسلتے ہوئے بولی۔ "مگر کچھ اچھا محسوس نہیں ہورہا۔"

"تم آرام کرلو...... اگر اچھا محسوس نہ کرو تو کل چھٹی کرلینا یوں بھی کل کوئی خاص کام نہیں ہے۔" اس نے ہمدردی سے کہا۔

"ہاں...... شکریہ...... شاید میری نیند پوری نہیں ہو پائی ہے۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں نیند پوری ہونا ضروری ہے خصوصاً ہماری عمر میں۔" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"آپ کی عمر میں تو ٹھیک ہے مگر میں تو ابھی جوان ہوں۔" وہ بھی مسکرائی۔ گھر واپس پہنچ کر بھی اس کا موڈ ویسا ہی رہا تھا۔ اس کا گھر ایک نہایت شاندار لگژری اپارٹمنٹ تھا جس میں چھوٹے سے سوئمنگ پول کی سہولت بھی میسر تھی۔ کھانے سے فارغ ہوکر وہ کچھ دیر عادتاً ٹی وی دیکھتی رہی پھر اس نے تیراکی کا فیصلہ کیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اس خیال کو رد کرتے ہوئے گرم باتھ لینے کی ٹھانی۔ اسے امید تھی کہ اس طرح اسے اچھی نیند میسر ہوسکے گی۔ بستر پر جاتے وقت اسے نیند محسوس بھی ہونے لگی تھی مگر لیٹتے ہی نیند آنکھوں سے گویا روٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"سیپلنگ پلز......" اس نے سوچا اور بیڈ سائڈ کھول کر گولیوں کی شیشی نکالی، یہ بالکل نئی شیشی تھی۔ وہ اس کی پیکنگ کھول ہی رہی تھی کہ دروازے کی بیل بج اٹھی۔ 'اس وقت...... اس وقت کون آگیا......؟' وہ بڑبڑاتے ہوئے کھڑی ہوئی اور سامنے موجود سی ٹی وی اسکرین کو آن کیا۔

"ارے آرنلڈ......" وہ آرنلڈ کو کھڑا دیکھ کر تیزی سے دروازے کی جانب بڑھی۔

"خیریت ہے آرنلڈ...... تم اس وقت یہاں......؟" اس نے دروازہ کھولتے ہی پوچھا۔

"ہاں...... خیریت ہے۔" وہ مسکرایا۔ "مجھے اصل میں تمہاری فکر ہورہی تھی، کیا میں اندر آسکتا ہوں؟"

"ہاں، ہاں کیوں نہیں۔" وہ دروازے کے سامنے سے ہٹتے ہوئے بولی۔

آرنلڈ کے پیچھے ایک اور شخص بھی گھر میں داخل ہوا۔

وہ ایک لمبا چوڑا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر زخم کا ایک نشان تھا اور آنکھوں سے سفا کی چھلک رہی تھی۔ اس نے اندر گھس کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرلیا۔

''یہ...... یہ کون ہے؟'' اسٹیفی کو وہ شخص بالکل پسند نہیں آیا۔

''دوست...... دوست ہوں میں آپ کا......'' وہ آرنلڈ سے پہلے بول اٹھا تھا۔

''میں آپ کو نہیں جانتی اور آرنلڈ کو معلوم ہے کہ میں اجنبیوں کا اپنے گھر میں آنا پسند نہیں کرتی۔'' اسٹیفی نے آرنلڈ کو گھورتے ہوئے کہا مگر وہ گویا ان دونوں سے بالکل لاتعلق سا ہو گیا تھا۔

''آپ سے ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔'' اس نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مگر مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' وہ زور سے بولی اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا، وہ تیزی سے اپنے کمرے کی جانب لپکی۔ اس نے اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس کے ساتھ ہی دروازے پر پہنچ گیا۔ اس کے مضبوط ہاتھوں کے ایک ہی دھکے نے دروازے کو دھکیلتی ہوئی اسٹیفی کو بستر پر اچھال دیا۔

''تت...... تم...... کیا چاہتے ہو؟ آرنلڈ...... تم وہاں کیوں کھڑے ہو؟ یہ سب کیا ہورہا ہے؟ مدد...... کوئی میری مدد کرو......'' وہ بالکل بدحواس ہو چکی تھی۔ اسے یہ تو علم تھا کہ وہ کسی مشکل میں پھنس چکی ہے مگر یہ سب کیا اور کیوں ہورہا تھا، یہ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آرہا تھا۔

''اوہ تو آپ سلیپنگ پلز لے رہی تھیں۔'' اس نے بیڈ سائڈ پر رکھی گولیوں کی بوتل اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''کیا مطلب؟ تمہیں یہاں سے جو کچھ چرانا ہے، وہ لو اور نکل جاؤ۔''

''مجھے یہاں سے کچھ نہیں لینا اور نکلنے کی باری آپ کی ہے میڈم......'' وہ عجیب سے انداز میں بولا۔

''کک...... کیا مطلب......؟'' وہ ہکلائی۔

''آپ کو اپنے کام اور عہدے سے غداری کی سزا دی جارہی ہے۔'' اس بار وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''آپ پر حساس معلومات کو بیچنے کا جرم ثابت ہو چکا ہے۔''

''مم...... میں نے کچھ نہیں کیا...... یہ کوئی غلط فہمی ہو سکتی ہے۔''

''آپ جانتی ہیں کہ جھوٹ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' وہ اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔

''مجھے ہاتھ مت لگانا...... میں معافی مانگتی ہوں، میں آئندہ یہ غلطی نہیں کروں گی۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

اس نے جواب دینے کے بجائے اسٹیفی کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بستر پر بٹھا دیا۔ اس کے ہاتھ میں سلیپنگ پلز کی شیشی تھی۔

''نہیں...... میں یہ نہیں کھاؤں گی...... ہرگز نہیں......'' وہ چیخ پڑی۔

''او کے۔'' وہ مسکرایا۔ ''مجھے بھی یہ کام تھوڑا مشکل لگ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرا اپنا آئیڈیا اس سے بہتر ہے۔'' اس نے جیب سے ایک سرنج نکالی جس میں دوا پہلے سے موجود تھی۔ اس نے سرنج کا کیپ ہٹایا اور اس سے پہلے کہ اسٹیفی حرکت کر پاتی۔ اس نے سرنج کو اس کے بازو میں اتار دیا۔

''نن...... نہیں...... نہیں......'' وہ اب رو رہی تھی۔

''میں مرنا نہیں چاہتی، آرنلڈ پلیز میری مدد کرو۔''

''پریشان مت ہوں، آپ کو ذرہ بھر بھی تکلیف نہیں ہوگی۔'' اس نے اسے بستر پر لٹاتے ہوئے کہا۔ اسٹیفی کو اپنے ہاتھ پیر مفلوج ہوتے محسوس ہورہے تھے۔ وہ انہیں ہلا بھی نہیں پارہی تھی۔ اس نے اسٹیفنی کو لٹانے کے بعد بستر پر موجود کمبل اسے اڑھایا۔ بیڈ سائڈ پر رکھے لیمپ کو روشن کیا۔ سلیپنگ پلز کی بوتل سے ساری گولیاں اس نے اپنی جیب میں انڈیل لیں اور خالی بوتل بیڈ سائڈ پر رکھ دی۔ اس کے بعد وہ دو قدم پیچھے ہٹا، سارے منظر پر ایک نظر ڈالی اور کمرے کی لائٹ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ اسٹیفی کے سامنے تمام منظر دھندلا رہا تھا پھر یکدم گہرے اندھیرے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

''یہ بات میں سمجھ نہیں پایا، اگر وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آئندہ جنگیں حکمت اور علم سے لڑی جائیں گی تو اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر ہم بھی تو علم و حکمت کی مدد سے ہی نت نئے ہتھیار اور آلات بناتے ہیں۔'' سائمن جیک کندھے اچکاتا ہوا بولا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ نظر آرہی تھی۔ سیاہ گھنگریالے بال اس کے ماتھے کو چھو رہے تھے، وہ درمیانی قد و قامت کا مالک تھا۔ چہرے پر ریم لیس نظر کا چشمہ اس کی شخصیت کے تاثر کو بڑھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر رعونت اور ضد جھلک رہی تھی۔ اس وقت وہ پیٹرسن میکنزی کے دفتر کے سب سے خفیہ بورڈ روم میں موجود تھا۔ اس وقت وہاں موجود چھ کی چھ آرام

وہ نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ سربراہی کرسی پر میکنزی خود براجمان تھا۔ کمرے میں ان دونوں کے علاوہ تین مرد اور ایک خاتون موجود تھی۔

''یقیناً ہم یہ کرتے ہیں مگر شاید آج آپ کا ذہین دماغ کہیں اور بھی مصروف ہے۔'' میکنزی اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتا ہوا بولا۔ ''آپ نے پوری بات سنی نہیں یا شاید اس پر دھیان نہیں دیا۔ اس میں اہم ترین بات ''ہتھیاروں کی جگہ علم'' ہے اور یہی بات ہمارے لیے اہم ہے۔ اگر ملک کے سب سے بڑے فورم پر یہ بات کی جارہی ہے تو یہ ہمارے لیے الارم ہے......''

''میں سمجھ سکتا ہوں مسٹر میکنزی...... میں نے اس بات کو اس طرح نہیں سوچا تھا۔''

''سوچنا چاہیے آپ کو، ورنہ کیا آپ کے خیال میں بغیر کسی اہم ترین وجہ کے میں اس طرح آپ سب کو اتنی ایمرجنسی میں یہاں بلاتا؟''

''آپ درست کہہ رہے ہیں مسٹر میکنزی۔'' میکنزی کی داہنی جانب بیٹھے شخص نے گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ جوزف تھا۔ میکنزی کے بعد وہ اس صنعت کا دوسرا بڑا نام تھا۔ وہ ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کی عمر پچاس سال سے زائد تھی۔ وہ چہرے سے خوش مزاج نظر آرہا تھا البتہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی درشتگی موجود تھی۔ ''آپ ہم سب سے سینئر ہیں آپ کے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ فی الحال ہمارے پاس پوری معلومات بھی نہیں ہیں۔''

''ہاں، اور یہ معاملہ بھی اس کیس کو مزید تشویشناک بنا رہا ہے۔ آفس میں موجود ہماری انفارمر نے کل رات اچانک خودکشی کر لی یا کم از کم ڈکلیئر یہی کیا گیا ہے۔ اس کا صاف ستھرا مطلب یہی ہے کہ اب انہوں نے انتظامات کو مزید سخت کر دیا ہوگا۔'' میکنزی گہری سانس لے کر بولا۔ ''صاف بات ہے کہ ہم سب کا بہت بڑا سرمایہ اس صنعت میں لگا ہوا ہے اور ہم یہ خطرہ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے...... ہمیں فوری طور پر کوئی ایسا انتظام کرنا ہے جس سے ہم حقیقت تک پہنچ سکیں۔''

''کیا اس کے لیے کسی سینئر یا اہم آدمی کو استعمال نہیں کیا جا سکتا؟'' وہاں موجود واحد خاتون نے پوچھا۔ وہ ٹریسا اسمتھ تھی۔ اپنے شوہر اسمتھ کے انتقال کے بعد اس نے ہی اس کی کمپنی کی باگ ڈور کو سنبھالا تھا اور اب کئی برس سے اسے کامیابی سے چلا رہی تھی۔ اس کی عمر بھی پچاس کے قریب تھی مگر اس نے خود کو بہت اچھی طرح سنبھال کے رکھا تھا۔ خوب صورت خدوخال، ہلکے سنہرے بالوں اور متناسب جسامت کے ساتھ وہ نہایت پرکشش نظر آرہی تھی۔

''ٹریسا...... میں نے کچھ کوشش کی ہے مگر اس معاملے کو ٹاپ سیکرٹ رکھا جارہا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ اس مرحلے پر انہیں یہ علم ہو کہ ہم اس حوالے سے کچھ جانتے ہیں یا ہم اس سلسلے میں کچھ کر رہے ہیں۔'' میکنزی نے نرمی سے کہا۔ ٹریسا نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔

''مجھے یہ سب کسی بڑی تبدیلی کی ابتدا لگ رہی ہے۔ مسٹر میکنزی اب ہم آپ کی جانب دیکھ رہے ہیں۔ آپ ہم ''بگ فائیو'' کے لیڈر ہیں۔ ہمارے مفادات ایک ہیں اور ہم سب آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔'' ٹریسا کے برابر میں موجود اینڈریو نے کہا۔ وہ ایک بڑی ہتھیار ساز کمپنی کا مالک تھا۔ وہ دبلا پتلا اور خاصی عام سی شخصیت کا مالک تھا۔

''اینڈریو، میرے پاس اس حوالے سے ایک تجویز ہے اور مجھے اس پر آپ سب کی رائے کی ضرورت ہے۔'' میکنزی نے کہا۔

''جی جی، ہم سب اس تجویز کے منتظر ہیں۔'' سائمن نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں یہ چاہتا ہوں کہ ہم کسی اور شخص کو رازداری سے ہائر کریں۔ اسے اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ آزادی سے کام کر سکے، ہمیں اس سارے معاملے کی مصدقہ تفصیلات بتا سکے اور پھر ہمارے لیے اس پر کام بھی کر سکے۔ ہم یقینی طور پر اسے تمام وسائل مہیا کریں گے مگر مشکل وقت میں اسے خود ہی سب کچھ سنبھالنا ہوگا۔'' میکنزی نے کہا۔

''کیا آپ کے ذہن میں ایسا کوئی شخص ہے؟'' ٹریسا نے پوچھا۔

''میری نظر میں ایسی شخصیت موجود ہے۔'' آدم مسکرا کر پہلی بار گفتگو میں شامل ہوا تھا۔ اس کا شمار ملک کے گنتی کے بڑے صنعت کاروں میں ہوتا تھا۔ ہتھیار سازی اس کا بنیادی کاروبار تھا۔

''گڈ...... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' میکنزی مسکرایا۔ وہ آدم فورڈ کو پسند کرتا تھا۔ ''کون ہے وہ؟''

''اس کا نام خولہ احمد ہے۔ شاید آپ کو یہ سن کر تھوڑا عجیب لگے کہ میں ایک ایسے مشکل اور خطرناک کام کے لیے ایک لڑکی کو ریفر کر رہا ہوں مگر یقین کیجیے کہ وہ اپنے کام میں پرفیکٹ ہے۔ کرمنالوجی میں ڈاکٹریٹ کر چکی ہے۔ پولیس

میں اعلیٰ عہدے پر کام کر چکی ہے۔ اب ایک پرائیویٹ سراغ رساں کی ایجنسی کو چلا رہی ہے۔ مارشل آرٹ کی ماہر ہے اور بلا کی نشانہ باز بھی۔ میں نے اسے کام کرتے دیکھا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم اسے ہائر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ اس معاملے کو آخری حد تک نمٹا سکتی ہے۔'' وہ پُرجوش لہجے میں بولا۔

''مگر آدم...... وہ مسلمان ہے شاید......'' میکنزی نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''ہاں مسلمان اور پاکستانی......''

''یعنی یک نہ شد دو شد...... کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔'' ٹریسا بڑبڑائی۔

''ٹریسا یہی تو ہمارے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند بات ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میکنزی نے توجہ سے پوچھا۔

''دیکھیے یہ تو ہم طے کر چکے ہیں کہ ہمیں سامنے نہیں آنا ہے۔ اسے اپنی حیثیت میں سارا کام کرنا ہے۔ خولہ میں وہ سب ہے جو ہمیں درکار ہے پھر وہ ایک لڑکی ہے یعنی اس پر شک کم کیا جائے گا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے وہ پکڑی گئی تو اس کا مسلم اور پاکستانی بیک گراؤنڈ خود اس کے خلاف جائے گا۔ ہمارے بارے میں اس کی کہی گئی باتوں پر کوئی یقین نہیں کرے گا۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''ہم......'' میکنزی چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ ایک قابلِ عمل تجویز ہے۔ کیا آپ میں سے کسی اور کے پاس کوئی اور تجویز ہے؟'' سب کے نفی میں سر ہلانے پر اس نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔ ''او کے تو پھر میرے خیال میں ہمیں آدم کی تجویز پر کام کرنا چاہیے۔ آپ سب کیا کہتے ہیں؟'' سب نے ہاتھ اٹھا کر اس کے فیصلے کی توثیق کر دی۔

یہ طے پایا تھا کہ آدم، خولہ احمد سے رابطہ کرے گا اور دو روز کے اندر اندر اس کی ملاقات میکنزی سے کرائے گا۔

☆☆☆

لکڑی کے خاص میٹریل سے بنے چار انسانی خاکے تیزی سے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔ وہ ان سے خاصی دور رینج میں بنے مخصوص شیشے کے باکس نما کمرے میں کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے گلاک 43 پسٹل کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ کانوں پر تھری ایم شاٹ گنز ائر پروٹیکشن (کانوں کی حفاظت) ہیڈ فونز لگے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر شوٹنگ گلاسز موجود تھے۔ اس کی پوری توجہ ہدف پر تھی۔ اس نے نشانہ لے کر چار فائر کیے۔ سامنے موجود چاروں لکڑی کے خاکے ایک ایک کر کے زمیں بوس ہو گئے۔ اس کا نشانہ ان کا سر بنا تھا۔ اس نے ہاتھ نیچے کر کے گہری سانس لی۔ ہدف کو تبدیل، قریب یا دور کرنے والے خودکار سسٹم کو بند کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ کافی دیر سے پریکٹس کر رہی تھی۔ ریسٹنگ روم پہنچ کر اس نے ہیڈ فون اور گلاسز کو ان کے بیگ میں رکھا، پسٹل کو اپنے ہینڈ بیگ کی مخصوص دراز میں بند کیا۔ چند لمحے کرسی پر بیٹھی رہی پھر تسمے درست کیے اور بیگز اٹھا کر باہر نکل آئی۔

''خولہ کیا حال ہے؟'' میک اس شوٹنگ رینج اور ٹریننگ سینٹر کا مالک تھا۔ وہ خولہ کا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا۔

''بہترین۔'' وہ جواباً مسکرائی۔ ''تم سناؤ، کیا چل رہا ہے نیا......؟''

''سب اعلیٰ...... تم یہ بتاؤ کہ نیکسٹ کوارٹر (تین ماہ) کے لیے تم دستیاب ہونا، کلب شوٹرز ٹریننگ کی ایڈوانس کلاس شروع کر رہا ہے اور وہ تمہارے بغیر ناممکن ہے، تمہیں ہفتے میں صرف دو دن آنا ہوگا۔''

''آتی تو میں روز ہی ہوں مگر میک یہ ذمے داری ہو جاتی ہے۔'' اس نے ایک لمحے کو سوچا۔

''بحیثیت مرد یہ کہتے ہوئے دل تو بہت دکھتا ہے مگر تم جیسا نشانہ یہاں کسی کا نہیں ہے۔''

''فی الحال سے کیا مراد ہے تمہاری......'' خولہ نے اسے گھورا۔

''تمہارا استاد...... یار ہمارا خضر...... وہ نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ گیا ہے...... کوئی خبر ہے اس کی؟''

''ہاں، ہاں، وہ پاکستان گیا ہے کچھ زمینوں کا مسئلہ تھا اور کچھ اور کام بھی تھا۔ جلد ہی آ جائے گا۔'' خولہ مسکرائی۔ خضر کے ذکر پر اس کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''وہ آ جائے تو پھر ہم مرد بھی تمہیں ٹکر دے سکیں گے۔'' میک بھی ہنسا۔

''اتنی کسرِ نفسی بھی اچھی نہیں ہے، تم خود بھی بہت اچھے شوٹر ہو، میک دی گریٹ۔'' خولہ نے کہا۔ ''تم مجھے شیڈول بھیج دو...... اب تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔''

''او کے، میں بھیج رہا ہوں میڈم...... تم اپنا خیال رکھنا۔''

''تم بھی۔'' وہ مسکرائی اور کار کی جانب بڑھ گئی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے بھی وہ مسلسل خضر کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ خضر اس کے ماموں کا بیٹا تھا۔ امریکا میں اس کے آجانے کی وجہ بھی وہی بنا تھا۔ اس نے انٹر کا امتحان دیا تھا اور آگے کے لیے اس کے بڑے عزائم تھے۔ وہ اپنے ابو کی طرح فوج میں جانا چاہتی تھی مگر امی، ابو کے ٹریفک حادثے میں ایک ساتھ انتقال کر جانے سے اس کی دنیا تاریک ہوگئی۔ وہ ایک عرصے تک خود کو سنبھال ہی نہیں پائی تھی۔ تب خضر اسے اپنے ساتھ امریکا لے آیا۔ اس نے یہاں یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ زندگی کا بمشکل دوبارہ آغاز ہوا۔ پڑھائی کے دنوں میں وہ ہوسٹل میں مقیم تھی۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے کے بعد خضر نے اسے ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ دلا دیا تھا۔ اس نے کرمنالوجی میں ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ تین سالہ پولیس کی ملازمت کے دوران میں اس کی ڈاکٹریٹ مکمل ہوئی تھی پھر اس نے خضر کی پرائیویٹ ڈیٹکٹیو ایجنسی کو پارٹنر کی حیثیت سے جوائن کر لیا تھا۔ اس دوران وہ دونوں کئی بار پاکستان گئے تھے۔ ماموں اور ممانی کی شروع سے یہ تمنا تھی کہ وہ ان دونوں کی شادی کرا دیں مگر فی الحال وہ خود کو اس کے لیے تیار محسوس نہیں کرتی تھی...... ہاں ان دونوں میں محبت، دوستی اور پسندیدگی کا رشتہ موجود تھا۔ خضر نے اس معاملے کو اس پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ ہی اس کی منزل تھی۔

موبائل کی بیل نے اچانک اسے چونکا دیا۔ اسکرین پر نظر آنے والا نمبر اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے کار اسپیکر کا بٹن دبایا۔

''ہیلو، کیا میں ڈاکٹر خولہ احمد سے بات کر سکتی ہوں؟'' دوسری جانب سے شائستہ آواز میں پوچھا گیا۔

''جی بالکل...... میں بول رہی ہوں۔''

''ڈاکٹر خولہ میرا نام سنتھیا ہے میں ملرز اینڈ فورڈ سے بات کر رہی ہوں۔ ہمارے مینجنگ ڈائریکٹر مسٹر آدم فورڈ آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

''جی ضرور......'' خولہ نے جواب دیا۔

''ہیلو مس خولہ......'' دو لمحوں بعد آدم لائن پر تھا۔

''جی فرمایئے مسٹر فورڈ، میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''مس خولہ...... میں شوٹنگ کلب کے میک جارج کے حوالے سے بات کر رہا ہوں۔ میرے پاس آپ کے لیے ایک ہائی فائی کیس ہے۔ کیا آپ سے کل ملاقات ہو سکتی ہے؟'' وہ سیدھا موضوع پر آتے ہوئے بولا۔

''یقیناً یہ ہمارا کام ہے اور میک میرا بہت اچھا دوست ہے۔'' خولہ نے جواب دیا۔ ''آپ ایڈریس اور اگر ممکن ہو تو کچھ تفصیلات اسی نمبر پر واٹس ایپ کر دیں۔''

''ڈن...... میں آپ کو ایڈریس بھیج رہا ہوں، مناسب ہوگا اگر کیس پر ہم ملاقات کے دوران میں بات کریں۔'' آدم بولا۔

''او کے۔'' خولہ نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

''ملرز اینڈ فورڈ۔'' فون بند کر کے وہ بڑبڑائی، یہ نام اس کے لیے انجانا نہیں تھا۔ یہ ملک کی چند بڑی ہتھیار بنانے اور فروخت کرنے والی کمپنیوں میں ایک تھی۔ کمپنی کے مالک کے پاس اس کے لیے کیا کام ہو سکتا ہے؟ اس نے سوچا۔ اس لیول کی کمپنیوں کے پاس ہر قسم کا اپنا اسٹاف موجود ہوتا ہے، بہر حال اس نے کندھے اچکائے اور اپنے اپارٹمنٹ کی گلی میں گاڑی موڑ لی۔

☆☆☆

اس کا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ پوری طاقت سے دوڑ رہا تھا۔ ٹریڈمل کا میٹر اس کی رفتار نو میل فی گھنٹا دکھا رہا تھا۔ اس نے میٹر پر نظر ڈالی اور رفتار کو آہستہ آہستہ کم کرنا شروع کر دیا۔ اسے رننگ کرتے پینتیس منٹ ہو چکے تھے۔ رفتار کم کرتے کرتے وہ چار میل فی گھنٹا تک پہنچا اور پھر جاگنگ شروع کر دی۔ چند لمحوں بعد وہ ٹریڈمل سے اتر آیا۔ اس نے کرسی سے تولیا اٹھا کر پسینا پونچھا پھر پانی کی بوتل لے کر گیلری کی جانب بڑھا کہ کمرے میں گونجتی ہلکی سی سرسراہٹ نے اس کی سماعت کو چھوا۔ اس نے پلٹ کر سائڈ ٹیبل پر رکھے موبائل کو اٹھا لیا۔

''ہیلو خضر...... مائی بوائے گڈ مارننگ...... تم شام کی میٹنگ کے لیے تیار ہو نا؟'' دوسری جانب سے بشاش مگر سنجیدہ آواز نے سوال کیا۔

''بالکل سر۔'' وہ بولا۔

''او کے تو پھر وقت پر پہنچ جانا اور ہاں تمہارا واپسی کا کیا پلان ہے؟''

''سر، اس میٹنگ کے بعد میرا واپسی کا پلان ہے۔'' اس نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''ٹھیک ہے پھر شام کو ملاقات ہوتی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہوگیا۔ خضر نے فون میز پر رکھا اور آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔

☆☆☆

''تو آپ چاہتے ہیں کہ میں یہ پتا لگاؤں کہ حکومت

مستقبل میں جنگوں اور ہتھیاروں کے حوالے سے کیا کرنے جا رہی ہے؟ اور پھر اسے بدلنے یا ختم کرنے کی کوشش کروں؟'' خولہ نے گو یا خود کو یقین دلانے کے لیے پوچھا۔ وہ اس وقت میکنزی کے شاندار آفس میں تھی۔ میکنزی کے علاوہ اس میٹنگ میں آدم فورڈ بھی موجود تھا۔

''جی ہاں، ہم یہی چاہتے ہیں اور آدم کے مطابق تم اس کے لیے بہترین انتخاب ہو۔'' میکنزی نے کہا۔

''کیا آپ کو اندازہ ہے کہ یہ کتنا بڑا اور خطرناک کام ہے اور ہمیں اس کے لیے کس قدر وسائل کی ضرورت پڑ سکتی ہے؟ اگر بات کھل گئی تو شاید آپ سب کے کاروبار بند ہو سکتے ہیں بلکہ ہماری جانیں بھی جا سکتی ہیں؟'' خولہ نے متانت سے کہا۔

''ہمیں بالکل اندازہ ہے۔ جہاں تک وسائل کی بات ہے تو تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی فراہمی ہماری ذمّے داری ہے۔''

''مگر پھر اس کے لیے آپ کو میری ضرورت کیوں پڑ رہی ہے۔ آپ لوگوں کے پاس ہزاروں افراد کا اسٹاف ہے، آپ کا کوئی بھی شخص متعلقہ لوگوں کو خرید کر یہ کام کر سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مسئلہ یہ ہے مس خولہ کہ ہمارے پاس ایک بہت اہم مخبر موجود تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تھی۔ اس نے ہی ہمیں یہ خبر پہنچائی تھی مگر اس کے اگلے ہی روز اس نے پُراسرار حالات میں خودکشی کر لی، اس لیے اب ہمارے پاس کوئی چینل موجود نہیں ہے۔'' آدم نے کہا۔

''اور اس کے علاوہ......'' میکنزی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جو تم نے ابھی کہا، وہ بھی حقیقت ہے۔ ہم حکومت کے سامنے کھل کر نہیں آسکتے۔ اسی لیے ہم کسی تھرڈ پارٹی کو یہ کام سونپنا چاہتے ہیں۔ مس خولہ اگر آپ یہ کام سرانجام دے پاتی ہیں تو معاوضہ آپ کی مرضی کا ہوگا۔'' اس نے یہ کہہ کر میز کی دراز کھول کر چیک بک نکالی۔ ایک چیک نکال کر اس پر دستخط کیے اور اماؤنٹ بھرے بغیر خولہ کی جانب بڑھا دیا۔

''تم اس میں اپنی مرضی کا کوئی بھی نمبر لکھ سکتی ہو مگر تمہیں یہ کام بظاہر اپنی حیثیت میں کرنا ہوگا۔''

''فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے مسٹر میکنزی۔'' خولہ ایک لمحے اسے دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''پہلے مجھے کسی فیصلے تک پہنچ جانے دیجیے۔ میں جانتی ہوں کہ آپ اس حوالے سے مجھے زیادہ وقت نہیں دے سکیں گے مگر کیا میں کچھ دیر اکیلے بیٹھ کر اس پر غور کر سکتی ہوں؟''

''بالکل......'' اس سے قبل کہ میکنزی کچھ کہتا، آدم نے فوراً کہا۔ ''اس کمرے کے ساتھ ہی بورڈ روم ہے.... وہاں جا کر آپ سوچ سکتی ہیں۔''

''شکریہ......'' خولہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔

بورڈ روم مختصر مگر نہایت زبردست طریقے سے سیٹ کیا گیا تھا خولہ ایک کرسی پر جا بیٹھی۔ یہ کیس ان کی ایجنسی کا سب سے بڑا اور ''کماؤ پوت'' کیس ثابت ہو سکتا تھا مگر اس کے خطرات بھی بہت تھے۔ سچ بات یہ تھی کہ وہ خود بھی اس معاملے کو سمجھنا چاہتی تھی مگر اس کے ساتھ ہی وہ اس کے دوسرے پہلوؤں پر بھی غور کرنا چاہتی تھی۔

'اسے خضر سے بات کرنا چاہیے۔' اس نے سوچا اور خضر کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب بیل بج رہی تھی مگر فون ریسیو نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ چھوڑ کر دوبارہ نمبر ملایا۔ فون اب بھی ریسیو نہیں ہوا۔ خولہ نے فون بند کر کے مایوسی سے گردن ہلائی۔

''یہ خضر کا بچہ کبھی بھی وقت پر نہیں ملتا۔ نہ جانے کہاں ہے اس وقت۔'' وہ بڑبڑائی۔

نو رسک نو گیم۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی پھر دوبارہ کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

اس نے یہ کیس لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

آج وہ بہت خوش تھی۔

گزشتہ ایک ماہ سے وہ ایک خاص تھیوری کی ریسرچ اور تجربات میں مصروف تھی اور بالآخر اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوا تھا جس کا اسے انتظار تھا۔ اس کی مہینوں کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اسی لیے وہ اس وقت پارک میں موجود تھی۔

یہ پروفیسر کیٹ برونسن کا خوشی منانے کا طریقہ تھا۔ بچوں، پھولوں، سبزے، درختوں اور پرندوں کے درمیان وہ بہت اچھا محسوس کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ پودوں، پھولوں سے گھری بینچ پر تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر بچے فٹ بال کھیل رہے تھے۔ وہ انہیں کافی دیر سے کھیلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

''اب مجھے گھر جانا چاہیے۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا۔ اس وقت وہ گرم پانی سے شاور کے بعد بستر میں گھسنا چاہتی تھی۔

وہ ابھی یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک ایک لڑکی اور لڑکا اس کے دونوں اطراف میں آ کر بیٹھ گئے۔ پروفیسر

کیٹ کو ان کا یہ عمل کچھ معیوب اور عجیب سا لگا اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔

''پلیز میڈم بیٹھیے۔'' لڑکی نے مسکرا کر اس کا بازو پکڑ لیا۔ اس کا لہجہ مؤدب اور بہت نرم تھا مگر بازو پر گرفت سخت تھی۔

''میں جا رہی ہوں، تم لوگ یہاں آرام سے بیٹھو۔ مجھے ویسے بھی بہت دیر ہو رہی ہے۔'' اس نے بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں میڈم ہمیں آپ سے تھوڑی سی بات کرنی ہے پلیز صرف دو منٹ۔'' لڑکے نے لجاجت سے کہا، یہ اور بات ہے کہ اس کی آنکھیں اس کے الفاظ اور لہجے کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ پروفیسر کیٹ کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ یہاں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہے۔

''آپ زیادہ نہ سوچیں پروفیسر......'' لڑکی مسکرائی اور اس نے انہیں بازو سے اس طرح تھام لیا جیسے وہ اسے سہارا دے رہی ہو۔ ''آپ ایک انتہائی اہم کام میں اپنے ملک کی مددگار بننے والی ہیں۔'' اتنا کہتے ہی اس نے اپنے پرس سے ایک چھوٹی پائپ نما گن نکالی۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' پروفیسر ہکلائی۔

''یہ آپ کے لیے اس سفر کو آسان بنانے کا طریقہ ہے۔'' اس بار لڑکے نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی پروفیسر کو اپنے بازو کی پشت پر کوئی سوئی چبھتی محسوس ہوئی، اس کے منہ سے بے اختیار کراہ نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے اسے یوں لگا جیسے اردگرد کی تمام آوازیں اس سے دور بہت دور ہو گئی ہوں۔ سامنے موجود منظر یکلخت دھندلانے لگا اور چند ہی لمحوں میں وہ ان کے ہاتھوں میں ڈھے گئیں۔

''اوہ آنٹی...... کیا ہو گیا آپ کو؟'' لڑکی نے ان کے بے ہوش ہوتے ہی تیز آواز میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ انہیں پھر اٹیک آ گیا ہے ہمیں انہیں اسپتال لے جانا ہوگا۔'' اس نے فون پر نمبر گھماتے ہوئے کہا۔

کچھ ہی دیر میں ایک ایمبولینس پارک کے اندر پہنچ گئی اور ان دونوں نے پروفیسر کیٹ کو اس میں منتقل کر دیا۔ سامنے فٹ بال کھیلنے والے بچے اور ان کے خاندان اس دوران میں افسوس بھری نگاہوں سے پروفیسر کیٹ کو دیکھ رہے تھے۔

☆☆☆

شہر میں اب قدرے سکون تھا۔

صدر کے خطاب اور پھر تیز ترین اقدامات نے فسادات کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ حکومت کی جانب سے تمام ہلاک ہونے والے فوجیوں کو نہ صرف ملک کے عظیم شہدا میں شامل کیا گیا بلکہ ان کے ناموں سے مختلف سڑکوں، شاہراہوں اور اداروں کو منسوب بھی کر دیا گیا تھا۔ ہر فوجی کے خاندان کو مالی معاونت فراہم کی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف ایوارڈز، میڈل، اعزازات اور تاثلو بھی دیے گئے تھے۔ ٹی وی پر خصوصی پروگرام، رائے عامہ کو ہموار کرنے میں مدد کر رہے تھے۔ ہر جگہ صدر کے اس وعدے کو نعرے کے طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ ''اب ہمارے کسی جوان کو اپنی جان کا نذرانہ نہیں دینا پڑے گا۔'' مختلف شہروں میں الگ الگ مقامات پر صدر کے پوسٹرز اور بورڈز کے ساتھ اس نعرے کو تحریر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہنگامہ آرائی اور بدامنی پیدا کرنے کی کوشش کرنے والوں سے سختی سے نمٹنے کا عندیہ بھی دے دیا گیا تھا۔

پروپیگنڈے اور فوری عمل کی تکرار نے یہ محاذ جیت لیا تھا۔

☆☆☆

وائس پریذیڈنٹ جون الیگزینڈر اس وقت ایوانِ صدر میں اپنے ذاتی دفتر میں موجود تھا۔ کمرے میں اس کے ساتھ اس کی خفیہ ٹاسک ٹیم موجود تھی جس میں خارجہ امور کی ڈائریکٹر شیری اسمتھ، خفیہ ایجنسیز کا سربراہ جم والٹر پیلیٹی اور انسانی نفسیات کا ماہر ڈاکٹر جیمز شیلڈن اور معروف سائنس داں ڈاکٹر ولیم میڈیسن شامل تھے۔ ولیم میڈیسن ملک کی اعلیٰ ترین سائنسی کونسل کا سربراہ بھی تھا۔

''آج کا دن دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔'' جون نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''آج اس چھوٹے سے کمرے سے اٹھنے والا طوفان کل پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ہم بالآخر پوری دنیا پر بلاشرکتِ غیرے حکومت کا خواب پورا کر سکیں گے۔''

''زبردست...... شاندار...... میں اس کی تفصیلات جاننے کے لیے بہت بے تاب ہوں۔'' شیری اسمتھ نے بے صبری سے کہا۔

''ابھی سر وائس پریذیڈنٹ آپ کی خدمت میں مکمل تفصیلات پیش کریں گے۔ ہماری آج کی میٹنگ کا مقصد ہی یہ ہے لہٰذا ذرا صبر کریں۔'' جم والٹر نے مسکرا کر کہا۔

''یعنی آپ جانتے ہیں......؟'' شیری نے اسے گھورا۔

''میرا تو کام ہی ہر آنے والی تبدیلی اور بات پر نظر رکھنا ہے۔'' جم نے جواب دیا۔ ''جیسا کہ میں نے آپ سے پچھلی میٹنگ میں بیان کیا تھا کہ اس سب کا آغاز صدر صاحب کی ایک سوچ سے ہوا ہے۔ ہمیں آئندہ جنگیں ہتھیاروں سے نہیں حکمت سے لڑنی ہیں۔ یہی اس پروجیکٹ کا مقصد ہے۔ گزشتہ میٹنگ کے بعد ڈپارٹمنٹ نے ایک ٹیکنیکل خرابی پکڑی تھی۔''

''ٹیکنیکل خرابی......؟'' شیری نے پوچھا۔

''ہاں، کالی بھیڑیں ہر جگہ ہوتی ہیں...... ہماری اس میٹنگ کی خبر ہتھیار ساز اداروں تک پہنچ گئی تھی۔''

''اوہ......'' کمرے میں مشترکہ آواز ابھری۔

''بہر حال اس کا علاج کر دیا گیا ہے اور اسی لیے آج کی میٹنگ میں ہمارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ ان میٹنگس کا تمام ریکارڈ شیری آپ رکھیں گی۔ ہم کسی اور کو انوالو کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔'' اس نے کہا۔

''مگر ہمیں ہتھیار ساز اداروں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ڈاکٹر جیمز نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ''جلد یا بدیر ان کو اس بات کا علم ہو ہی جانا ہے۔''

''بات ڈرنے کی نہیں ہے ڈاکٹر......'' جون کی جگہ جم نے کہا۔ ''ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے پھر یہ بہت بڑے کارٹیل ہیں انہیں آپ کسی گاڈ فادر سے کم نہ سمجھیے گا، ڈان کی طرح ہوتے ہیں...... اور اپنے مفادات کے لیے یہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔''

''ہاں اور حکومت پر ان کے کئی قسم کے دباؤ ہوتے ہیں۔ الیکشن کمیشن میں یہ لوگ ہمارے لیے پیسا لگاتے ہیں لہٰذا ہمیں بہت محتاط رہنا ہے۔'' وائس پریذیڈنٹ نے کہا۔ ''اب ہم مدعے پر آتے ہیں۔ دنیا بھر میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جو ہماری جائز بات کو نہیں مانتے...... جبکہ دنیا اسی صورت میں ترقی کرسکتی ہے اور امن قائم ہوسکتا ہے جب اس پر صحیح اور قابل قوم کی حکمرانی ہو۔ ہمارے پاس ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی کی کمی نہیں ہے مگر اس صورت میں دنیا میں ہمارے خلاف نفرت اور اتحاد بڑھتا ہے جو ہمارے لیے مناسب نہیں ہے پھر سب کو سب کچھ نظر آتا ہے اور خود یہاں ہمارے ملک میں لوگ انسانی حقوق کے نام پر اپنے ہی ملک کے خلاف ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی ہتھیاروں کا زیادہ استعمال دنیا کی فضا کو خراب کرسکتا ہے لہٰذا اب......'' اس نے ایک ڈرامائی وقفہ لیا پھر بولا۔ ''ہم اپنے قابل سائنس دانوں، ریسرچرز اور اعلیٰ ذہین افراد کی مدد سے دنیا میں جنگ کے تصور کو بدل ڈالیں گے۔ اس پر مسلسل کام ہو رہا ہے۔ اس بارے میں مزید تفصیلات آپ کو ڈاکٹر ولیم میڈیسن بتائیں گے۔''

''شکریہ مسٹر وائس پریذیڈنٹ۔'' ڈاکٹر ولیم مسکرایا۔ وہ بھاری بھرکم جثے کا مالک تھا۔ چہرے سے وہ سائنس داں کی جگہ کوئی باکسر لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں البتہ ذہانت کی چمک تھی۔ ''ہماری انوائرمینٹل ایجنسی کافی عرصے سے اس تصور پر کام کر رہی تھی۔ صدر صاحب کے حکم کے بعد اس میں نہایت تیزی سے آگے بڑھا جا رہا ہے اور اب کامیابی ہمارے سامنے ہے۔ دنیا بھر میں کلائمنٹ چینج یعنی ماحولیاتی تبدیلیاں ایک اہم موضوع بنی ہوئی ہیں اور واقعتاً یہ بہت تیزی سے وقوع پذیر بھی ہو رہی ہیں۔ یہی ماحولیاتی تبدیلیاں اور آفات ہمارا سب سے بڑا ہتھیار بن سکتی ہیں۔''

''وہ کیسے......؟'' شیری نے پوچھا۔

''دیکھیے اگر آپ کسی ملک میں اپنے فوجی اور ہتھیار بھیجتے ہیں اس پر حملہ کرتے ہیں تو ساری دنیا اس کے بارے میں جانتی ہے مگر اگر کسی ملک یا خطے میں کہیں سونامی آجائے...... زلزلے اینٹ سے اینٹ بجا دیں...... بارشیں ایسی ہوں کہ رک کر نہ دیں اور سب کچھ ملیامیٹ ہو جائے یا مسلسل مہینوں تک برف برستی رہے، طوفان آتے رہیں، وائرل بیماریاں پھوٹ پڑیں تو یہ سب کچھ قدرتی ہے اس میں کوئی کسی کو ذمے دار قرار دے کر یو این او کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتا۔ ہمارے ماہرین نے اس نظریے پر بہت کام کیا ہے۔ کافی کچھ ہو چکا ہے، کافی ہونے والا ہے اور جلد آپ خوش خبری سنیں گے۔''

''زبردست، ناقابلِ یقین......'' شیری بولی۔ ''اگر ہم یہ طاقت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پھر کوئی ہمارے سامنے سر نہیں اٹھا سکے گا۔''

''یہی اس کی اصل روح ہے۔ ہم کامیابی حاصل کر چکے ہیں اب اسے عملی طور پر ہوتے دیکھنا ہے۔'' جون مکاری سے بولا۔

''اس میں ہماری جیت یقینی ہے۔ اول تو کوئی سوچ بھی نہیں سکے گا۔'' جم بولا۔ ''اور اگر کبھی کسی نے کچھ جان بھی لیا تو ثابت نہیں کر پائے گا مگر ہمیں اس کے بارے میں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ کامیابی کے لیے پہلا اور سب سے اہم اصول رازداری ہوگا، کسی کو اس کی اصل روح کی بھنک بھی

نہیں ملنی چاہیے۔ اس حوالے سے مجھ سمیت کسی کے بھی پاس غلطی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کسی بھی قسم کی غلطی موت بن سکتی ہے۔ ہمارے پاس اس حوالے سے واضح آرڈرز موجود ہیں۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسی سفاکی تھی کہ ایک لمحے کے لیے کمرے میں سکوت طاری ہو گیا۔

''بالکل ٹھیک......'' جون نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس حوالے سے چند افراد کے علاوہ کسی کو مکمل معلومات حاصل نہیں ہوں گی۔ سائنس دانوں، ریسرچرز اور کام کرنے والے دیگر تمام افراد پروجیکٹ کی حقیقت سے لاعلم ہیں، ان کے لیے یہ ایک ریسرچ پروجیکٹ ہے۔ جن چند افراد کو تھوڑا بہت علم ہے، ان کا اس وقت دنیا میں کسی سے کوئی رابطہ نہیں ہے نہ ہی ان کے متعلق کسی کو علم ہے کہ وہ کہاں ہیں یعنی سب کچھ انڈر کنٹرول ہے اور کل ملا کر ہم چھ سات افراد اس بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی ذمے داری کا کام ہے۔ اب ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے۔ پہلے مرحلے میں ہم دنیا کے کسی ایک ملک کا انتخاب کریں گے جہاں اس پروجیکٹ کا ٹیسٹ کیا جائے گا۔''

''میرے خیال میں ہمیں پہلے اس پروجیکٹ کے لیے کوئی نام منتخب کر لینا چاہیے۔'' ڈاکٹر جیمز نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔

''گڈ آئیڈیا۔'' شیری بولی۔ ''میری تجویز ہے کہ ہم اس کا نام ''فاتح'' رکھتے ہیں۔''

''طاقت۔'' بھی ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ہماری طاقت بننے والا ہے۔'' جم نے کہا۔

''فاتح زیادہ بہتر ہے۔'' ڈاکٹر جیمز نے کہا۔

''اوکے...... ہم آج سے اسے ''پروجیکٹ فاتح'' کہیں گے۔'' جون نے کہا۔ ''پہلے مرحلے میں ملک کا انتخاب اور پورا پلان دو چار دنوں میں فائنل کر لیا جائے گا۔ ہمیں مل جل کر کام کرنا ہے ''فاتح'' کی تمام تر حفاظتی ذمے داری جم والٹر کے پاس ہے۔ پروجیکٹ کی تیاری اور اسے غلطیوں سے پاک رکھنا ڈاکٹر میڈیسن کا کام ہے۔ ڈاکٹر جیمز پروپیگنڈے اور بالواسطہ خبروں پر کنٹرول رکھیں گے جس میں دنیا بھر میں پیش آنے والی مشکلات میں ہمارا رول ہیرو کے طور پر پیش ہونا چاہیے۔ میں اور شیری پروجیکٹ کو پورا کرنے کے ذمے دار ہیں۔''

''بالکل ٹھیک ہے۔''

''اگلی میٹنگ دو دن بعد ہو گی اور ہم سب اپنے اپنے کاموں کے بارے میں رپورٹ اور تجاویز ساتھ لائیں گے۔'' جون مسکرایا۔ ''ہمارا فاتح (پروجیکٹ) باہر کی دنیا کے لیے ایک طرح کی ماحولیاتی کمیٹی ہے جس میں بظاہر ہم دنیا کے ماحول کی بہتری کے لیے کام کر رہے ہیں۔''

''وہی تو ہم کر رہے ہیں۔'' جم مسکرایا۔ ''ماحول کی بہتری بھی اور صفائی بھی......''

☆☆☆

خضر اس وقت اس وسیع و عریض عمارت کے ایک کمرے میں موجود تھا۔ کرنل ہاشم اس کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ اسے اس کے کچھ پرانے کیسز کے حوالے سے جانتے تھے جن میں اس نے امریکا میں ان کے لیے کام کیا تھا۔ وہ خضر کی صلاحیتوں کے معترف بھی تھے اور اس کی حب الوطنی کے قائل بھی۔ خضر کی اس بار پاکستان آمد کی ایک اہم وجہ ان کا پیغام بنا تھا۔ وہ اس کی ملاقات کرنل شہباز حسین سے کرانا چاہتے تھے۔ دونوں کا رخ ان کے دفتر کی جانب تھا۔

کرنل شہباز اپنے کشادہ اور سادہ مگر پُرکاری سے ڈیکور کیے گئے آفس میں ان کے منتظر تھے۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد اور ورزشی جسم کے مالک تھے۔ انہیں دیکھ کر جیمز بانڈ کا خیال آتا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے اور مصافحہ کرتے ہوئے انہیں کمرے میں موجود صوفے کی جانب لے گئے۔

''مجھے امید ہے کہ کرنل ہاشم نے آپ کو کچھ معلومات فراہم کر دی ہوں گی۔'' تعارف اور چائے وغیرہ کے بعد انہوں نے خضر سے پوچھا۔

''جی یہ بتایا ہے کہ آپ کسی خاص مشن پر کام کر رہے ہیں اور میں اس میں آپ کو اسسٹ کر سکتا ہوں۔''

''اوکے...... بالکل یہی بات ہے جوان۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے۔ ''ہاشم نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا پھر ہم نے تمہارے بارے میں اور تمہارے کاموں سے متعلق معلومات بھی حاصل کیں۔ بُرا مت ماننا یہ ہمارا طریقہ کار ہے اور اب ہمیں یقین ہے کہ ہم تم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ جو بات میں تم سے کرنے جا رہا ہوں، وہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔''

''سر! آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔'' خضر نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''ہماری معلومات کے مطابق امریکا میں کچھ ایسی پُراسرار کارروائیاں ہو رہی ہیں جن سے دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس کا پہلا نشانہ

ایٹمی طاقت رکھنے والا پہلا اسلامی ملک یعنی پاکستان ہوسکتا ہے۔ اس خبر نے ہمیں فعال کر دیا ہے۔ فی الحال ہم بہت زیادہ نہیں جان پائے ہیں مگر اتنا علم ہو پایا ہے کہ وہ کسی نئی جان لیوا اور تباہ کن تکنیک پر کام کر رہے ہیں۔ وہ کیا کر رہے ہیں؟ کس طرح کر رہے ہیں؟ ان کے نازک اور کمزور شعبے کیا ہیں اور انہیں کیسے روکا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں تمہیں اپنی کارکردگی دکھانی ہے۔'' وہ سنجیدگی سے کہہ رہے تھے۔

''میں حاضر ہوں سر......'' خضر نے بھی پورے اعتماد سے کہا۔

''خضر ہمیں مکمل اور مفصل معلومات حاصل کرنی ہیں اور اس کے ساتھ ہی کسی ایسی کارروائی کو روکنا بھی ہے، تمہیں وہاں وسائل اور مدد مل جائے گی مگر تمہیں اسے ذاتی یعنی پرائیویٹ ڈیٹکٹیو کی حیثیت میں دیکھنا ہوگا۔''

''جی سر...... دوسری صورت میں تو یہ ہمارے ملک کے خلاف کھلی کارروائی کی وجہ بن سکتا ہے۔''

''بالکل...... وہاں ہمارا مضبوط سیٹ اَپ ہے تب ہی یہ اطلاع اتنی جلد ہم تک پہنچ گئی مگر آگے کے کام میں ہمیں بہت محتاط رہنا ہے۔''

''مطمئن رہیں سر...... ہم اپنے تمام ذرائع استعمال کریں گے اور ان کی تکنیک کو ان کے ہی ملک میں دفنا دیں گے۔'' خضر نے جوش سے کہا۔

''انشاء اللہ! تمہارے وہاں پہنچنے کے بعد ہمارے لوگ تم سے خود رابطہ کرلیں گے۔ اس کے لیے تمہیں ایک الگ اور محفوظ موبائل اور نمبر دے دیا جائے گا۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔'' انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کھڑے ہو گئے۔ یہ ملاقات ختم ہونے کا اعلان تھا۔

☆☆☆

لہریں پُرسکون انداز میں آ اور جا رہی تھیں۔

ساحل پر کافی رش تھا۔ بچے ریت میں گھر بنا رہے تھے۔ اپنے پیروں کو ریت میں دفن کرنے کا جادو دکھا رہے تھے۔ کئی لوگ تیراکی کر رہے تھے۔ ہر طرف امن اور سکون تھا۔ قدرت کی قربت کا احساس ذہنوں میں سکون اور طمانیت بن کر اتر رہا تھا۔

اچانک سمندر سے زوردار آواز میں چیخنے کی آواز سنائی دی۔ لوگ اس جانب متوجہ ہوگئے۔

''بھاگو...... بھاگو...... خطرہ......'' وہ جو بھی تھا، نہایت تیز رفتاری سے تیرتا ہوا آرہا تھا اور تیرتے ہوئے وہ بار بار سطح آب پر بلند ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر وہاں موجود لوگوں کو خبردار کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

''یہ...... یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ساحل پر کھڑی ایک خاتون نے لپک کر اپنے تین سالہ بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں مگر کوئی خطرہ ضرور ہے، شاید کوئی شارک وغیرہ ہو بہرحال ہمیں فوراً نکلنا چاہیے۔'' اس کے شوہر نے دوسرے بچے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے سڑک کی طرف چل دیے۔

''پتا نہیں، یہ کیا چکر ہے؟'' گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے ایک لڑکے نے اپنے دوست سے کہا۔

''مجھے تو ڈر سا لگ رہا ہے۔'' دوسرا دوست کنارے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔

''فلو ہے یہ تو......'' پہلے والے نے قہقہہ لگایا مگر سامنے نگاہ پڑتے ہی وہ لمحہ بھر کو ساکت ہوگیا۔ اس کے چہرے پر دہشت پھیل گئی تھی۔

''کیا ہوا...... کیا ہوا؟'' دوسرے لڑکے نے پوچھا پھر اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔ سامنے موجود منظر کو دیکھ کر اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

ان سے ذرا فاصلے پر پانی گویا آسمان تک بلند ہوگیا تھا۔ نہایت اونچی تیز لہریں بل کھاتے سانپ کے مانند لہراتی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ساحل پر ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ لوگ چیختے ہوئے دوڑ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے پناہ کی تلاش میں بھاگے جا رہے تھے مگر پناہ کہیں نہیں تھی۔ پانی طوفانی انداز میں آگے بڑھ رہا تھا اور راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ، انسان، سامان سب کو تہس نہس کرتا جا رہا تھا۔ ہر طرف تباہی ہی تباہی تھی۔ درخت اکھڑ رہے تھے، عمارتیں گر رہی تھیں۔ ہر طرف موت کا سفاک ناچ شروع ہو چکا تھا۔

یہاں پہنچ کر تمام منظر ساکت ہوگیا اور پھر چند لمحوں بعد اسکرین تاریک ہوگئی۔ کمرے میں موجود لوگ خاموشی سے اسکرین کو گھور رہے تھے۔

''یہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، آپ کے لیے خوش خبری یہ ہے کہ ہم دنیا میں کہیں بھی سمندروں میں اس قسم کی طغیانی پیدا کر کے سیلاب، طوفان اور سونامی لاسکتے ہیں۔ یہ جو کچھ آپ نے ابھی دیکھا، یہ حقیقت نہیں تھا۔ یہ ایک پرانی فلم کا منظر ہے مگر تحقیق نے ہمیں اس کو حقیقت بنانے کی طاقت دے دی ہے۔'' ڈاکٹر میڈیسن نے فخریہ انداز میں کہا۔

''گریٹ...... یہ بہت شاندار ہے۔'' جون نے

کھڑے ہوکر ڈاکٹر کی پیٹھ تھپکی۔ ''یہ بہت زبردست خبر ہے، آپ اور آپ کے ساتھیوں نے بڑا کام کیا ہے۔ میں آج ہی یہ خبر صدر صاحب تک پہنچا دوں گا۔ آپ یہ بتائیں کہ آپ صدارتی حکم کے بعد کتنی دیر میں یہ سب کچھ کر سکتے ہیں؟''

''چند روز میں...... مخصوص علاقے سے ایک خاص فاصلے پر سمندر کی تہ میں میگنیٹک لہریں پیدا کی جائیں گی جس سے زلزلے اور طوفان کی کیفیت پیدا ہو گی اور پھر ہمارے پہلے سے طے شدہ مقام پر طوفان، سونامی، سیلاب اور بارشیں شروع ہو جائیں گی۔''

''اور اس کا دائرہ کار کتنا ہو سکتا ہے؟''

''فی الحال 10 میل مگر ہم اس پر کام کر رہے ہیں اور یقیناً ہم اسے ایک شہر تک لے آئیں گے۔'' وہ بولا۔

''گڈ...... یہ جان کر اچھا لگا۔'' جون نے کہا۔ ''باقی معاملات کیسے چل رہے ہیں؟''

''سب کچھ انڈر کنٹرول ہے۔ ڈاکٹر میڈیسن کی ضرورت کے تمام افراد انہیں فراہم کر دیے گئے ہیں، سب کچھ آپ کے احکامات اور پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔'' جم والٹر نے جواب دیا۔

''مسٹر وائس پریذیڈنٹ کیا اس حوالے سے مزید تفصیلات طے کر لی گئی ہیں، یعنی ہم ٹیسٹ کب تک اور کہاں کر سکیں گے؟''

''میری کل صدر صاحب سے ملاقات ہے بس اس کے بعد ہم یہ فیصلہ کر سکیں گے، انہوں نے اس پروجیکٹ کو خصوصی طور پر اپنے زیر انتظام رکھا ہے جس کی وجہ سے غیر ضروری اجازتوں کی ہمیں ضرورت نہیں ہے نہ ہی ہم ان کے علاوہ کسی اور کو جوابدہ ہیں۔''

''شاندار......'' شیری نے کہا۔

''شیری کل کے بعد ہمیں دنیا کے ملکوں اور شہروں کی ایک فہرست بنانی ہو گی جس میں دوست اور اتحادی ایک طرف ہوں گے اور دوسری طرف چیلنجنگ اور خطرناک ممالک...... پھر دیکھیں گے کہ ہمارا یہ تازہ سرپرائز کس کو ملتا ہے......'' جون مسکرایا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں سے سفاکی ٹپک رہی تھی۔

☆☆☆

''خضر آخر ہمیں اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا۔'' اماں نے اس کا بیگ پیک کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم دونوں ہمارے گزر جانے کے بعد فیصلہ کرو گے؟''

''ارے نہیں میری بہادر اماں۔'' خضر ان سے لپٹتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے تو آپ کی ہر خواہش حکم ہے اور کیا کبھی میں نے آپ کا کوئی حکم ٹالا ہے؟ ویسے آپ کب سے یہ میلوڈرامیٹک ٹائپ گفتگو کرنے لگ گئیں۔ آپ تو ہمارے جرنیل نما بابا کی اکلوتی زوجہ ہیں یعنی میڈم جرنیلی...... آپ کشتوں کے پشتے لگاتی اور حکم دیتی اچھی لگتی ہیں، یہ گزر جانے والی کیا بات کی آپ نے؟''

''ارے بچے موت کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے، ضروری ہے انسان کے لیے 'بندے دا پتر بنا رہنا آسان ہوتا ہے...... اور شرم نہیں آتی بے چارے اپنے باپ کو جرنیل کہتے ہوئے؟'' انہوں نے اسے گھورا۔

''اچھا...... یعنی آپ کو خود جرنیلی بننے پر اعتراض نہیں ہے۔'' خضر نے انہیں چھیڑا۔

''بات کو مت گھما...... سیدھے سیدھے بتاؤ کہ کرنا کیا ہے؟''

''اماں شادی تو میں خولہ سے ہی کروں گا مگر اب اسے مجھ سے یہ بات کہنا ہو گی۔ میں اسے ایک بار پروپوز کر چکا ہوں، اس نے مجھے کہا تھا کہ وہ مجھے خود بتائے گی۔'' اس نے اس بار سنجیدگی سے کہا۔

''تو اس میں کیا ضد ہے، اگر وہ نہیں بتا رہی تو تو خود پوچھ لے۔''

''نہیں اماں...... بات تو اسے ہی کرنا ہو گی۔'' خضر نے جواب دیا۔

''دیکھ خضر، محبت میں انا نہیں ہوتی اور جس محبت میں ''میں'' آجائے وہ محبت نہیں رہتی۔ اس بات کو یاد رکھنا۔''

''او کے اماں، آپ کہتی ہیں تو میں یہ کوشش کر لوں گا مگر آپ اور بابا کو بھی اپنا وعدہ پورا کرنا ہو گا۔''

''کون سا وعدہ؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میرے ساتھ امریکا چلنے کا۔''

''ٹھیک ہے تو پہلے اپنا کام کر پھر ہم بھی وعدہ پورا کر دیں گے۔'' وہ مسکرائیں۔

''سچ...... بس پھر آپ تیاری کر لیں۔ اس کیس کے بعد آپ کو امریکا آنا ہو گا۔''

''جیتا رہ...... ضرور...... تو خیر سے جا، خوش خبری سنا، میں اور تیرے بابا امریکا آجائیں گے۔ ہمارے لیے تم دونوں سے بڑھ کر ہے بھی کیا؟'' وہ اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے بولیں۔

☆☆☆

خولہ نے کام کا آغاز کر دیا تھا۔

خضر سے اس کی رات ہی بات ہوئی تھی۔ وہ پرسوں پہنچنے والا تھا۔ اس نے اسے بتا دیا تھا کہ اس نے ایک ہائی فائی کیس لے لیا ہے مگر تفصیلات نہیں بتائی تھیں۔ اس نے بھی جواباً اسے ایک اہم اور بڑے کیس کی خبر سنائی تھی جس نے خولہ کو تھوڑا نروس کر دیا تھا۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی کیس پر کام کرتے تھے، یہ ان کا شروع سے اصول تھا۔

اسے میکنزی اور آدم سے جو معلومات ملی تھیں، ان کے مطابق سائنس داں، حکومتی پالیسی، ہتھیار اور جنگ اس پورے معاملے کے کی پوائنٹ تھے۔ اس نے کام کی ابتدا اخبارات سے کی تھی۔ گزشتہ چھ ماہ میں ان موضوعات کے حوالے سے تمام بڑے چھوٹے اخبارات میں چھپنے والی تمام خبروں کی کاپیز اس وقت اس کے سامنے تھیں۔ وہ کافی پتے ہوئے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک ایک خبر اور اس میں موجود ایک ایک سطر کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک ایک قدرے کم معروف اخبار میں چھپی ایک کالمی خبر نے اس کی توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔

''دو ماہ میں ساتویں سائنس داں غائب۔''

ڈاکٹر چیلسی اچانک اپنے گھر سے غائب ہوگئی ہیں۔ تفصیلات کے مطابق وہ معمول کے مطابق وقت پر گھر آتی تھیں۔ ان کے شوہر کے بیان کے مطابق اس روز ان کے چار سالہ بیٹے کی سالگرہ تھی۔ ان تینوں نے بیٹے کے پسندیدہ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا۔ ونڈر لینڈ کی سیر کی۔ گھر آ کر انہوں نے بیٹے کا برتھ ڈے کیک کاٹا، گانے گائے اور پھر معمول کے مطابق سو گئے مگر صبح جب وہ جاگے تو وہ گھر پر نہیں تھیں۔ انہوں نے اسے کافی ڈھونڈا اور پھر پولیس سے رابطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر چیلسی معروف جیالوجسٹ اور سائنس داں ہیں۔ انہیں اس سال بیسٹ سائنٹیفک ایوارڈ بھی مل چکا ہے، یاد رہے کہ گزشتہ دو ماہ میں سات سائنس داں پُراسرار حالات میں غائب ہو چکے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ چیز نہ تو کہیں رپورٹ ہو رہی ہے اور نہ اس پر کوئی بات کی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ خود ان سے متعلقہ افراد بھی کچھ کہنے سے گریزاں نظر آ رہے ہیں۔

اس خبر پر اس کی نظریں جم سی گئیں۔ اس نے اس خبر کی کٹنگ لگے کاغذ کو الگ کر لیا۔ اس نے لیپ ٹاپ پر اخبار ڈاؤن لوڈ کیا۔ ٹیلی فون نمبر چند لمحوں میں اس کے سامنے تھا۔

''اسے اس رپورٹر سے ملنا چاہیے۔'' اس نے فون ملاتے ہوئے سوچا۔

''ہیلو......'' دوسری جانب سے خشک آواز میں سوالیہ انداز میں کہا گیا۔

''یہ نیویارک ڈے ہے؟'' خولہ نے پوچھا۔

''جی بالکل......''

''میں آپ کی ایک خبر کے حوالے سے آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔'' خولہ نے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' وہ شاید مختصر بات کرنے کا عادی تھا۔

''یہ خبر ایک ہفتہ پہلے چھپی تھی جس میں سات سائنس دانوں کے غائب ہونے کی اطلاع دی گئی تھی۔ میں اس کے رپورٹر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اچانک سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ خولہ نے حیرت سے موبائل کو دیکھا، اور پھر نمبر ملایا مگر اس بار گھنٹیاں بجتی رہی تھیں، کسی نے فون ریسیو کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ خولہ نے فون بند کر دیا۔ ویب سائٹ سے ایڈریس لیا اور دفتر سے باہر نکل گئی۔ وہ اس کلیو کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ نیویارک ڈے کا دفتر شہر کے معروف علاقے میں موجود ایک گیارہ منزلہ عمارت کی ساتویں منزل پر تھا۔ ریسیپشن پر ایک نوجوان لڑکی موجود تھی جو ہر دو لمحے بعد بجنے والے والے فون بھی ریسیو کر رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ خولہ کو یہ اندازہ تو تھا کہ اسے مطلوبہ معلومات آسانی سے نہیں ملیں گی۔ اس نے اس لڑکی کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔

''جی میڈم۔'' وہ فون بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''ہائے...... بہت مشکل کام ہے تمہارا......'' وہ دوستانہ انداز میں مسکرائی۔ ''ہر اک کی خبر رکھنی پڑتی ہوگی۔''

''ہے تو...... مگر اب عادت ہوگئی ہے۔'' وہ بھی مسکرائی۔ ''کبھی کبھی تو دو دو شفٹوں میں کام کرنا پڑتا ہے اور پیسے بھی اتنے نہیں ملتے مگر آج کے حالات میں یہ نوکری بھی غنیمت ہے۔'' وہ دل جلی محسوس ہو رہی تھی۔

''سچ کہہ رہی ہو...... پیسا تو ہر ایک کی ضرورت ہے۔'' خولہ نے ہمدردی سے کہا۔ ''ویسے مجھے تم سے ایک چھوٹی سی مدد درکار ہے۔''

''کیسی مدد......؟''

''اصل میں، میں ایک ریسرچ پیپر پر کام کر رہی ہوں۔ اس کے لیے مجھے اس خبر کے رپورٹر سے ملنا ہے، کیا تم مجھے اس کا نام بتا سکتی ہو یعنی کس نے یہ خبر فائل کی تھی اور اس کا کانٹیکٹ وغیرہ......؟''

''اس کی اجازت نہیں ہے۔'' وہ بولی۔

''میں جانتی ہوں مگر مجھے بتانے سے کسی کو نقصان نہیں ہوگا اور میں کسی نہ کسی طرح یہ معلومات حاصل بھی کر ہی لوں گی، کوئی ایسی خاص بات تو ہے نہیں مگر تم مجھے اچھی لگی ہو...... اگر یہ معلومات مجھے تم سے مل جائیں تو تمہیں بھی کچھ فائدہ ہوسکتا ہے۔'' خولہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کیسا فائدہ......؟'' اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

''تم چند نئے لباس بنا سکتی ہو یا کسی اچھے ریسٹورنٹ میں ڈنر کر لینا۔'' اس نے چند نوٹ نکال کر خبر کے کاغذ کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اس نے نوٹوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم میری مدد کر رہی ہو تو مجھے بھی تمہاری مدد کرنا چاہیے۔'' خولہ نے سادگی سے کہا۔

''مگر اگر کسی کو پتا چل گیا تو میری نوکری چلی جائے گی۔'' اس کی نظریں اب بھی نوٹوں پر تھیں، یہ اس کی مہینے بھر کی تنخواہ کے برابر تھے۔

''کسی کو علم نہیں ہوگا، یہ میرا وعدہ ہے۔ تمہیں مجھے صرف اس رپورٹر کا نام اور رابطہ نمبر دینا ہے اور بس پھر میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔''

''او کے۔'' وہ بولی پھر اس نے دائیں بائیں دیکھ کر نوٹ اپنے پرس میں منتقل کر دیے اور مڑ کر ایک فائل نکالی اور صفحے پلٹنے لگی۔

''زید سالم...... یہ خبر زید سالم نے رپورٹ کی ہے۔ بہت شاندار رپورٹر ہے مگر وہ ہمارے ہاں باقاعدہ ملازمت نہیں کرتا، یہ اس کا فون نمبر ہے۔'' اس نے ایک چٹ پر نمبر اور نام لکھ کر خولہ کی جانب بڑھایا۔ ''آپ اسے بھی یہ مت بتائیے گا کہ آپ کو اس کا نمبر یہاں سے ملا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو، میں اسے یہ نہیں بتاؤں گی۔'' خولہ مسکرائی اور پھر باہر کی جانب چل دی۔

☆☆☆

زید سالم پچھلے کئی دنوں سے بے حد مصروف تھا۔ وہ پُراسرار طور پر غائب ہونے والے سائنس دانوں کی اسٹوری پر کام کر رہا تھا۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ یہ معاملہ مزید اُلجھتا نظر آ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ اسٹوری اسے ملک بھر بلکہ دنیا بھر میں مشہور کر سکتی ہے اور شاید وہ اس سال کا سب سے بڑا ایوارڈ بھی حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا۔ یہ اس کا خواب تھا اور اس کی تعبیر کے حصول کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے لیے تیار تھا۔

اس کی اب تک کی تحقیقات کے مطابق گزشتہ دو ماہ سے کم عرصے میں دس سے زائد اعلیٰ ترین سائنس داں غائب ہو چکے تھے جس چیز نے اسے سب سے زیادہ مشکوک کیا تھا، وہ اس پر میڈیا کی خاموشی تھی۔ پروفیسر کیٹ والی خبر بھی اس نے بڑی مشکل سے ایک چھوٹے اخبار میں چھپوائی تھی۔ بڑی اشاعت والے اخباروں نے اسے چھاپنے سے معذرت کر لی تھی اور اس حوالے سے کوئی وضاحت بھی نہیں کی گئی تھی۔ وہ اب تک سات گمشدہ سائنس دانوں کے خاندانوں سے رابطہ کر چکا تھا۔ اس میں بھی ابھی تک اسے خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ دو سائنس دانوں کے خاندان نے بات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ایک کی بیوی نے اسے گھر سے نکال دیا تھا مگر اس کے الفاظ نے زید کے کیس کو مزید پختہ کر دیا تھا۔

''ہم پہلے ہی پریشان ہیں، تم کیا چاہتے ہو کہ ہمیں مزید مسائل کا سامنا کرنا پڑے۔'' اس کے پاس اس کا یہ جملہ بھی ریکارڈ تھا۔ اس کے پاس پروفیسر کیٹ کو لے جانے والے لڑکی اور لڑکے کی ایک تصویر بھی محفوظ تھی جو کہ اس وقت اس پارک میں موجود اس کی ایک دوست نے کھینچ لی تھی اور اسے خبر بنانے کے لیے بھیجی تھی۔ وہیں سے اسے اس ساری گڑبڑ کی اطلاع ملی تھی اور جوں جوں وہ مزید جاننا جا رہا تھا توں توں وہ مزید اُلجھتا جا رہا تھا۔ ہر طرف سے ملنے والی مایوسی کے بعد کل رات آنے والی فون کال اس کے لیے امید کی کرن بن کر سامنے آئی تھی۔ ڈاکٹر ولیم اسٹینلے یونیورسٹی کے پروفیسر اور ملک کے نامور سائنس داں تھے۔ وہ بھی گزشتہ ایک ماہ سے غائب تھے۔ یہ کال اُن کی بیوی کی طرف سے آئی تھی۔

''زید صاحب آپ نے کہا تھا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کو واپس لانے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں؟''

''جی بالکل آپ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''آپ سے کل ملاقات ہوسکتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی بالکل...... جہاں آپ کہیں۔''

''میرے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک بڑا مال ہے۔ اس کے فوڈ کورٹ میں تین بجے سہ پہر۔'' اس نے اتنا کہہ کر فون بند کر دیا۔

زید کے لیے یہ ملاقات بڑے بریک تھرو سے کم نہیں تھی۔ اگر وہ مان جاتی تو وہ اس کی پریس کانفرنس کروا کر اپنے دعوے کو صحیح ثابت کرسکتا تھا۔

وہ تین بجنے میں پانچ منٹ قبل ہی فوڈ کورٹ پہنچ گیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق وہ ابھی پہنچی نہیں تھی۔ اس نے دروازے کے قریب دو افراد کی چھوٹی سی میز پسند کی۔ یہاں سے وہ اندر داخل ہونے والوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اسے بیٹھے چند لمحے ہی ہوئے تھے جب ڈاکٹر ولیم کی بیوی ہال میں داخل ہوئی۔ وہ ادھیڑ عمر کی خوب صورت عورت تھی۔ اس نے داخل ہو کر چاروں طرف نظر دوڑائی پھر زید کی میز کی جانب بڑھ آئی۔

''کیسی ہیں آپ......؟'' زید نے اس کے بیٹھتے ہی رسماً سوال کیا۔

''کیسی ہو سکتی ہوں؟'' مسز ولیم نے جوابی سوال کیا۔ ''مگر کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ آپ چاہ کر بھی ان کے متعلق کچھ نہیں کرسکتے۔''

''میں سمجھا نہیں۔'' زید نے حیرت سے پوچھا۔

''ہر بات سمجھنا آسان ہوتا ہے اور نہ سمجھانا مگر یہ یاد رکھیے کہ بعض اوقات انسان حد سے زیادہ مجبور ہوتا ہے۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

''میں آپ کی کسی بات کا مطلب سمجھ نہیں پارہا ہوں...... میرا خیال ہے کہ آپ نے مجھے ڈاکٹر ولیم کی گمشدگی کے حوالے سے گفتگو کے لیے طلب کیا تھا۔''

''ہاں...... آپ کو کیوں لگتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب غائب ہیں؟'' اس نے اس بار قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

''یہ حقیقت ہے اور صرف وہ نہیں اور بھی بہت سے سائنس داں گم کیے گئے ہیں۔''

''مگر کس لیے اور کس نے......؟''

''یہ مجھے ابھی معلوم نہیں ہے مگر میں جلد معلوم کرلوں گا۔'' وہ بولا۔ ''پہلے یہ بتائیے کہ آپ چائے لیں گی یا کافی......؟''

''چائے۔'' وہ بولی پھر اس نے غیر محسوس سے انداز میں اپنی انگلی سے میز پر کچھ لکھا۔ ایک لمحے کے لیے زید کچھ نہیں سمجھ پایا پھر اس نے اس کے ہاتھ کی طرف غور سے دیکھا۔

''بھاگ جاؤ...... ہر طرف خطرہ ہے۔'' اس نے پھر لکھا۔

''کک...... کیا مطلب......؟'' زید کی نگاہوں نے اس کی انگلی کی حرکت کے تعاقب میں پیغام سمجھ لیا۔

''چائے کا مطلب......؟'' وہ ہنسی، اس کی آنکھوں میں تنبیہہ اور التجا دونوں یکجا نظر آرہی تھیں۔

''میرا مطلب ہے کہ کافی کیوں نہیں......'' وہ ہکلایا۔

''کیونکہ مجھے کافی پسند نہیں ہے۔''

زید نے ویٹر کو چائے کا آرڈر دیا اور چند لمحوں بعد بولا۔ ''میں واش روم سے آتا ہوں۔''

''ضرور......'' اس نے سر ہلایا۔

زید اس فوڈ کورٹ میں پہلے بھی کئی بار آچکا تھا۔ اس کے علم میں تھا کہ ہال کی عقبی سمت کی جانب واش روم موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی سیڑھیاں تھیں۔ مال میں کلائنٹس کی آمدورفت کے لیے اگلی جانب اسکیلیٹرز اور لفٹس لگائی گئی تھیں۔ یہ سیڑھیاں ملازمین کے لیے یا پھر ایمرجنسی میں استعمال کے لیے تھیں۔ زید تیزی سے واش روم کے سامنے سے گزر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ وہ دس بارہ سیڑھیاں ہی اترا تھا کہ دو افراد نے اسے روک لیا۔ وہ چہرے مہرے سے سخت مزاج اور لڑائی جھگڑے کے عادی نظر آرہے تھے۔

''کہاں جارہے ہو؟'' ان میں سے ایک نے اس کے بالکل سامنے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''تم سے مطلب؟'' زید نے کہا۔

''مطلب ہے تب ہی تو پوچھ رہے ہیں...... تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔'' وہ مسکرایا۔

''اور وہ کیوں؟ اور کہاں؟''

''سوالات تم نہیں، ہم پوچھیں گے۔ بہت کھیل لیا تم نے خبر خبر......'' اس بار وہ غرا کر بولا۔ اس کے اس جملے کے ساتھ ہی زید حرکت میں آگیا تھا۔ وہ لکھنے پڑھنے والا آدمی تھا مگر نوجوانی سے باکسنگ اس کا مشغلہ رہا تھا۔ زید کا دایاں پیر تیزی سے گھوما اور سامنے کھڑے شخص کی ٹانگوں کے درمیان ایک زوردار کک رسید کی۔ وہ ایک لمحے کو ساکت سا رہ گیا پھر چکراتا ہوا سیڑھیوں سے پھسل گیا۔ دوسرے شخص نے مڑ کر زید کے پیٹ میں گھونسا رسید کرنا چاہا۔ زید نے اسے جھکائی دی اور پھر اس کے چہرے پر ایک زوردار مُکّا جڑ دیا۔ وہ ایک لمحے کو جھول سا گیا تھا زید نے دوسرا مُکّا اس کے سر پر مارا جس کے بعد وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ زید اس پر

تھے۔ میں یونہی کسلمندی سے چارپائی پر پڑا ہوا تھا کہ بختاور گوپے میں آگیا۔ اس نے پہلے تو ہمیں یوں پڑے دیکھ کر واپس پلٹ جانا چاہا پھر مجھے جاگتا ہوا دیکھ کر میرے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تم اتنی جلدی جاگ گئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، مجھے بابا نے جگا لیا تھا۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"خیر تھی، کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں کوئی خاص نہیں، بس وہ ڈِتّو کو پکڑ کر لائے ہیں۔ سویا پڑا تھا گھر میں لے آئے ہیں اسے۔" اس نے بتایا۔

"کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم فریش ہو جاؤ، ناشتا کر لو، پھر لاتا ہوں۔" اس نے کہا اور پھر اٹھ کر باہر کی جانب چلا گیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ڈِتّو میرے سامنے تھا۔ ابھی تک اسے یہ بالکل نہیں بتایا گیا تھا کہ اسے کیوں لایا گیا ہے۔ جیسے ہی اس کی نگاہ مجھ پر پڑی تھی، وہ تب سے خوف زدہ تھا۔ میں کچھ دیر تک خاموشی سے اسے دیکھتا رہا پھر سرد سے لہجے میں پوچھا۔

"ڈِتّو، تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟"

"میں...... مرنا...... کیا ہوگیا...... مم...... میرا قصور......" وہ ایک دم سے ہکلاتے ہوئے بولا۔

"دیکھا، اب بھی میرے سامنے جھوٹ بول رہے ہو، میں جانتا ہوں کہ تم نے سچ تو بتانا نہیں، وفاداری نبھاتے ہوئے مرجانا قبول کر لینا ہے اس لیے میں نے سیدھے طریقے سے پوچھ لیا کہ تم کس طرح مرنا پسند کرو گے؟" میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا تو وہ ایک دم سے گھبرا گیا، پھر سیدھا میرے پاؤں پڑتے ہوئے گھبرا کر بولا۔

"جو پوچھو گے، بتاؤں گا۔ بس مجھے مارنا نہیں، وہ بھی مجھے ماردیں گے۔"

"چلو ابھی پتا چل جاتا ہے۔" یہ کہہ کر میں نے لمحہ بھر رک کر پوچھا، "رات تم کہاں تھے؟"

"وہ لوگ مجھے کئی دنوں سے استعمال کر رہے ہیں، رات بھی میں ان کے ساتھ روہی میں پھرتا رہا ہوں۔ انہیں شک تھا کہ سانول تم لوگوں کے ساتھ ہے، وہ اس کے فون سے اسے تلاش کر رہے تھے۔ وہ ایک جگہ پہنچ گئے تھے لیکن انہیں وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔" وہ فرفر بتانے لگا۔

"تم نے جو سانول سے کہا، وہ سب جھوٹ تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی، سب جھوٹ تھا، وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ ہے کہاں؟" اس نے تیزی سے بتایا۔

"جب وہ پہنچ گئے تھے اس جگہ انہوں نے سانول کو پکڑا نہیں؟" میں نے پھر دہرا کر سوال پوچھا۔

"وہ ایک جگہ رک گئے تھے۔ ان کا بندہ انہیں کہہ رہا تھا کہ سانول یہیں کہیں ہے۔ لیکن وہاں کچھ تھا ہی نہیں، اس لیے وہ واپس مڑ گئے۔" اس نے بتایا تو میں نے چند لمحے اس کے چہرے پر دیکھتے رہنے کے بعد پوچھا۔

"سانول کو اغوا کروانے کے عوض انہوں نے تمہیں کیا دیا؟"

"رقم دی تھی جی، میں نے تو صرف انہیں اتنا بتایا تھا کہ وہ بستی بہادر خان جا رہا ہے۔ یہی انہوں نے پوچھا تھا۔" اس نے شرمندہ لہجے میں کہا۔

"کون لوگ ہیں وہاں پر......؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں جی، باہر سے آئے ہیں دو بندے، وہ بگا راجھستانی کے ساتھ آئے ہیں۔ وہی سب پر حکم چلاتے ہیں۔ باقی سترہ بندے ہیں، جو یہیں کہیں کے ہیں۔"

"بگا راجھستانی، وہی، جو رَتّو بھوہڑ کے ساتھ تھا؟"

"ہاں جی ہاں جی وہی، وہ تمہارے بڑا خلاف ہے۔" اس نے بتایا۔

"ان کے پاس کوئی مشینیں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں کیا کیا ہے ان کے پاس، اسلحہ بڑا ہے ان کے پاس۔" اس نے بتایا تو مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

"وہ دو بندے بارڈر پار سے آئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی، وہ بھی راجھستانی لگتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"تمہیں پتا ہے نا سانول کو انہوں نے مار دینا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اب...... میں کیا......" وہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"اب تم ایسے کرو، جاؤ، میں تمہیں کچھ نہیں کہتا، وہاں جو چاہو جھوٹ سچ بول دو، میں تمہیں مارتا نہیں لیکن آئندہ......" میں نے کہنا چاہا تو وہ سیدھا میرے پاؤں پڑ گیا۔ اسے مارنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اسے

جانے دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ پیروزاں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔ وہ بُگا راجھستانی جو کل تک اس کا بھی دشمن تھا، وہ سب اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ وہ وقت تھا، جب قسمت یہ۔۔نا کرتی ہے یا پھر بہت زیادہ حوصلہ۔ میں نے سب کچھ حالات پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

دوپہر ہو چکی تھی۔ میرے پاس پیروزاں کے ڈیرے کی کافی ساری معلومات آچکی تھیں۔ دِتّو نے جو کچھ بتایا تھا وہ درست ثابت ہوا۔ ندیم ڈانڈیا گینگ کے لوگ جیسلمیر سے یہاں تک آن پہنچے تھے۔ میں جانتا تھا کہ وہ ندیم ڈانڈیا کی محبت میں یہاں تک نہیں آئے تھے۔ انہیں یہاں بھیجا گیا تھا۔ انہیں کس نے بھیجا تھا، اس بارے میں ابھی کوئی نام سامنے نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ نام زیادہ دیر تک اوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ ان کی راہنمائی بُگا راجھستانی نے کی تھی۔ وہ تب سے یہیں تھا، جب میرا اور اس کا سامنا ہوا تھا۔ انہوں نے کافی مقامی غنڈے اور جرائم پیشہ افراد کو اپنے ساتھ شامل کر لیا تھا۔ بظاہر وہ پیروزاں کی مدد کو یہاں آگئے تھے لیکن اصل میں وہ سب میرے خون کے پیاسے تھے۔

میں چاہتا تو چاچا عبدالمجید سے مدد لے سکتا تھا لیکن میں نے انہیں جان بوجھ کر فون نہیں کیا۔ ایسے وقت میں جبکہ میں چوہدری آصف کو ختم کر رہا تھا، اسے کیوں میرے ہاتھ سے بچایا گیا؟ یہ میری سوچ تھی کہ اگر اسے بروقت ختم کر دیا جاتا تو روہی میں کسی کی جرأت نہیں تھی کہ وہ سامنا کر سکے۔ یہاں پر اگر پولیس گردی بھی ہوتی تھی تو وہ چوہدری آصف کی وجہ سے۔ روہی میں ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک جو چھوٹے چھوٹے جرائم پیشہ نام نہاد حاکم بنے ہوئے تھے' ان کی سرپرستی کے لیے وہ شہر میں بیٹھا تھا۔ اس کا تو اتنا ہی قصور ناقابلِ معافی تھا کہ وہ لوگوں پر ظلم کرنے والوں کی پشت پناہی کرتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ چاچا عبدالمجید نے ایسا کیوں کیا تھا؟ ظاہر ہے چوہدری آصف سے ان کا کوئی مفاد وابستہ ہوگا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن چاچا یہ چاہتے تھے کہ میں پیروزاں کو بھول کر واپس لاہور چلا جاؤں۔ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ میں اب اس عورت کو معافی نہیں دے سکتا تھا۔ ہوسکتا ہے ان کے خیال میں یہ بھی ہو کہ میں ان کی بہت دفعہ حکم عدولی بھی کر چکا ہوں۔ وہ مجھے بہت دفعہ واپس آنے کا کہتے رہے لیکن میں نے ان کی بات نہیں مانی۔ وہ مجھے

بتانا چاہتے تھے، یہ احساس دلانا چاہتے تھے وہ میرے بارے میں پل پل کی خبر رکھتے ہیں اور چاہئیں تو مجھے کچھ بھی نہ کرنے دیں۔ سو اس سے پہلے کہ وہ مجھے کوئی مدد دینے سے انکار کر دیں۔ شعیب لوگوں کو واپس بلا لیں، میں نے ان سے بات ہی نہیں کی۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ انہوں نے مجھے کال نہیں کی تھی۔ میں نے اسے بھی حالات کی ستم ظریفی سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔

میں اسی سوچ بچار میں پڑا رہا، نجانے کہاں کے قلابے کہاں ملا دیے۔ سوتے، جاگتے اور سوچتے ہوئے... سہ پہر ہو گئی۔ میں اٹھا اور شعیب لوگوں کے پاس چلا گیا۔ وہ ایک کچا گھر تھا، جس میں تین چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ وہ بھی برآمدے میں بیٹھے گپیں لگا رہے تھے۔ بختاور بھی وہیں تھا۔ میں نے جاتے ہی .... پیروزاں کے ڈیرے کی وہ صورتِ حال جو مجھے معلوم ہوئی تھی، انہیں بتا دی۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں جب کہہ چکا تو شعیب بولا۔

"حالات تو اچھے خاصے گمبھیر ہو گئے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اگر وہ اتنے ہی طاقت ور ہیں، تو اب تک ہم پر حملہ کیوں نہیں کر سکے؟"

"رات وہ ہمیں تلاش کرنے نکلے تو تھے۔ اگر ہم انہیں مل جاتے تو کیا وہ ہمیں معاف کر دیتے؟" یہ کہہ کر میں نے اس کے چہرے پر دیکھا، پھر لمحہ بھر رک کر بولا۔ "یا یہیں بستی سے انہیں یہ خبر مل جاتی کہ ہم بستی میں ہیں تو وہ ہم پر چڑھ دوڑتے۔ کچھ ہے جس کی وجہ سے وہ ابھی رُکے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیے؟" بختاور نے کہا۔

"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں براہِ راست ان سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ ان کا کیا ارادہ ہے۔ اب تک وہ اگر میرے ساتھ تھے تو انہیں چاچا عبدالمجید کی ہدایت تھی تو وہ میرے ساتھ تھے۔ اگر ابھی انہیں ایک فون کال بھی مل جاتی کہ وہ واپس آ جائیں تو وہ مجھ سے پوچھتے بھی نہیں اور وہ واپس چلے جاتے۔ مجھے یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر یہ شعیب لوگ واپس چلے گئے تو پھر میں اور بختاور رہ جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ہم پر کوئی بھی افتاد پڑتی تو ہمیں اس کا سامنا کرنا تھا، ہم پیچھے ہٹنے والے تو نہیں تھے۔ شعیب لوگوں کے ساتھ یہ آسرا تھا کہ وہ تربیت یافتہ لوگ تھے اور لڑنے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ اب ہمارا سامنا بھی ایسے لوگوں سے تھا جو لڑنے کا فن جانتے تھے۔ حالات اس نہج پر آ گئے تھے کہ ہمیں دشمن کو ہر حال میں ختم کرنا تھا، دوسری صورت میں ہمیں ختم ہو جانا تھا۔

"یار علی، تم گھبراؤ مت، ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اگر وہ کچھ نہیں کر رہے تو ہمیں بھی خاموش نہیں بیٹھنا چاہیے۔" آفتاب نے حوصلہ مند لہجے میں کہا۔

"اس سے پہلے کہ وہ ہم پر حملہ کریں، اگر وہ ہماری رینج میں آ جاتے ہیں تو ہم انہیں ختم کر دیتے ہیں۔" جہانگیر نے سرد لہجے میں کہا۔

"اب تو بنتا ہے یار، کوئی بارڈر پار سے آ کر ہمیں ہی مارنا چاہتا ہو، اسے تو بچ کر نہیں جانا چاہیے۔" مدثر نے کہا تو سب نے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بڑا اہم نکتہ کہہ دیا تھا۔

"بختاور، تم بستی چراغ شاہ کی ساری معلومات لو، اگر ہم ان پر حملہ کر سکتے ہیں تو ٹھیک ورنہ وہ جو دو بارڈر پار سے آئے ہیں، پہلے انہیں ہی دیکھ لیا جائے۔ کیا خیال ہے؟" شعیب نے ایک دم سے کہا تو سب نے اس کی تائید کر دی۔ پھر وہیں بیٹھے باتیں کرتے، کھانا کھاتے ہوئے شام ڈھل گئی۔

رات کا پچھلا پہر تھا۔ میں اور آفتاب گوپے کی طرف جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ایسے میں بختاور کا فون بجا۔ اس نے اسکرین پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بابا سائیں کا فون ہے۔" میں رُک گیا۔ ہم سب بختاور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ دیر باتیں کرتا رہا، پھر سیل فون بند کرتے ہوئے غصے میں بولا۔ "بابا سائیں کو ابھی جندوڈا کا فون آیا تھا۔ وہ دھمکی دے رہا تھا کہ وہ آج رات بستی بہادر خان کو گھیرے گا۔ اگر بابا سائیں ہم دونوں کو ان کے حوالے کر دیتا ہے تو پھر نہیں۔"

"کیا جندوڈا اب مذاق بھی کرنے لگا ہے؟" شعیب نے غصے میں کہا۔

"شعیب تم سمجھو، یہ مذاق نہیں، سازش ہے۔ وہ کہنا کچھ اور کرنا کچھ اور چاہتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس کچھ سازشی ذہن والے آ گئے ہیں۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ سوچنے لگا۔

"اور وہ اتنا پاگل بھی نہیں ہو سکتا کہ سیدھے دھمکی لگائے۔ وہ اب اتنی قوت نہیں رکھتا کہ ہم سے لڑ سکے وہ اپنا بہت نقصان کروا چکا ہے۔ اس کے پیچھے بیٹھے لوگوں نے اسے تحفظ دیا ہے تو اب اسے ہی سامنے کر کے......" شعیب نے سمجھانا چاہا تو آفتاب اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

''اویار، تم لوگ یہیں بیٹھے باتیں بنا رہے ہو، پاگل کتے کا صرف ایک ہی علاج ہے اسے مار دو۔''

اس نے کہا تو سب نے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھا، تبھی شعیب نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار، کب تک سامنا کرنے کا انتظار کیا جائے گا، جو کرنا ہے کر دو۔''

''لیکن احتیاط سے......'' میں نے کہا۔

''اس بستی سے باہر نکلیں پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے، چلو۔'' آفتاب نے کہا۔، وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم بستی سے باہر آچکے تھے۔

☆☆☆

ہم بستی چراغ شاہ سے تھوڑی دور پہنچ چکے تھے، یہاں ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم نے گاڑیاں جھاڑیوں میں کھڑی کر دیں۔ ہم تین تین کی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو جائے، آج پیروزاں کے ڈیرے پر دھاوا بولنا ہے۔ وہاں کیا ہوتا ہے یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ جوڑ لیا تھا۔ ڈیرے کے بالکل سامنے ایک اونچا ٹیلا تھا۔ جس سے سارا ڈیرا تو نہیں دیکھا جا سکتا تھا لیکن تھوڑا بہت اندر کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ میرا خیال یہی تھا کہ وہاں تک پہنچیں اور پھر ڈیرے کا اندازہ کر کے الگ الگ ہو جائیں۔ ہمارا مقصد وہاں دھاوا بولنا تھا، بس مارو اور بھاگو۔ اس طرح انہیں اپنی دھمکی کا جواب مل جاتا۔

سانول نے ایک آدمی ڈیرے پر بھیجا تھا مگر اس نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اگر خود گیا ہوتا تو بہتر معلومات مل سکتی تھیں۔ ہم اندھیرے میں بڑی احتیاط کے ساتھ اس ٹیلے پر لیٹ چکے تھے۔ ہمارا اور ڈیرے کا فاصلہ یہی کوئی آدھا کلومیٹر ہو گا۔ ڈیرے کے اندر روشنی تھی۔ ہم ابھی اندازہ لگا ہی رہے تھے کہ ایک دم سے اندر روشنی زیادہ ہو گئی۔ پھر اس سے زیادہ روشنی ہو گئی۔ اگلے چند منٹ میں پھاٹک کھلا اور یکے بعد دیگرے تین گاڑیاں باہر نکل آئیں۔ ان کے رخ کا اندازہ کرتے ہی بختاور نے بے ساختہ کہا۔

''یہ کیا، یہ تو واقعی ہی......''

''ٹھہرو، میں انہیں گھیرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اپنا سیل فون نکال کر جندوڈا کو کال کر دی۔ دوسری یا تیسری بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی۔ اس کی آواز سن کر میں نے کہا۔

''جندوڈا، تم نے چاچا سائیں کو فون کر کے دھمکی دی ہے کہ......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے فوراً حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں، کہا ہے اور سن لو، اب تمہیں ہم سے کوئی نہیں بچا سکتا۔''

''اتنا بڑا بول نہیں بولتے میری جان، میں تو خود تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے بھی حقارت سے کہا۔ میرا پورا دھیان کال کے پس منظر میں ابھرنے والی آوازوں پر تھا۔

''تو پھر بول فون کیوں کیا؟'' وہ غصے میں بولا۔

''صرف تمہیں یہ بتانے کے لیے کہ مجھے علم ہو چکا ہے کہ ڈیرے سے گاڑیاں نکل چکی ہیں۔ اگر تم ان گاڑیوں میں ہو، اور میری طرف ہی آرہے ہو تو میں تمہارا استقبال بستی سے باہر کروں گا۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہ معلومات تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟''

''صرف اس لیے کہ تم دھمکی لگا کر آرہے ہو۔ میں بھی تمہیں پہلے بتا دوں کہ میں تمہارا منتظر ہوں۔ اب دلیری دکھاؤ اور فوراً مجھ تک پہنچو۔'' میں نے کہا ہی تھا کہ وہ خاموش ہو گیا۔ میری نگاہ ان گاڑیوں پر تھی، وہ بستی چراغ شاہ پار کر چکی تھیں۔ میں فون کان سے لگائے بیٹھا جندوڈا کی آواز کا منتظر تھا۔ وہ کسی سے بات کر رہا تھا، پھر چند لمحے بعد اس کی آواز ابھری۔

''انتظار کر، میں آرہا ہوں۔''

''مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

یہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ گاڑی میں تھا۔ ڈیرے پر کون تھا، یہ جاننا بھی بہت ضروری تھا۔

''وہ بستی بہادر خان ہی جا رہا ہے۔'' میں نے کہا تو کئی آوازیں ابھریں۔

''چلو ان کا پیچھا کریں۔''

''کیا پہلے ڈیرے پر......'' میں نے کہا تو شعیب بولا۔

''ہاں ڈیرے پر بھی، اب نکلو، وقت نہیں ہے۔''

اس نے کہا اور ہم ٹیلے سے اٹھ کر اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگنے لگے۔ ہمیں گاڑیوں تک پہنچنے میں تقریباً پانچ منٹ لگے تھے اور پھر وہاں سے ڈیرے پر پہنچتے ہوئے دس منٹ ہو گئے۔ سانول نے جو بندہ ڈیرے پر بھیجا تھا، اس نے اب تک کوئی پتا نہیں دیا تھا۔ ٹیلے سے ڈیرے تک شعیب

نے ایک پلان دے دیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ کیا کرنا ہے۔ میری گاڑی آگے تھی اور شعیب میرے پیچھے۔ دونوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس بند تھیں۔ ڈیرے کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ میں نے تیزی سے گاڑی اندر داخل کی تو میرے پیچھے بیٹھے مدثر اور جہانگیر یک دم فائرنگ کرنے لگے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سامنے چارپائیوں پر چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ہی ایسا شخص تھا جس نے پتلون اور شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر اوٹ میں ہوتے ہی پسٹل نکال چکا تھا لیکن میں نے اسے تاک کر نشانے پر لیا تھا۔ میں نے دھیان یہ رکھا تھا کہ وہ فوری طور پر مرنے نہ پائے۔ وہاں چیخ و پکار مچ گئی تھی۔ کوئی چارپائی کے نیچے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی دیوار پھاندنے کے چکر میں گر پڑا تھا۔ دو چار ایسے تھے جو رہائشی حصے کے چھوٹے دروازے سے جانا چاہتے تھے لیکن انہیں بھی نشانہ بنا لیا گیا تھا۔

فائرنگ کا یہ سلسلہ دو منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم یوں بھی ڈیرے پر حملہ کر سکتے ہیں۔ یکلخت خاموشی طاری ہو گئی۔ میں حیران تھا کہ سامنے سے کسی دوسرے نے فائر کیوں نہیں کیا تھا۔ میں گاڑی بڑھا کر آگے چارپائیوں تک لے گیا۔ میں گاڑی سے اترا، مجھے علم تھا کہ میرے کور پر دو بندے ہیں۔ میں سیدھا اس پتلون والے کے پاس گیا، اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ میں نے اسے گردن سے پکڑا اور گھسیٹ کر گاڑی کے پاس لے آیا۔ میں نے اس کے چہرے کو سیدھا کر کے پوچھا۔

''بول، مرنا ہے یا زندہ رہنا ہے؟''

''کون...... ہو...... تم؟'' اس نے سوال کیا۔

''وہی جسے تم مارنے راجستان سے یہاں آئے ہو۔'' میں دانت پیستے ہوئے بولا تو وہ چونک گیا۔ مجھے جواب مل چکا تھا کہ وہ کون ہے، میں نے اس کی جیب سے سیل فون نکالا اور کہا ''اپنے لوگوں کو بتا دو۔''

''تم...... بچو گے...... نہیں۔'' اس نے کہا تو میں نے پسٹل سیدھا کر کے نال اس کے ماتھے پر رکھ دی پھر بولا۔

''تم نہیں تو میں بتا دوں گا۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے فائر کر دیا۔ وہ ایک طرف ڈھلک گیا۔ چونکہ ہمارے پاس وقت نہیں تھا اس لیے میں نے وہاں پر چیختے سسکتے ہوئے لوگوں سے اونچی آواز میں کہا۔

''اب تک جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب جو بھی اس ڈیرے پر ہمارے خلاف اکٹھا ہوگا، وہ ہمارا دشمن ہے ہم سے بچ نہیں پائے گا۔ وہ چاہے کوئی بھی ہو۔''

یہ کہتے ہی میں واپس گاڑی میں بیٹھا اور تیزی سے نکلتا چلا گیا۔

میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان تک ہماری اس کارروائی کی اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ لیکن میں مطمئن تھا، دشمن پر خوف طاری ہو جانے کا مطلب آدھی جنگ جیت لینے کے مترادف تھا۔

ہماری پوری کوشش تھی کہ ہم جلد از جلد بستی بہادر خان تک پہنچ جائیں۔ بختاور نے چاچا سائیں کو سب بتا دیا تھا۔ وہ لوگ ان کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ بختاور نے چاچا سائیں سے مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ اس وقت ہم بستی کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے، ہماری رفتار تھوڑی زیادہ تھی۔ گاڑی کی روشنی بھی دھیمی تھی۔ میں محتاط انداز میں جا رہا تھا کہ اچانک ہماری گاڑی پر برسٹ پڑا۔ ایک لمحے سے بھی کم وقت میں سمجھ آ گیا کہ وہ ہمارے لیے گھات لگائے بیٹھے ہیں۔

''حملہ ہو گیا ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا، اس کا مطلب تھا کہ پیچھے والے بھی جان جائیں۔ میری تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر تھی، میں تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ تبھی پیچھے سے فائر ہونے لگے۔ اچانک میری نگاہ دائیں جانب ٹیلے پر پڑی، نال سے نکلتا ہوا شعلہ ان کی نشاندہی کر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اوپر ٹیلے پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں وہاں رکا نہیں کیونکہ وہاں رکنے کا مطلب تھا کہ خود کو موت کے حوالے کر دیا جائے۔ میرا اندازہ تھا کہ جس رفتار سے میں جا رہا ہوں آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں ہم ان کی رینج سے باہر جا سکتے تھے۔ میں ان کی رینج سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ میں ڈرائیو کرتا رہا، میں جانتا تھا کہ جب تک ہم گاڑی میں ہیں، ہم ان گولیوں سے محفوظ ہیں۔ اگرچہ ہماری گاڑیاں کوئی بلٹ پروف نہیں تھیں، لیکن پھر بھی کافی حد تک محفوظ ہی تھیں، مجھے ڈر صرف یہی تھا کہ اگر ٹائر برسٹ ہو گیا تو پھر ہمیں مجبوری میں رکنا پڑے گا۔

''آفتاب، تم محفوظ ہو؟'' میں نے چیختے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ہاں، سب ٹھیک...... بس نکلو......'' اس نے تیزی سے کہا۔

ہم آدھے منٹ سے بھی کم وقت میں کافی دور آ گئے تھے۔ ان کی طرف سے اب بھی فائرنگ ہو رہی تھی لیکن ہم

نے فائر بند کر دیا تھا۔ میں اپنی گاڑی کو ایک ٹیلے کی اوٹ میں لے گیا۔ رکتے ہی ہم گاڑیوں سے اترے اور جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ شعیب بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر پہنچ گیا تھا۔

''اب دیکھتے ہیں، یہ کیا کرتے ہیں؟'' جہانگیر کی آواز ابھری۔

''پہلے یہ دیکھ لو اچھی طرح ان سب کی پوزیشن کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ایک ایک گولی حساب سے استعمال کریں گے جناب، فکر نہ کرو۔'' مدثر چہکا تو ایک دم سے فضا میں تناؤ کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

''یار ہم یہاں اور وہ وہاں بستی میں نہ پہنچ گئے ہوں؟'' جہانگیر نے خیال ظاہر کیا تو بختاور کی آواز فوراً آ گئی۔

''نہیں نہیں، وہ ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں۔ اگر چلے بھی گئے تو وہ سنبھال لیں گے، تم ان کی فکر کرو۔''

''او کے، سامنے دیکھو۔'' شعیب نے کہا۔

اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ان کی گاڑیاں تک نگاہ سے اوجھل تھیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان کی گاڑیاں وہاں پر نہیں تھیں۔ جس طرح ہم چھپ کر ان کے لیے گھات لگا کر بیٹھ گئے تھے، وہ بھی انہی ٹیلوں پر موجود تھے۔ وہ فائرنگ کر کے بھاگے نہیں تھے یہیں کہیں تھے۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اگر وہ بھاگے ہوتے تو ان کی گاڑیوں کی آواز ضرور سنائی دیتی۔

مجھے یہ خیال آنے لگا کہ اگر ایک بندہ دور دور سے ہوتا ہوا، ایک چکر لگا لے تو ان کے بارے میں پتا چل سکتا ہے کہ وہ کہاں ہیں، ان کی پوزیشن کیا ہے، یہ بھی اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ کتنے بندے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی میں چونک گیا، ممکن ہے یہی حربہ وہ ہمارے ساتھ بھی آزما سکتے ہیں۔ میں نے فوراً سب سے خیال شیئر کیا تو وہ چوکنا ہو گئے۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے مدثر نے پیچھے کی طرف نگاہ رکھ لی۔ ممکن ہے کوئی ہمارے عقب میں نہ دھاوا بول دے۔ جہانگیر نے یہ صلاح دی کہ ابھی خاموشی سے بیٹھے رہو اور دشمن کے اعصاب دیکھو۔ وہ خود ہی اپنا آپ ظاہر کر دے گا۔ سب ہی کو اس کا خیال پسند آیا۔ واقعتاً یہ اعصاب کی جنگ تھی۔ ہمیں تو پتا تھا کہ انہوں نے کہاں گھات لگائی ہوئی ہے۔ انہوں نے ہم پر فائرنگ کر کے اپنی نشاندہی کر دی تھی۔ لیکن ہم تو ان کے سامنے سے گزر کر گئے تھے اور پھر اچانک غائب ہو گئے، یہ پریشانی ان پر مسلط ہو سکتی تھی۔

دو گھنٹے سے زیادہ کا وقت گزر گیا تھا۔ سامنے سے کوئی ایسی حرکت نہیں ہوئی تھی جس سے ان کے بارے میں پتا چلتا۔ ایسے میں بختاور کی آواز گونجی۔

''شعیب اگر کہو تو میں ساتھ والے ٹیلے پر جا کر انہیں دیکھوں؟''

''رسک ہے یار۔'' وہ فوراً بولا۔

''لیکن یوں پڑے رہنے سے......'' اس نے کہنا چاہا تو آفتاب نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''صبر میاں صبر...... آخر دن بھی تو نکلنا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ وہ اس وقت تک یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ سمجھو کہ وہ زیادہ لوگ ہیں۔''

''ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا، ایسا نہ ہو کہ ہم یہاں پڑے رہیں اور وہ یہاں سے چلتے بنیں۔'' مدثر نے کہا۔

''چل ہم دونوں آگے بڑھتے ہیں۔''

''چل......'' وہ فوراً تیار ہو گیا۔

وہ دونوں اپنے اپنے ٹیلے سے نیچے اترے۔ بختاور وہیں کھڑا رہا، یہاں تک کہ مدثر اس کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے ہم سب کے دائیں جانب ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ یہ انہوں نے تیسرا اٹھکانا بنانا چاہا تھا۔ ہر ٹیلے پر دو دو بندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہماری تمام تر توجہ ان کی طرف تھی۔ وہ جیسے ہی سرے پر پہنچے، بختاور کی دبی دبی آواز گونجی۔

''میں اپنے سامنے، بالکل سامنے ان کی تینوں گاڑیاں دیکھ رہا ہوں۔''

''اوہ......'' تقریباً سب کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''بختاور، تم ذرا سا صبر کرو، ہم آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر ٹیلے سے اترنے لگا۔ جہانگیر بھی میرے پیچھے آنے لگا۔

کچھ دیر بعد ہم سب اسی ایک ٹیلے پر موجود تھے۔ سامنے پوری طرح گاڑیاں دکھائی نہیں دے رہی تھیں، بلکہ ایک گاڑی کے اندر ننھا سا بلب روشن تھا۔ وہ انہوں نے جان بوجھ کر روشن رکھا تھا یا پھر بھول گئے تھے۔

''اب ہمیں دن کا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر......'' شعیب کہتے کہتے رک گیا پھر وہ اپنا پلان بتانے لگا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم چپ سادھے سنتے

رہے۔ جب اس نے ڈن کیا تو مدثر اور آفتاب ٹیلے کی پچھلی طرف اترنے لگے۔ ان کو اپنی گاڑیوں تک جانا تھا۔ مجھے اور بختاور کو ٹیلے کے سامنے کی طرف سے رینگ کر اترنا تھا۔ جیسے ہی وہ دونوں گاڑیوں تک پہنچے، میں اور بختاور ٹیلے کے سامنے سے اترنے لگے۔ ہم بہت محتاط تھے۔ ہمارے عقب میں شعیب اور جہانگیر کور پر تھے۔ تقریباً تہائی کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے آدھے گھنٹے میں طے کیا۔

ہم گاڑیوں سے دس بارہ فٹ کے پاس پہنچے تھے کہ ہمیں ہوا کے دوش پر باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ ان کی تعداد کافی تھی۔ اتنے لوگ بڑی مشکل سے خاموش رہ سکتے تھے۔ مجھے ان کی سمت کا اندازہ ہو رہا تھا لیکن میں ان پر فائرنگ نہیں کر سکتا تھا ورنہ سارا کھیل ہی بگڑ جاتا۔ ہم نے یہ دس بارہ فٹ کا فاصلہ انتہائی احتیاط سے عبور کیا۔ تینوں گاڑیاں ساتھ ساتھ ہی کھڑی تھیں۔ میں نے ہولے سے کہا۔

”میں گاڑیوں کے پاس پاس پہنچ چکا ہوں۔ بختاور......“

”میں تیار......“ اس نے کہا تو میں نے جیب میں پڑا دستی بم نکالا، بلاشبہ بختاور نے بھی نکال لیا ہوگا۔ تبھی میں نے کہا۔

”ایک......دو......اور تین......“

میں کھڑا ہوا، دستی بم کی پن کھولی اور اسے گاڑی کی سمت اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی جتنی تیزی سے ہو سکتا تھا، میں مخالف سمت میں بھاگا۔ تھوڑے سے فاصلے پر ہی تھا کہ زوردار دھماکا ہوا، اس کے ساتھ ہی دوسرا دھماکا ہو گیا۔ میں ان دھماکوں کے اثر کی وجہ سے منہ کے بل گرا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں اٹھا اور تیزی سے بھاگنے لگا۔ اسی وقت فائرنگ شروع ہو گئی۔ میرا انہیں خیال تھا کہ دو گاڑیوں کے دھماکے میں تیسری گاڑی نہ جلتی۔ روشنی ہوئی ہوگی، لوگ گاڑیوں کی جانب بھاگے ہوں گے تو شعیب کو روشنی میں لوگ دکھائی دے گئے تھے۔ اس نے بھی فائرنگ کرنا شروع کر دی تھی۔ یہ فائرنگ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ منٹ ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

میں بھاگتا ہوا ٹیلے کے پاس پہنچ چکا تھا۔ دونوں گاڑیاں وہاں تک آ چکی تھیں۔ میں اس میں بیٹھ گیا تو سامنے سے بختاور بھی بھاگ کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اوپر سے شعیب اور جہانگیر بھی آ گئے، ہم گاڑیوں میں بیٹھے اور ایک طرف نکل پڑے،، ہم ابھی تھوڑا سا چلے تھے کہ ہیڈلائٹس کی روشنی میں کچھ لوگ بھاگتے ہوئے دکھائی دیے۔ جیسے ہی ان پر روشنی پڑی، وہ دیوانہ وار بھاگنے لگے۔ ہماری گاڑیوں میں سے ان پر فائرنگ ہونے لگی۔ کوئی گر گیا، کوئی بھاگ رہا تھا، کوئی دائیں بائیں ہو گیا۔

میں جانتا تھا کہ بہت سارے لوگ جھاڑیوں میں چھپ گئے ہوں گے۔ ہم تھوڑی دیر تک وہاں پھرتے رہے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں سے ہم پر فائرنگ ہوگی، جلتی ہوئی ہیڈلائٹس ہماری نشان دہی کر رہی تھی۔ اچانک شعیب نے کہا۔

”علی، کیا خیال ہے، سیدھے بستی چراغ شاہ جائیں اور پیروزاں کے ڈیرے پر قبضہ کر لیں؟“

”بہت اچھے......“ میں نے کہا۔

”لیکن پہلے ان کی گھات ضرور لگائیں۔ انہوں نے واپس وہیں جانا ہے۔“ بختاور نے کہا۔

”چل ٹھیک ہے نکلو ادھر باقی میں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا تو گاڑیاں اس جانب مڑ گئیں۔ ہم نے ہیڈلائٹس بند کر دیں تھیں۔ اس میں تیز ڈرائیونگ تو نہیں ہو سکتی تھی لیکن اس طرح محفوظ رہا جا سکتا تھا۔

اس وقت رات کا آخری پہر چل رہا تھا، جب ہم بستی چراغ شاہ کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ اس بار ہمارا ٹھکانا وہی ٹیلا تھا، جس پر ہم رات کے پہلے پہر بیٹھے رہے تھے۔ ہمیں یہ انتظار تھا کہ وہ لوگ واپس کب آتے ہیں۔

ہم وہاں بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ ڈیرے میں کسی قسم کی کوئی ہلچل نہیں تھی۔ تبھی مجھے خیال آیا سانول سے تو پوچھوں کہ کیا ہوا تھا؟

میں نے اسے فون ملایا، اس نے فوراً کال ریسیو کر لی۔

”بول، پیروزاں کے ڈیرے پر......“

”کم از کم دس بندے زخمی ہوئے ہیں، ایک راجھستانی بھی مارا گیا ہے۔ اس کی لاش پہلے تو وہاں پڑی رہی پھر اسے کچھ لوگ لے گئے ہیں۔“

”کچھ لوگ لے گئے ہیں، مطلب کون لوگ تھے وہ؟“ میں نے پوچھا۔

”میرے خیال میں......اور سنا بھی میں نے یہی ہے کہ وہ لوگ سردار نور حیات کے لوگ تھے۔ دن چڑھے پتا چل جائے گا کہ وہ لوگ وہیں کے تھے یا نہیں۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”اب ڈیرے پر کون کون ہے؟“ میں نے اس سے

کہا۔

''ابھی دس منٹ پہلے میں وہاں سے آیا ہوں، وہاں کوئی نہیں ہے، سب دہشت کے مارے بھاگ گئے ہیں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''وہاں کے نوکر چاکر......؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی وہاں نہیں ہیں، سب بھاگ گئے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''ممکن ہے ان دس منٹوں میں وہاں کوئی آ گیا ہو، تم جاؤ وہاں پر اور اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ۔'' میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا تو وہ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ میں نے کال بند کر کے فون جیب میں ڈال لیا۔ مجھے پہلے سانول کا اور پھر ان سب کا انتظار تھا کہ وہ کب آتے ہیں۔

☆☆☆

روشنی پھیل چکی تھی۔ ہم ٹیلے پر بیٹھے تھے۔ سانول نے ڈیرے میں جا کر بتا دیا تھا کہ وہاں پر کوئی بھی نہیں ہے۔ اب وہ ڈیرے میں ہی ایک چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ مجھے جندوڈا، بگا راجھستانی، اور دوسرے راجھستانی کا انتظار تھا کہ وہ کب ڈیرے پر آتے ہیں لیکن روشنی پھیل جانے تک کوئی نہیں آیا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی نہیں آئے گا۔'' شعیب نے سوچتے ہوئے کہا۔

''تو چلو پھر، اسی ڈیرے پر چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چل یار، اب تو بھوک بھی بڑی لگ گئی ہے۔'' جہانگیر نے کہا تو ہم ٹیلے سے اُتر کر گاڑیوں تک جا پہنچے۔ کچھ دیر بعد ہم ڈیرے پر تھے۔ وہاں جاتے ہی عجیب سی بے چینی نے مجھے گھیر لیا تھا۔ میرن شاہ خاندان کے لیے میرے اندر جو نفرت تھی، وہ اپنا احساس دلانے لگی تھی۔

بختاور کا بستی بہادر خان سے مسلسل رابطہ تھا۔ اس نے وہاں کہہ دیا کہ ہمارے لیے کھانا بھیج دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں ہم تک کھانا پہنچ سکتا تھا۔ ہم ریت سے اَٹے ہوئے تھے۔ اس لیے ساتھ میں کپڑے بھی منگوا لیے۔ میں رہائشی حصے کی دیوار میں لگے چھوٹے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس تک گیا، اسے کھولا اور اندر چلا گیا۔ پورا گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک ایک کمرا دیکھ کر اپنی تسلی کی۔ ممکن ہے، وہاں کوئی چھپا بیٹھا ہوا۔ اپنی پوری تسلی کر لینے کے بعد مجھے وہاں پر موجود مویشیوں کا خیال آیا۔ وہ بے چارے پتا نہیں کب کے بھوکے ہوں گے۔ میں نے

انصاف پسند شیر (حکایت)

ایک شیر نے ایک بیل کا شکار کیا اور اس کو کھانے ہی لگا تھا کہ اتنے میں ایک چور آ گیا اور بولا۔ ''اس میں سے آدھا مجھے دے دو۔''

شیر نے کہا۔ ''چل بھاگ یہاں سے۔ اے چور! جس چیز پر تیرا حق نہیں ہوتا اس کو چرا کر لے جاتا ہے۔ میں تجھے اس شکار میں سے کچھ نہیں دوں گا۔'' اتفاق سے ایک غریب مسافر کا ادھر سے گزر ہوا۔ وہ شیر کو دیکھ کر راستہ بدل کر جانے لگا۔ شیر نے اس کی شرافت دیکھ کر اسے نرمی سے قریب بلایا اور کہا۔ ''آؤ اس شکار میں سے اپنا حصہ لے لو کیونکہ تو شرافت اور نیک چال چلن کی وجہ سے دنیا میں زیادہ افضل ہے......'' یہ کہہ کر شیر نے شکار کے دو حصے کیے اور اپنا حصہ لے کر جنگل میں چلا گیا۔

(اس حکایت سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان کو دنیا میں شرافت اور نیک چال چلن سے رہنا چاہیے۔)

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

سانول کو بلا لیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا تو میں نے اسے ان مویشیوں کا کچھ کرنے کو کہا۔

''میں جاتا ہوں بستی میں، کچھ لوگوں کو لاتا ہوں۔ وہ انہیں چرانے کے لیے باہر لے جائیں گے۔''

''اور جن کا دودھ دھونا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں سب کر لیتا ہوں، تم پریشان نہ ہو۔'' یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ رہائشی حصے کی طرف کا پھاٹک کھلا اور اس میں سے ایک گاڑی اندر آ گئی۔ میں اوٹ میں ہو گیا۔ وہ گاڑی صحن میں آ رکی تھی۔ اس میں سے بستی بہادر خان کے دو جوان نکلے۔ ایک کے ہاتھ میں کپڑوں کی گٹھری تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں کھانا بندھا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے ہی جب ساوری اتری تو میں حیران رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دماغ گھوم کر رہ گیا، یہ یہاں پر کیوں ہے؟

ساوری متلاشی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو وہ تقریباً بھاگتے ہوئے میرے سینے سے آ لگی۔ وہ ہچکیاں

لے کر رونے لگی تھی۔ میں بے حد پریشان ہو گیا۔ میں نے اسے چاچا عبدالمجید کے پاس بھیجا تھا۔ انہوں نے اب اسے واپس بھیج دیا، کیا اس میں بھی کوئی پیغام تھا؟ ایسے حالات میں اسے بھیج دینے کا مقصد کیا تھا؟ کیا بابا خیر دین بھی آ گیا یا اکیلی ساوری ہی آئی ہے؟ یہ سوچتے ہوئے میں نے اسے خود سے الگ کر کے پوچھا۔

''میں نے تمہیں وہاں اس لیے بھیجا تھا کہ تم اور بابا خیر دین محفوظ رہو، تمہیں صرف ایک بات بتانی ہے اور وہ بھی سچ......'' میرے لہجے میں ایسا کچھ تھا کہ ساوری نے چونک کر میری طرف دیکھا، اس نے اپنی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات......؟''

''انہوں نے تمہیں یہاں بھیجا ہے یا......'' میں نے پوچھنا چاہا تو وہ میرا عندیہ سمجھ کر تیزی سے بولی۔

''نہیں......نہیں، میں خود آئی ہوں۔ بابا نہیں آیا، چاچا نے اسے آنے ہی نہیں دیا، وہ بیمار ہے وہاں؟''

''تمہیں پتا ہے کہ یہاں آگ لگی ہوئی ہے، میں چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں پھر بھی انہوں نے تمہیں آنے دیا؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''میں خود ضد کر کے آئی ہوں۔'' اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے کہا۔

''کیوں آئی ہو؟'' میں نے سختی سے پوچھا۔

''میں وہاں تڑپ رہی تھی۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''وہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک......'' میں نے کہنا چاہا تو اس نے تیزی سے کہا۔

''انہوں نے مجھے بیٹی بنا کر رکھا اور بیٹی کا ہی مان دیا ہے۔ میرا بہت خیال رکھا۔ لیکن تم یہاں...... میں برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ تم یہ ساری دشمنیاں چھوڑو، اور چلو واپس۔'' ساوری نے روہانسا ہو کر کہا تو میں ایک لمحے کے لیے چکرا کر رہ گیا۔ کیا ساوری بھی یہاں کسی مقصد ہی کے لیے آئی ہے؟ اسے بھی اس لیے بھیجا گیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر واپس چلا جاؤں؟ کیا چاچا عبدالمجید یہ چاہتے ہیں کہ میں اپنی ضد سے باز آ جاؤں؟ سوالوں کا ایک سلسلہ تھا جو دراز ہوتا جا رہا تھا۔

''یہ کپڑے......'' ایک نوجوان نے پوچھا تو مجھے ہوش آ گیا۔ میں نے ساوری کی طرف دیکھا۔ وہ حسرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ اس نے پلٹ کر نوجوان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''یہ کپڑے اور کھانا ادھر ہی رکھ دو، انہیں کہو کہ پہلے ایک ایک کر کے نہا لیں، پھر کھانا کھا لیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نوجوان نے کہا اور باہر چلا گیا۔ میں برآمدے میں پڑی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ساوری نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی۔

ساوری ان چند دنوں ہی میں بے حد نکھر گئی تھی۔ سرخ گال، گلابی ہونٹ، بھاری پلکوں میں بھیگی آنکھیں، شفاف جلد، سلیقے سے سنوارے ہوئے گیسو، بھاری چوٹی اس کی کمر پر جھول رہی تھی۔ جدید تراش کا لباس اس کے بدن پر خوب جچ رہا تھا۔ میں اس میں کھو گیا تھا۔ مجھے وہ چھوٹی سی بچی یاد آنے لگی جو اپنے بھوجن میں بتاشے اور کھانے چھپا کر میرے لیے لاتی تھی۔ کیا اس کے دل میں میرے لیے اب بھی محبت ہے۔ کیا وہ مجھے وہی علی سمجھ کر محبت کر رہی ہے یا کسی دوسرے کو؟ کیا میں اسے یاد ہوں گا؟ کیا اب بھی وہ میری محبت میں یہاں تک آ گئی ہے یا......؟'' میں اس سے آگے نہیں سوچ پایا۔ کون کس وقت کب بدل جائے، یہ کہا تو نہیں جا سکتا تھا مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، ان کے لیے دل مانتا ہی نہیں۔ وہ اگر دھوکا بھی دے جائیں تو دکھ نہیں ہوتا۔

سب باری باری کھانا چکے تو اُس نے میرے سامنے کھانا لا کے رکھا۔ پھر خود بھی میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کھانا کھا لو، پھر بات کرتے ہیں۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ میرے سامنے تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے تپتی ہوئی زمین پر بارش برسا دی ہو۔

میں نے سب کو سو جانے کے لیے کہا تو وہ سب رہائشی حصے میں آ کر سو گئے۔ ان کی نگرانی کے لیے دونوں نوجوان تھے۔ جبکہ میں اور ساوری برآمدے میں آ بیٹھے تھے۔ میں چارپائی پر بیٹھا تھا اور وہ موڑھا ڈالے میرے سامنے بیٹھ گئی تھی۔ وہ خاموش تھی، جیسے کوئی بات کرنے کا سرا تلاش کرنا چاہتی ہو۔

''ساوری، تم کیا چاہتی ہو؟''

''بتایا تو ہے۔'' اس نے تیزی سے کہا پھر لمحہ بھر خاموش رہ کر سکون سے بولی، ''ہو سکتا ہے پیروزاں کو یہاں

لاکر مارنے کی تمہاری ضد پوری نہ ہو۔''
''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''دیکھو، میرن شاہ نے بہت پہلے جب بہاول پور میں اپنا بڑا سا گھر بنایا تھا، اس کے فوراً بعد اس نے لندن میں بھی اپنی جائداد بنائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے بچے وہاں جا کر پڑھیں گے۔ کیونکہ اس کی بیوی وہاں کی شہریت رکھتی ہے۔ میرن شاہ قتل کے بعد وہ اپنے بچوں اور اماں سئین کو لے کر وہاں چلی گئی ہے۔ اسے ڈر تھا کہ تم انہیں بھی قتل نہ کر دو۔''
''مجھے ان سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ میں انہیں......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات قطع کرتے ہوئے بولی۔
''میں یہ اس لیے بتا رہی ہوں کہ پیروزاں بھی وہاں چلی جائے گی۔'' اس نے کہا تو میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ سے مزید دور ہو گئی ہے۔ میں نے بہت بڑی غلطی کی تھی کہ پیروزاں کو چھوڑ کر چوہدری آصف کو پکڑ لیا تھا۔ روہی میں لاکر مارنے کے بجائے، وہیں اسے ختم کر دیتا۔
''تو کیا وہ چلی گئی ہے؟'' میں نے مایوسی سے پوچھا۔
''نہیں، وہ ابھی گئی نہیں ہے۔ وہ ابھی تک وہیں اپنے بہاولپور والے بنگلے ہی میں ہے۔'' ساوری نے پُرسکون لہجے میں کہا۔
''اوہ، تو اس کا مطلب ہے کہ آج رات ہی......'' میں نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔
''میں بھی چاہتی ہوں کہ وہ قتل ہو جائے۔'' ساوری نے ایک دم سے کہا پھر تیزی سے بولی۔ ''مگر وہ اب ہاتھ نہیں آنے والی۔''
''ایک طرف تم کہہ رہی ہو کہ وہ بنگلے پر ہے اور پھر کہتی ہو کہ وہ ہاتھ نہیں آنے والی، تم مجھے الجھا کیوں رہی ہو؟'' میں نے سختی سے کہا۔
''بنگلے میں ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ وہیں رہتی ہے۔ یہ بھی جان لو کہ وہ تم سے خوف زدہ نہیں۔ اسے سردار نور حیات نے سہارا دیا ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔
''ہاں یہ تو مجھے پتا چل گیا ہے۔ میرے دشمن اس وقت اسی کے پاس ہو سکتے ہیں۔ یہ مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔
''تمہیں یہاں اُلجھانے کے دو مقصد ہیں۔ پیروزاں کے ابھی تک کاغذات پورے نہ ہونے کی وجہ سے ویزا نہیں مل رہا۔ لیکن امکان ہے کہ وہ مل جائیں گے۔ تب تک وہ تمہیں یہاں اُلجھاتے رہیں گے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ اگر اس دوران میں تم قتل ہو جاؤ تو پھر سارا معاملہ ہی حل ہو جائے گا، پھر اس کو کہیں نہیں جانا۔'' اس نے مجھے تفصیل سے بتایا تو میں نے اس سے پوچھا۔
''یہ ساری باتیں تمہیں کہاں سے پتا چلی ہیں؟''
''رحماں مائی...... میرے بچپن کی سہیلی، جو پہلے میرن شاہ کے بچوں کی نوکرانی تھی اور اب پیروزاں کی نوکرانی بن گئی ہے، جسے وہ کبھی بھی پسند نہیں کرتی تھی۔'' اس نے بڑے سکون سے کہا۔
''تمہارا اس سے رابطہ......''
''فون پر ہوتا ہے۔ یہاں ہوتے ہوئے بھی اکثر اس سے بات کر لیا کرتی تھی۔ اب تو ہوتی رہتی ہے۔'' اس نے بتایا۔
''ساوری، میں نے جس وقت کے لیے ساری زندگی انتظار کیا، میں اسے اپنے ہاتھ سے نہیں نکلنے دوں گا۔ اب وہ جہاں بھی ہے، میں اسے نکال لوں گا، میں اسے چھوڑنے والا نہیں۔ میں آج اور ابھی نکلوں گا۔'' میں نے کہا اور بے چینی سے پہلو بدلا۔ وہ خاموش رہی تو میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم واپس چاچا کے پاس چلی جاؤ، مجھے امید ہے وہ تمہارا تحفظ کریں گے۔''
''تم اپنی ضد پر کیوں اَڑے ہوئے ہو۔ وہ بجھو ختم ہو چکی ہے۔ چند دن یا شاید دو چار دن، وہ یہاں رہے گی ہی نہیں۔ پھر کیا کرو گے، کیا لندن جاؤ گے، وہاں سے روہی لاؤ گے اسے؟'' وہ پُرسکون انداز میں بولی۔
''ساوری، کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ یہ صرف میری ضد ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''میں جانتی ہوں، تم کون ہو......'' اس نے ہولے سے بڑی محبت سے کہا تو میں چونک گیا، پھر حیرت سے پوچھا۔
''کس نے بتایا؟''
''جس دن تم پہلی بار یہاں آئے تھے، بابا نے اسی دن تمہیں پہچان لیا تھا۔ باقی چاچا عبدالجبر نے مجھے بتا دیا۔'' اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔
''اور تم، کیا تم نے مجھے پہچانا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔
''ہاں، اُس دن مجھے شک ہوا تھا جب پہلی بار تمہیں دیکھا اور یقین اس دن ہوا جب میں نے تمہیں تھپڑ مارا تھا۔'' اس نے کہا اور بھیگی پلکوں سے میری طرف دیکھا۔ میں اس

کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرا اندر درد سے بھر گیا تھا۔

''ساوری، میں جو زندگی گزار رہا ہوں، مجھے نہیں پتا اگلے چند لمحے بھی ہیں میرے پاس کہ نہیں۔ اس بیچ میں کوئی ایسی حسرت لے کر نہیں مرنا چاہتا جو میری دسترس میں بھی ہو اور میں اسے پوری نہ کر پاؤں۔'' میں نے اسے کہہ تو دیا لیکن مجھے اپنے لفظوں پر خود یقین نہیں تھا۔ مجھے احساس ہو گیا کہ میرے لفظ ہی نہیں میرا لہجہ بھی کھوکھلا ہے۔ وہ میری بات سن کر تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر روہانسا لہجے میں بولی۔

''سب کچھ ہاتھ نہیں آتا علی، زندگی......''

''مجھے یہ فلسفہ سمجھ نہیں آتا۔ میں سمجھوتا کر کے نہیں، دلیری سے مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایسا کوئی سبق مت سمجھانا۔'' میں نے سختی سے کہا اور اٹھ کر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے، ابھی تم جاؤ بستی، مجھے وقت ملا تو میں ملنے آجاؤں گا۔ کوشش کرو کہ واپس چاچا عبدالمجید کے پاس چلی جاؤ۔''

میں اسے برآمدے میں بیٹھا چھوڑ کر ڈیرے کی طرف جانے لگا تو اس نے ہولے سے کہا۔

''کیا تم چاہتے ہو کہ میں یہاں سے چلی جاؤں؟''

اس نے نگاہیں بھر کے میری طرف دیکھا۔ شاید عورت کی ایسی ہی ادائیں مرد کو مار دیتی ہیں۔ وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اپنے دل کی سنے یا دماغ کی۔ میں چند لمحے چپ رہا پھر بڑے پیار سے بولا۔

''دیکھ ساوری، تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ لیکن یہ تم جانتی ہو کہ تمہارے اور میرے درمیان ایک ایسی نفرت زدہ اَن دیکھی دیوار ہے، جب تک میں وہ گرا نہیں لیتا، تب تک میں اپنی محبت کو نہیں پا سکتا۔''

''میں جانتی ہوں علی تم جس کے لیے یہاں اتنی قتل و غارت گری میں اُلجھے ہوئے ہو، وہ تو......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''وہ جہاں بھی جائے گی، میں اُس کے پیچھے جاؤں گا۔ یہاں تک کہ اسے یا مجھے موت آجائے۔''

میں کہہ رہا تھا اور وہ میرے چہرے کو تک رہی تھی۔ نجانے کتنے رنگ آ کر گزر گئے۔ میں جانتا تھا کہ اس کے من میں پتا نہیں کیسے کیسے طوفان اٹھ رہے ہوں گے مگر وہ میری راہ نہیں روک سکتے تھے۔ ہمارے درمیان خاموشی آن ٹھہری تھی۔ ایک ایسا سناٹا جس میں سوچیں تک گونجنے لگتی ہیں......

''تمہارے پاس کتنا اسلحہ ہے؟'' اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا تمہارے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ اُن سے لڑتے رہو؟'' اس نے حتمی لہجے میں پوچھا۔

''میرے پاس جتنا اسلحہ تھا، میں لڑا ہوں، اور جتنا ہے اس سے بھی لڑتا رہوں گا۔'' میں نے کہا پھر چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''لیکن تم نے یہ سوال کیوں کیا؟''

''آؤ، میرے ساتھ۔'' اس نے کہا اور اماں سئین کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ میں چند لمحے کھڑا رہا اور پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔

کمرے کے درمیان اماں سئین کا نواڑی پلنگ پڑا ہوا تھا۔ ایک دو کرسیاں تھیں، لکڑی کے بڑے بڑے صندوق تھے۔ یا پھر اس کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ ساوری نے جاتے ہی ایک لکڑی کی الماری کھولی۔ اس کے اندر خانے بنے ہوئے تھے۔ اس نے اسے گھمایا تو وہاں ایک خلا پیدا ہو گیا۔ وہ مجھے اشارہ کر کے اندر کی جانب اتر گئی۔

میں سمجھ تو گیا تھا کہ نیچے تہ خانہ ہو سکتا ہے۔ ایسا تہ خانہ ہونا کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی مگر میں ساوری کا پُراسرار رویہ دیکھ کر متجسس ہو گیا تھا۔ میں لاشعوری طور پر محتاط تھا مگر ساوری کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ میں بھی اس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگا۔ میرے سامنے ایک کھلا کمرا تھا اور وہاں اتنا اسلحہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''یہ اتنا اسلحہ......؟''

''ان اسلحہ بیچنے والوں کو اسلحہ چلانا نہیں آیا ورنہ یہاں کے سب سے بڑے حاکم یہی ہوتے۔'' ساوری نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں، انہوں نے منشیات کے علاوہ اسلحہ بیچنے کا کام بھی کیا ہے اور میرن شاہ اپنی موت تک کرتا رہا ہے۔ اس تہ خانے کے اوپر اسٹور ہے۔ وہاں جان بوجھ کر بے کار چیزیں پھینکی ہوئی ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''وہ دیکھو، وہاں بھی سیڑھیاں اترتی ہیں۔ تھوڑا بہت مال یہاں سے جاتا تھا اور زیادہ مال وہاں سے۔ یہ مال رکھا بھی یہیں سے جاتا رہا ہے۔'' اس نے کہا تو میں وہاں پڑے اسلحے کی

ڈیرے کی جانب چل دیے۔ ڈیرے میں ایک بلب روشن تھا جو ایک بانس کے ساتھ باندھا ہوا تھا۔ اس کی روشنی ڈیرے کے باہر کی جانب پھیل رہی تھی۔ وہ بلب اتنا طاقتور نہیں تھا کہ اس کی روشنی دور تک جاتی۔ وہ ڈیرے کی چار دیواری سے کوئی پانچ دس فٹ کے فاصلے کو روشن کر رہی تھی۔ بلاشبہ وہ کسی بیٹری پر لگایا ہوا تھا۔ ورنہ جنریٹر ہوتا تو اس کی آواز آرہی ہوتی۔ تھوڑے سے فاصلے پر پہنچ کر ہم اونٹوں سے اُتر آئے۔ ہم نے ایک دوسرے سے رابطے کے لیے ریسیور سیٹ کر لیے۔ تبھی میں نے چار دیواری کے ساتھ جہاں اندھیرا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس طرف سے دیکھتا ہوں۔''

میں نے اپنا پسٹل ہاتھ میں لیا اور تیزی سے محتاط انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں لحہ بہ لحہ چار دیواری کے قریب ہوتا جارہا تھا۔ مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ ڈیرے کے کچے کمروں کی چھت پر کوئی موجود نہ ہو، اگر کوئی وہاں ہوا تو وہ مجھے آسانی سے نشانہ بنا سکتا تھا۔ وہ تھوڑا سا فاصلہ میں نے انتہائی سرعت سے پار کیا اور کچی چار دیواری کے ساتھ جا لگا۔ میں نے اپنے دوستوں کو بتا دیا کہ میں چار دیواری تک پہنچ چکا ہوں۔ وہ دیوار کوئی دس فٹ کی تھی۔ پرانی ہونے کے باعث اس میں تھوڑی دراڑیں تھیں۔ میں ان میں انگلیاں پھنساتا ہوا اوپر چڑھ گیا۔

اندر کا ماحول ویسا ہی تھا جو ڈیروں کا ہوتا ہے۔ ڈیرے کے صحن میں کئی چارپائیوں پر لوگ سوئے ہوئے تھے۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی جاگ رہا ہو۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ مویشی بیٹھے ہوئے تھے۔ برآمدے میں ایک چھوٹا بلب روشن تھا۔ وہاں چند چارپائیاں پڑی ہوئی تھیں، جن پر کچھ لوگ لیٹے ہوئے تھے، کچھ جاگ رہے تھے۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرا پاؤں کسی نے کھینچا ہو۔ میں نے فوراً اپنا پاؤں اوپر کیا تو ایک کتا میرے پاؤں کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ یہ تو شکر ہوا میرے لانگ بوٹ تھے جو میں عام طور پر پہنتا تھا، ورنہ وہ میرا پاؤں چیر دیتا۔ وہ ان کتوں میں سے تھا جو بھونکتے نہیں بلکہ سیدھا شکار کو دبوچتے ہیں۔ میں نے پاؤں کو جھٹکا تو وہ نیچے گر پڑا۔ تبھی وہ زوردار آواز میں بھونکا۔ وہاں کے مکین کتے کو جانتے تھے، وہ اسی لمحے یوں الرٹ ہوئے، جیسے انہیں کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس وقت تک میں کچے کمروں کی چھت پر جا چکا تھا۔

''کیا ہوا؟'' جہانگیر کی آواز میرے کان میں گونجی تو میں نے اسے صورتِ حال بتا دی۔ جو بلاشبہ سب نے سن لی تھی۔

''بندے کتنے ہیں؟'' شعیب نے پوچھا۔

''یہی کوئی پندرہ سے بیس ہوں گے۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''اپنا دھیان رکھنا، ہم آتے ہیں۔''

میرے کانوں میں ان کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ جبکہ نیچے کتا مسلسل بھونکے جارہا تھا۔ اگر مجھے کتے کی بھنک پہلے پڑ جاتی تو میں اسے گولی مار دیتا۔ کم از کم وہ میری نشاندہی تو نہ کر سکتا۔ وہ سب لوگ صحن میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی اسلحہ تھا۔ ان سب کو شک ہو گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی اوپر چھت پر ہے۔

''کون ہے اوپر، سامنے آ، ورنہ گولی مار دیں گے۔''

نیچے سے آواز آئی تو میں بالکل چھت کے ساتھ چپک گیا۔ وہ جتنی مرضی فائرنگ کر لیتے، یہاں سے مجھ پر۔ فائر نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ کوئی چھت پر آ کر فائر نہ کرتا۔ میرے چاروں ساتھی تیزی سے چار دیواری کی جانب بڑھ رہے تھے۔ بس چند لمحوں کا فاصلہ رہ گیا تھا، پھر یکے بعد دیگرے وہ دیواروں پر چڑھ آئے۔ تبھی میں نے اوپر سے یکے بعد دیگرے فائر کرنا شروع کر دیے۔ اس کے ساتھ ہی چاروں طرف سے فائر ہونے لگے۔ ایسا صرف آدھے منٹ کے لگ بھگ ہوا۔ لیکن صحن میں کہرام مچ گیا تھا۔ سامنے سے فائرنگ ہوئی تھی لیکن اس کے ساتھ ایسی چیخ و پکار ہوئی کہ صحن میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ سب برآمدے کی جانب بھاگے۔

بختاور ہمت کر کے صحن میں اتر آیا تھا۔ اس نے لکڑی کا پھاٹک کھول دیا۔ پھر اگلے ہی لمحے پھاٹک سے باہر کی جانب بھاگ گیا۔ برآمدے سے کئی فائر ہوئے تھے۔ صحن میں پڑے لوگ چیخ رہے تھے۔ ان کی آہ و بکا نے ماحول کو بے حد خوفناک بنا دیا تھا۔ اس قدر فائرنگ کی آواز سے مویشی بھی ڈکارنے لگے تھے، بکریاں خوف زدہ آواز میں منمنا رہی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا، دیوار پر کوئی سایہ لہرایا ہے، اس کے ساتھ ہی چمکیلی آنکھیں ابھریں اور معدوم ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا۔ وہ کتا دیوار پر چڑھ کر مجھ تک آ پہنچا تھا۔ میں نے کوئی وقت ضائع کیے بغیر اس پر فائر کر دیا، وہ کراہتا ہوا وہیں چھت پر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ وہ کتا وفاداری میں مر گیا تھا۔

''کون ہو تم لوگ......؟'' نیچے سے کسی نے پکارا مگر کوئی ایسا بے وقوف نہیں تھا کہ اسے جواب دیتا، وہ آواز کی سمت فوراً فائر کر سکتے تھے۔

جانب بڑھا۔ غیر ملکی گنز، پسٹل، بلٹس، دستی بم، راکٹ لانچر وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں بہن بھائی، کس طرح انسانی خون سے دولت بنانے کے چکر میں تھے۔

''یہی ہے یا کسی دوسری جگہ بھی......'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر بعد حیرت بھرے لہجے میں بولی، ''کیا یہ تھوڑا ہے؟''

''نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ مال اس نے گھر میں ہی رکھا ہوا تھا، کہیں دوسری جگہ ٹھکانا نہیں بنایا؟''

''یہ کون سا ان کا گھر تھا، ان کی آدھی سے زیادہ زندگی، شہر میں یا پھر دوسرے ملکوں میں گزری ہے۔ میرن شاہ نہ مرتا تو ایک دو برس بعد وہ بھی لندن میں ہوتا۔ پھر یہاں اس کے کارندے ہی ہوتے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا آؤ، اوپر چلیں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں یہ تنہائی تمہیں بُری لگتی ہے۔'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اوپر بھی تنہائی ہی ہے۔ وہاں بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں۔'' میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تو ایک ادا سے اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا اور اوپر چلی گئی۔

اماں سئین کے کمرے میں آکر میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ پلنگ پر نیم دراز ہوگئی۔ تبھی میں نے یونہی پوچھا۔

''یہ تم نے مجھے اسلحہ دکھایا، کہیں کوئی نوٹ نہیں پڑے اُن کے؟''

''پڑے ہوں گے۔ وہ میں نے ابھی دیکھے نہیں، اسلحے کی ضرورت تھی سو میں نے وہی دیکھا اور پھر تمہیں بتا دیا۔''

''تمہیں کیسے پتا مجھے اسلحے کی ضرورت ہے؟'' میں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا تو وہ سخت لہجے میں یوں بولی جیسے اس کے اندر کہیں کوئی نفرت پل رہی تھی۔

''کیونکہ اب میں بھی تمہارے ساتھ مل کر لڑنا چاہتی ہوں۔''

''میں تو اس لیے......'' میں نے کہنا چاہا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''چھوڑو، پھر کبھی بات کریں گے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ اٹھی۔ اس نے ایک صندوق کو دیکھا، اسے تالا لگا ہوا تھا، پھر دوسرے کو دیکھا اس پر بھی تالا تھا۔ وہ باہر گئی اور ہتھوڑا لے آئی، میں نے سبھی تالے توڑ دیے۔ ایک صندوق میں سے کافی ساری رقم ملی۔

''میرے خیال میں یہ کافی ہے۔'' ساوری کہتے ہوئے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

''کافی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں نے ابھی تلاشی نہیں لی، مزید بھی ملے گا کچھ نہ کچھ۔''

لفظ اس کے منہ ہی میں تھے کہ باہر سے شعیب کی آواز آئی۔ اس نے مجھے پکارا تھا۔ میں نے جواباً اسے بلایا تو چند لمحے بعد وہ آگیا۔ اس نے ساوری کو میرے پاس بیٹھے دیکھا تو پہلے جھجکا، پھر نروس ہوتا ہوا بولا۔

''تم دکھائی نہیں دیے تھے نا تو میں نے آواز دے دی کہ کہاں ہو تم۔ چلتا ہوں، تم لگاؤ گپ شپ۔''

''میں خود تمہارے پاس آنے والا تھا۔ ایک بہت بڑی خوشخبری ہے۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا......؟'' اس نے پوچھا تو میں نے سامنے الماری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسے کھولو اور نیچے جا کر دیکھو۔''

اس نے حیرت سے میری جانب دیکھا پھر الماری کھولی۔ میں اسے بتاتا رہا، وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو اس کے چہرے پر خوشگوار حیرت پھیلی ہوئی تھی۔

''مجھے یہی ڈر تھا کہ ہمارے پاس سب کچھ بہت تھوڑا ہے لیکن اب......''

''لڑکوں کو لگا کر اسلحہ بستی بہادر خان کے نوجوانوں کو دے دو۔ اپنی گاڑیاں بھر لو، اب جس کا جتنا دل چاہے ہمارے ساتھ کھیل لے۔'' میں نے کہا تو کوئی جواب دیے بغیر وہ کمرے سے نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ ساوری واپس بستی بہادر خان نہیں گئی تھی۔ بختاور خود اسلحہ لے کر گیا تھا۔ باقی سب جاگ گئے تھے اور وہ خوش تھے کہ انہیں اتنا اسلحہ مل گیا۔ تبھی جہانگیر نے کہا۔

''ساوری بہن، اس خوشی کے موقع پر چائے ہی پلا دو۔''

''بیٹھو، میں بناتی ہوں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہم ڈیرے پر جا رہے ہیں، وہیں بھیج دینا۔''

اس نے کہا اور سب ڈیرے پر چلے گئے۔ ساوری کچن میں چلی گئی۔ میں برآمدے میں بیٹھا رہا۔ وہیں بیٹھے اچانک مجھے

ایک خیال آیا۔ میں نے اس پر تھوڑا غور کیا تو مجھے لگا کہ اگر کوشش کی جائے تو شاید ایسا ہو جائے۔ میں نے سیل فون نکالا اور زمان موہل کو فون کر دیا۔ حال احوال کے بعد میں نے پوچھا۔

''کہاں ہو؟''

''اِدھر گھر میں پڑا ہوں۔'' وہ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔

''تمہیں ہوا کیا ہے، خیر تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں یار، کبھی جندوڈا سے یاری باشی تھی، اسے اب تک بھگت رہا ہوں۔ میں تو عذاب میں آ گیا ہوں۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں یاد ہے جن لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا، میں تو مر ہی گیا تھا اگر تم نے مجھے نہ بچایا ہوتا۔'' اس نے کہا۔

''ہاں مجھے یاد ہے۔'' میں نے کہا تو بولا۔

''تم نے پوچھا تھا، انہوں نے کیوں حملہ کیا تو میں نے کہا پھر بتاؤں گا۔''

''ہاں تم نے نہیں بتایا تھا۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''وہ اسی جندوڈا کی وجہ سے میرے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ ان حملہ آوروں کی ایک بہن تھی، جندوڈا اسے اٹھا کر لے گیا۔ بس پھر وہ ہم دونوں کی وجہ سے مر گئی تھی۔'' اس نے شرمندہ لہجے میں بتایا۔

''مطلب وہ تم دونوں کی بے غیرتی کی بھینٹ چڑھ گئی۔''

''بس ایسے ہی سمجھ لو۔'' اس نے پھر شرمندہ لہجے میں کہا۔

''اب کیا مسئلہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی، وہ دونوں مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ وہ میری بستی بھی آ گئے تھے۔ میں ان سے بچ نہیں پا رہا، میرا گھر سے نکلنا محال ہو گیا ہے۔ یہاں کسی کو بتاتا ہوں تو میری اپنی ذلالت ہے۔ کیا منہ دکھاؤں گا کسی کو۔ جندوڈا سے کہہ رہا ہوں، مجھے ان سے نجات دلواؤ، مگر وہ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہے، میری بات ہی نہیں سن رہا۔'' اس نے شرمندہ اور شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

''ہاں شاید، اب وہ تمہاری مدد نہیں کر پائے گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں، میں نے اسے سمجھایا بھی تھا کہ تمہارے سامنے مت آئے مگر وہ سمجھا ہی نہیں۔'' اس نے کہا۔

''کیا اس نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا؟'' میں نے پوچھا۔

''بتاتا رہتا ہے، لیکن فون پر اتنی بات نہیں ہوتی۔ ہماری ملاقات نہیں ہو پائی۔'' اس نے کہا۔ پھر فوراً ہی بولا، ''اچھا خیر تم بتاؤ، فون کس لیے کیا تھا۔''

''زمان، میں جانتا ہوں تم کتنے کھرے اور کام کے بندے ہو۔ کیا تم جندوڈا کو بچانا چاہو گے؟'' میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''یہ تو وہ جانتا ہے کہ وہ بچنا چاہتا ہے یا نہیں۔'' اس نے محتاط انداز میں کہا۔

''دیکھ، یہ میں آفر کر رہا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے بچنا چاہتا ہے تو وہ راجھستانی جو اس کے پاس آیا ہوا ہے وہ مجھے دے دے، یہ ڈیل سمجھو، اس کے عوض میں رقم بھی دے دوں گا۔''

''ایک منٹ...... تم پھر جندوڈا کو مارو گے تو نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''میری پہلے بھی اس کے ساتھ کیا دشمنی ہے۔ وہ تو خود پیروزاں کا باڈی گارڈ بنا ہوا ہے، وہ عورت، جو خود کسی کی نہیں۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''اگر تم اسے چھوڑ دو تو میں بات کر کے دیکھ لیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''ظاہر ہے وہ راستے میں نہیں آئے گا تو میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔'' میں نے اسے یقین دہانی کرواتے ہوئے کہا۔

''میں بات کر لیتا ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''میں جانتا ہوں وہ اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ سردار نور حیات کی پناہ میں ہے۔ ممکن ہے اسے یہ خمار بھی ہو، سمجھا دینا اُسے۔ میرے لیے وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے، میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''بات کر اور مجھے بتا، دونوں سکون سے رہیں گے۔'' میں نے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ میری بات میں چھپی ہوئی دھمکی وہ بخوبی سمجھ جائے گا۔ میں نے الوداعی بات کی اور کال ختم کر دی۔

ایسی ڈیل میں نے پہلی بار نہیں کی تھی۔ جرم کی اس دنیا میں ایسا چلتا رہتا ہے۔ مجرم کبھی کسی کا نہ دوست ہوتا ہے نہ دشمن، اسے محض اپنے فائدے سے غرض ہوتی ہے۔ باقی

معاملات میں جہاں ضد اور انا آڑے آجائے، وہاں حالات کچھ دوسرے ہوتے ہیں۔
ساوری چائے بنا کر لے آئی تھی۔ اس نے دو مگ میرے سامنے رکھے اور پھر اسی دروازے سے آواز دے کرٹرے انہیں تھما دی جس میں مگ رکھے ہوئے تھے۔ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گئی تو میں نے سپ لیتے ہوئے کہا۔
''کیا یہ سوچا جا سکتا تھا کہ دشمن کے گھر میں بیٹھ کر یوں عیاشی کی جائے۔''
''ایسا ہو گیا ہے نا؟'' اس نے ایک ادا سے پوچھا۔
''ہاں، ہو تو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا، چاچا سائیں کا فون آگیا۔ میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے پوچھا۔
''چاچا سائیں خیریت تو ہے نا۔''
''او ہاں یار خیریت ہی ہے۔ بستی کے نوجوان تیرے تحفے پر بہت خوش ہیں۔ ایک بار تو فائرنگ سے ساری بستی ہلا دی۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔
''ہاں ہتھیار چیک بھی تو کرنے تھے۔'' میں نے بات بنا دی۔
''یار میں نے فون اس لیے کیا ہے کہ وہ سردار نور حیات پنچایت لے کر آنا چاہتا ہے۔'' انہوں نے پریشان کن لہجے میں کہا۔
''تو لے آئے، تب اور بات تھی، اب دوسری بات ہے۔'' میں نے کہا۔
''ایسا کیا ہو گیا؟'' انہوں نے پوچھا۔
''سیدھی سی بات ہے، تب وہ سارے مل کر ہم سے اپنی بات منوانا چاہتے تھے۔ اب ہم اس پوزیشن میں ہیں کہ اپنی بات منوا سکیں۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا تو انہوں نے پوچھا۔
''تو پھر میں کہہ دوں، وہ آج شام ہی آنا چاہتے ہیں؟''
''ہاں کہہ دیں۔'' میں نے کہا تو انہوں نے کال ختم کر دی۔
میں نے ساوری کو بتایا تو اس نے کہا۔
''وہ لڑائی ختم کرنے کا کہیں گے، تم ختم کر دینا، باقی ہم دیکھ لیں گے۔''
''وہاں دیکھیں گے کیا بنتا ہے۔'' میں نے کہا اور چائے پینے لگا۔ مجھے اب زمان موہل کے فون کا انتظار تھا۔
☆☆☆
میں بستی بہادر خان کی طرف گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ والی سیٹ پر ساوری بیٹھی ہوئی تھی۔ بستی میں پنچایت سج گئی تھی۔ چاچا سائیں نے مجھے فوراً پہنچنے کا کہا تھا۔ میں جانتا کہ میں دشمن کی نگاہ میں ہوں گا۔ میرے اس تھوڑے سے سفر سے اندازہ ہو جائے گا کہ دشمن کی نیت کیا ہے۔ میں بستی کے قریب پہنچا تھا کہ زمان موہل کا فون آگیا۔
''ہاں بول، ہاں یا نا؟''
''بات تو ہاں میں ہے لیکن یہ سب ہوگا کیسے، وہ یہ پوچھ رہا ہے، اسے یقین نہیں آرہا کہ تم ایسا کہو گے۔'' وہ الجھتے ہوئے بولا۔
''تو اس کی ہاں پوچھ، باقی میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے کہا۔
''اس کی سمجھو ہاں ہی ہے۔'' زمان نے محتاط انداز میں کہا۔
''ایسے نہیں زمان، ابھی پنچایت ہونے والی ہے، اس میں بہت ساری باتیں ہوں گی۔ جندوڈا کی ہاں اور نا پر ہی میں بات کروں گا۔ اگلے دس منٹ میں مجھے بتا دے، اس کے بعد فون نہیں کرنا۔'' میں نے سختی سے کہا اور کال بند کر دی۔
بستی کے نوجوان میرے انتظار میں تھے۔ میں نے ایک نوجوان کو گاڑی دے دی۔ وہ ساوری کو گھر لے گیا۔ میں سیدھا گوپے میں چلا گیا۔
وہاں چند افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ سردار نور حیات، علاقے کے تین معزز لوگ، چاچا سائیں اور پولیس کا ایک اعلیٰ افسر بھی موجود تھا۔ میں سب کو سلام کر کے ایک موڑھے پر بیٹھ گیا۔ سردار نور حیات مسلسل میری جانب دیکھے چلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کو نظر انداز کر دیا۔ میں نے سب کی طرف دیکھا تو ایک شخص نے کہا۔
''لو جی سردار جی کریں بات شروع۔''
اس کے یوں کہنے پر سردار نور حیات نے کھنکھار کر جیسے گلا صاف کیا اور پھر بڑے نپے تلے انداز میں بولا۔
''میرے خیال میں لمبی چوڑی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں، عرض صرف یہ کرنی ہے کہ جب سے یہ نوجوان یہاں روہی میں آیا ہے، تب سے یہاں کا امن برباد ہو کر رہ گیا ہے۔ پہلے یہ آیا تو میرن شاہ کا قتل ہو گیا۔ وہاں پر موجود بہت سے لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نوجوان نے اسے قتل کیا۔ اس کے ایک دو دن بعد یہ غائب ہو گیا۔

میں خاموش رہا۔ اب یہ دوبارہ آ گیا ہے۔ اب سنا ہے کہ یہ نوجوان میرن شاہ کی بہن پیروزاں کو قتل کرنے کی کوشش میں ہے۔ یہاں تک کہ آج اس نے ان کے گھر اور ڈیرے پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اتنی دیدہ دلیری اور غنڈا گردی کیوں؟"

وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا تو کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ تبھی چاچا سائیں نے بڑے اعتماد اور متانت سے کہا۔

"یہ نوجوان تو آیا ہی انہی کے پاس تھا۔ اُن کا، اس سے کیا اختلاف ہوا، ہم نہیں جانتے۔ اس بے چارے نے تو ہمیں ان غنڈے بدمعاشوں سے بچایا ہے، جو ہمیں قتل کرنے آئے تھے۔"

"دیکھو جی، جرم کہاں نہیں ہوتے لیکن اس کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ پنچایت ہے، تھانہ کچہری ہے۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ ہتھیار اٹھا کر تباہی مچانا شروع کر دو۔" ایک دوسرے شخص نے سردار نور حیات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ تبھی اس افسر نے موڑھے پر پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا، ہم اس بحث میں نہیں پڑتے، یہ پچھلی باتیں کریں گے تو بات طول پکڑے گی۔ اس وقت جو کرنا ہے اس پر بات ہونی چاہیے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہاں امن ہو جائے۔ کوئی کسی کو کچھ نہ کہے۔ کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہو، یہی دو ٹوک بات ہے۔"

افسر نے اپنی بات کہہ دی تو سردار نور حیات نے میری طرف دیکھا اور رعب سے پوچھا۔ "ہاں بھئی نوجوان، کیا کہتے ہو تم؟"

"مجھے کچھ کہنا نہیں تم لوگوں سے پوچھنا ہے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"کیا پوچھنا ہے؟" سردار نور حیات نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا امن کی یہ ذمے داری صرف مجھ پر عائد ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تو اور کیا، جب سے تم یہاں آئے ہو، ایک فساد کھڑا ہو گیا ہے۔ کتنے لوگ مر گئے، اس میں تمہارا نہیں تو اور کس کا قصور ہے؟" سردار نے دبے دبے غصے سے کہا تو میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارا قصور ہے سردار۔ تم جو غنڈے، بدمعاشوں، قاتلوں، اشتہاریوں کے ساتھ ساتھ بارڈر پار کے ایجنٹوں کو پناہ دیتے ہو، ان کی پشت پناہی کرتے ہو، کیا اس سے امن ہونا ہے یا تمہارے کالے دھندے چلتے ہیں۔"

"بکواس کر رہے ہو تم، ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔" اس نے ہتھے سے اکھڑتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ہمنوا اونچی اونچی آواز میں بولنے لگے۔ میں سب کی خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ کہہ چکے تو میں نے کہا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو سردار، کیا ثبوت کی پٹاری کھولنا پڑے گی؟"

"یار چھوڑو اس بات کو، مدعے کی بات کرو۔" افسر نے تیزی سے کہا۔

"اصلی بات اگر امن قائم کرنا ہے تو بولو، کیا کرنا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو، تم نے میرن شاہ کا قتل کیا ہے؟" سردار نے تیزی سے کہا۔

"اس کے علاوہ ہر بندے کو خون معاف ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں معاف کیوں، جو مجرم ہوگا، اُسے پکڑا جائے گا؟" اس نے تیزی سے ہی جواب دیا تو میں ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

"تو سردار جی، پہلے خود کو قانون کے حوالے کرو، اسلحہ، منشیات اسمگل کرنے، ایجنٹوں کو پناہ دینے اور وہ قتل جس پر تم پکڑے نہیں گئے۔ آؤ ہم دونوں ہی خود کو قانون کے حوالے کرتے ہیں۔"

"یار جو ہو گیا، سو ہو گیا۔" افسر نے جھنجلاتے ہوئے کہا پھر لمحہ بھر رک کر بولا۔ "سردار صاحب، ہم سب جانتے ہیں کون کیا ہے۔ سیدھی بات کریں، آپ کیا چاہتے ہیں۔ کچھ ماننا پڑے گا تو کچھ منوانا ہوگا۔"

"چلو تم ہی کوئی فیصلہ کرو۔" سردار نور حیات نے کہا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ جس طمطراق سے آیا تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اپنی اس بے عزتی کا وہ بدلہ کیسے لے گا مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں خود چاہتا تھا کہ وہ میری طرف منہ کرے۔ تبھی افسر نے میری طرف رخ کر کے پوچھا۔

"تم بتاؤ یار، تم کیا چاہتے ہو؟"

"کوئی بھی کسی پر نہ حملہ نہ کرے۔" میں نے سکون سے کہا۔

"تم جو پیروزاں مائی کے قتل کا ارادہ لیے پھرتے ہو، وہ ختم ہے نا، اب اسے کچھ نہیں کہو گے؟" اس نے پوچھا۔

"اگر وہ روہی میں نہیں آتی تو میرا ارادہ ختم سمجھو۔"

میں نے کہا۔
''اس کی کیا ضمانت ہے؟'' سردار نے تیزی سے پوچھا۔
''اور اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ مجھ پر حملہ نہیں کرے گی یا کروائے گی یا روہی نہیں آئے گی؟'' میں نے پوچھا۔
''اس کی ضمانت میں دیتا ہوں۔'' سردار نے کہا۔
''تمہاری ضمانت قبول نہیں سردار، تم خود پارٹی ہو۔'' میں نے کہا۔
''تم کس پر مطمئن ہو گے؟'' افسر نے پوچھا۔
''اگر تم سب میرا اطمینان چاہتے ہو، اگر یہاں مستقل امن چاہتے ہو تو اس کا صرف ایک حل ہے میرے پاس۔'' میں نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''وہ کیا......؟'' افسر نے پوچھا۔
''پیروزاں اپنی یہاں روہی کی ساری جائداد سے دستبردار ہو جائے۔ نہ اس کا یہاں کچھ ہو گا، اور نہ وہ یہاں آئے گی۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا تو سب میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ لیکن میں جانتا تھا سردار نور حیات جتنا مرضی پیروزاں کا خیر خواہ ہو، اس کی راہ سے ایک بہت بڑا حریف صاف ہو رہا تھا۔ میری توقع کے مطابق وہ بولا۔
''اس کے عوض تم کیا ضمانت دو گے؟''
''میں خود کو قانون کے حوالے کر دوں گا۔'' میں نے اطمینان سے کہا تو سب نے میری طرف دیکھا، جیسے میں نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔
''ڈن ہو گیا؟'' افسر نے بھی حتمی انداز میں کہا۔
''لیکن یہ تو پوچھو، وہ دستبردار کیسے ہو گی؟'' ایک شخص نے پوچھا۔
''ہاں یہ بتاؤ۔'' افسر نے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔
''وہ اپنی ساری جائداد اپنی ہی نوکرانی ساوری کے نام کر دے گی۔'' یہ کہہ کر میں نے سب کا ردِعمل دیکھا، پھر سکون سے بولا۔ ''آپ جس دن یہ کاغذات لے کر آ جاؤ گے، میں اسی وقت آپ کے ساتھ چل دوں گا۔ چاہے ہتھکڑی لگانا یا نہ لگانا۔''
''میرا خیال ہے سردار صاحب، یہ فیصلہ معقول ہے۔ مان لینا چاہیے۔'' افسر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔
''میں پیروزاں مائی سے پوچھ لوں۔'' سردار نور حیات نے سوچتے ہوئے کہا تو میں نے افسر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔
''اگر وہ نہ مانی تو......؟''
''پھر میرا خیال ہے قانون کو حرکت میں آنا ہو گا، جو بھی اس کی زد میں آئے گا، وہ پکڑا جائے گا۔'' افسر نے حتمی لہجے میں کہا۔
''بالکل، میں بھی گرفتاری دے دوں گا، اگر وہ غنڈے، قاتل، ایجنٹ بھی گرفتار ہوں گے، ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی۔'' میں نے سخت انداز میں کہا تو سردار نور حیات نے میری طرف غور سے دیکھا۔
''ہاں یہ تو ہو گا۔ چاہے وہ کتنا ہی معزز کیوں نہ ہو......'' افسر نے کہا۔
''مزید کوئی بات؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں تم جا سکتے ہو۔'' اس نے متانت سے کہا تو میں اٹھ کر چاچا سائیں کے گھر کی طرف چل دیا۔
ساوری بے چینی سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے گوپے میں ہونے والی پنچایت کے بارے میں پوچھا تو میں نے سب بتا دیا، تب وہ حیرت سے بولی۔
''پیروزاں کی یہاں کون سی جائداد ہے، یہاں تو کسی کی بھی جائداد نہیں، سرکاری اراضی ہے، جس کا قبضہ ہو وہ اسی کی ملکیت۔ وہ تو فوراً ہاں کر دے گی، پہلے بھی اسے کون سا چاہیے تھا، وہ سب چھوڑ کر جا رہی ہے۔''
''مجھے سب معلوم ہے ساوری، میں صرف سردار نور حیات کو یہ جتانا چاہتا ہوں کہ اس کا بھی یہاں کچھ نہیں، میں جب چاہے اس سے چھین لوں، اس وقت میرا دشمن پیروزاں نہیں، نور حیات ہے۔ جو اپنے پروں کے نیچے میرے دشمن چھپائے بیٹھا ہے۔'' میں نے کہا تو ساوری مجھے دیکھتی رہ گئی پھر اُلجھے ہوئے انداز میں بولی۔
''مجھے اب بھی سمجھ میں نہیں آیا، وہ اگر ہاں کہہ دیتی ہے تو تم گرفتار......''
''یہی تو بات ہے، نہ جائداد کے کاغذ ہوں گے، نہ وہ اس سے کوئی مطالبہ کر سکتے ہیں۔ یہ سب کچھ تمہارا ہے ساوری، اب تم یہاں رہو۔'' میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا جہاں اُلجھن پھیلی ہوئی تھی۔
شام ڈھل رہی تھی جب ہم بستی چراغ شاہ کی طرف چل پڑے۔ اس بار ہمارے ساتھ کچھ نوجوان بھی تھے۔ شعیب اور جہانگیر سب کے لیے دنبے کی سجی بنا رہے تھے۔ سانول بھی ان کے پاس تھا۔
رات کا کھانا کھا کر میں چھت پر چلا گیا تھا۔ دن بھر

سب نے سیکیورٹی کے طور پر ہر شے کو دیکھا بھالا تھا۔ کسی بھی متوقع حملے کے لیے ہم سب پوری طرح تیار تھے۔ چھت پر ملگجا اندھیرا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ کچھ دیر بعد ساوری میرے پاس آگئی۔

''تم کیوں آگئی ہو، اتنا مشکل تو ہے یہاں چڑھنا۔''

''لکڑیوں کی سیڑھی ہے، تم آج چڑھے ہو، میں بچپن سے یہاں ہوں، سمجھے تم۔'' اس نے شوخی سے کہا۔

''یہاں کوئی منڈیر نہیں ہے، سمجھو کھلی فضائیں ہیں، یہاں محفوظ...... '' میں نے کہنا چاہا تو وہ میری بات کاٹتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

''میں تم سے ایک بات کرنے آئی ہوں۔''

''بولو، میں سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پیروزاں تو یہاں نہیں رہے گی، رحماں مائی وہاں بہاول پور میں رہے گی، اس کا کوئی نہیں ہے۔'' وہ دردمندی سے بولی۔

''تم ہونا اُس کی۔'' میں نے کہا۔

''میں تو ہوں، وہ بہت دکھی ہو رہی ہے، بس دن کاٹ رہی ہے، آج بھی پیروزاں نے اسے مارا ہے۔ وہ معمولی معمولی باتوں پر اپنا غصہ نوکروں پر نکالتی ہے۔'' ساوری نے دکھی لہجے میں کہا۔

''رحماں سے کہو یہاں آجائے، کوئی لے آتا ہے اُسے۔'' میں نے کہا تو اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ایک خیال ابھرا، میں نے چند لمحے سوچا اور پھر ساوری سے کہا۔ ''اسے کہو، چند دن محض چند دن وہاں رہے۔ وہ ہمیں پیروزاں کے بارے میں بتاتی رہے۔''

ساوری میری بات سمجھ گئی۔ اس نے فوراً کہا۔ ''میں تو پہلے ہی سے کہہ رہی ہوں کہ وہ میرے پاس آجائے، لیکن وہ نکلنا نہیں چاہ رہی تھی، ڈرتی تھی، اب اس کا خوف بہت حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب اسے پیروزاں کی پروا نہیں، اس تنہائی سے ڈر رہی ہے جو شہر میں رہ کر ہوگی۔ کون ہے وہاں اس کا؟''

''بس اسے یہی دلاسا دو کہ جیسے ہی پیروزاں یہاں سے چلی جائے گی، میں اسے لے آؤں گی۔ باقی تم سمجھ سکتی ہو کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔'' میں نے اسے کہا تو وہ دھیمے سے لہجے میں بولی۔

''میں سمجھ گئی۔''

''اچھا اب چلو نیچے، یہاں رہ کر میرا مذاق نہ بنوا دینا کہ جب سے ملے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ چونچ لڑائے بیٹھے ہیں۔'' میں نے اس کی ناک پکڑتے ہوئے کہا تو وہ اپنی ناک چھڑوائے بغیر بولی۔

''تم چاہتے ہو کہ میں چلی جاؤں؟''

''نہیں۔'' میں نے پیار سے کہا تو وہ میرے سینے سے لگ گئی۔

☆☆☆

رات کا پہلا پہر ختم ہو چکا تھا۔ میں اور شعیب جیپ میں ڈیرے کے چاروں طرف کا چکر لگا کر ڈیرے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ ہم کافی دیر سے پنچایت پر ہی بات کرتے.... آرہے تھے۔ اس کا بھی خیال تھا کہ پیروزاں سب کچھ دینے پر راضی ہو جائے گی۔ اس کے بعد سردار نور حیات یہی زور لگائے گا کہ مجھے گرفتار کر لیا جائے۔ ہم انہی باتوں میں مصروف تھے کہ زمان موہل کا فون آگیا۔

''ہاں بولو......'' میں نے کہا۔

''وہ مان گیا ہے۔'' اس نے دبے دبے جوش سے کہا۔

''ٹھیک ہے، کوئی شرائط؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر تم اس پر ہاتھ رکھو، اسے دوبارہ گرفتار نہ ہونے دو تو وہ سب کچھ کرنے کے لیے راضی ہے۔'' زمان موہل نے کہا۔

''زمان ایک بات پوچھوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بولو۔'' اس نے کہا۔

''وہ اتنی جلدی راضی کیسے ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سچ کہوں تو پنچایت کے بعد پولیس افسر سردار کے ساتھ ہی اس کے گھر گیا تھا۔ وہاں بڑی بحث ہوئی۔ افسر کا یہی کہنا تھا کہ وہ ان تینوں کے ساتھ جتنے بھی اشتہاری اس کے پاس ہیں دے دے۔ اس کی بھنک اس کے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا۔

''وہ ایجنٹ کو کس طرح میرے حوالے کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تم خود بتاؤ گے تا کہ دھوکے وغیرہ کا کوئی بھی رسک نہ رہے۔'' زمان موہل نے کہا تو چند لمحے سوچنے کے بعد میں بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

رات گہری ہو گئی تھی۔ میں، شعیب اور جہانگیر تینوں ایک ٹیلے پر کھڑے اندھیرے کا حصہ لگ رہے تھے۔ ہم

نے اپنی جیپ جھاڑیوں میں چھپا دی تھی۔ ہمارا تینوں کا ایک دوسرے سے رابطہ تھا۔ میرا دھیان اس طرف تھا جہاں سے میری توقع کے مطابق جندوڈا نے اس ایجنٹ کو لے کر آنا تھا۔ دیے گئے وقت میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔ میرے اندر بے چینی اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ اچانک جہانگیر کی آواز آئی۔

''وہ دیکھو، دائیں طرف۔''

میں نے اس جانب دیکھا تو ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بند تھیں لیکن نیچے دو چھوٹی لائٹس جل رہی تھیں۔ زمان موہل نے یہی نشانی بتائی تھی۔ میں تیار ہو گیا۔ بلاشبہ میرے دوسرے ساتھی بھی الرٹ ہو چکے تھے۔ اب ہم کو انہیں گھیرنا تھا۔ ہم تیزی سے نیچے اترے۔ جہانگیر جیپ لینے چلا گیا۔ ممکن ہے اگر کوئی بھاگتا تو اس کا پیچھا کیا جا سکے۔ میں اس راستے کے پاس آ کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا جبکہ شعیب دوسری طرف ایک جھاڑی میں چھپ گیا۔ جہاں سے ان کی جیپ نے گزرنا تھا۔ جیپ ہم سے چند گز کے فاصلے پر رہ گئی تھی۔ اندھیرا... ہونے کی وجہ سے اس کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے پسٹل کا سیفٹی کیچ اتارا اور تیار ہو گیا۔ وہ جیپ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر جیسے ہی سامنے آئی، میں نے اس کے اگلے ٹائروں پر فائر کر دیا۔ جیپ چند گز آگے گئی تو شعیب نے اس کے پچھلے ٹائروں میں فائر جھونک دیے۔ لمحوں کا وقفہ اس لیے رکھا کہ کوئی گولی ہمارے نہ لگ جائے۔ جیپ کے دونوں ٹائر پھٹ گئے۔ میں بھاگ کر جیپ کے آگے چلا گیا، جبکہ شعیب پیچھے ہی رہا۔ جیپ لڑکھڑاتے ہوئے رک گئی۔ اندر سے کوئی نہیں نکلا۔ تبھی پیچھے سے شعیب نے للکارتے ہوئے کہا۔

''اندر جو کوئی بھی ہے، باہر نکل آئے۔''

اس نے کہا ہی تھا کہ دو فائر جیپ میں سے ہوئے۔ انہوں نے آواز پر فائر کر دیا تھا۔ جیسے ہی فائر ہوئے، جواباً میں نے بھی فائر کر دیے۔ اسی دوران میں نے شعیب سے پوچھا۔

''تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا تو جہانگیر کی آواز آئی۔

''میں جیپ لے کر سامنے آ رہا ہوں۔''

یہ سنتے ہی میں اوٹ میں ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے سامنے سے جیپ آ گئی جس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ جہانگیر نے آتے ہوئے کئی فائر کر ڈالے۔ اس دوران میں نے اور شعیب نے بھی فائر کر دیے۔ جیسے ہی ہماری طرف سے فائرنگ کا وقفہ ہوا۔ ایک شخص اترا، اس نے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ وہ چیخ رہا تھا۔

''فائر مت کرنا...... فائر مت کرنا۔''

میں اس کی آواز پہچان گیا تھا۔ وہ جندوڈا تھا۔

''اور کتنے لوگ ہیں تیرے ساتھ......؟'' میں نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''ہم تین آدمی ہیں...... ہمیں مارنا مت......'' اس نے تیزی سے کہا۔

''ٹھیک ہے سب باہر آ جاؤ۔'' میں نے کہا اور اپنی جگہ چھوڑ کر ہٹ گیا۔

میرے کہنے کے دو منٹ بعد تک کوئی باہر نہیں نکلا۔ مجھے شک ہونے لگا۔ میں اس آپشن پر سوچنے لگا کہ سامنے سے کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ میں جانتا تھا کہ سامنے جو شخص ہے، وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ تبھی میری نگاہ جیپ کے تباہ ٹائر کے عقب میں پڑی۔ کوئی رینگ کر وہاں سے اتر رہا تھا۔ وہاں چونکہ ہلکی سی روشنی تھی اس لیے فوری طور پر پتا نہیں چل رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اس کی کوشش کی داد دی۔ میں نے شعیب کو اس رینگتے ہوئے شخص کے بارے میں بتایا، تبھی اس نے کہا۔

''جیسے ہی وہ باہر نکلے، اسے پکڑ لو۔ میں جیپ کے قریب جا رہا ہوں۔''

میں اس رینگتے ہوئے شخص کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب پوری طرح نکل چکا تھا۔ وہ رینگتا ہوا اندھیرے میں جا رہا تھا کہ میں نے چند گز کا فاصلہ انتہائی سرعت سے عبور کیا اور اس پر جا پڑا۔ وہ میری آمد کا احساس کر چکا تھا، وہ ریت پر لیٹا ہوا پلٹا اور پسٹل سیدھا کر لیا، تب تک میں اس پر جا پڑا تھا۔ اس نے فائر کر دیا تھا جو ہوا میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ میرے ایک ہاتھ میں پسٹل تھا، میں نے نال اس کے ماتھے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''بس، اب نہیں......'' یہ کہتے ہوئے میں نے اس کے ہاتھ سے پسٹل پکڑ لیا۔ اسی دوران میں شعیب جیپ کے نزدیک پہنچ کر اندر بیٹھے ہوئے شخص کو باہر نکال چکا تھا۔ اس کی آواز گونج رہی تھی۔

''چلو، اگر کوئی گڑبڑ کی نا تو......''

کچھ لمحوں بعد وہ اسے روشنی کے سامنے لے آیا۔ میں بگا راجھستانی کو پہچان گیا تھا۔ میں نے بھی نیچے پڑے

ہوئے شخص کو اٹھایا اور روشنی میں لے آیا۔ وہیں قریب ہی جندوڈا کھڑا تھا۔ ایسے میں جہانگیر بھاگتا ہوا آیا، اس نے باری باری دنوں کو باندھا اور انہیں گھسیٹ کر اپنی جیپ میں ڈالنے لگا۔

جندوڈا میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔ ''تم ہو جندوڈا......''

''ہاں، میں ہوں۔'' اس نے مختصراً کہا تو میں نے اپنی جیکٹ کی جیب سے بڑے نوٹوں کی دو گڈیاں نکالیں اور اس کی طرف بڑھا کر کہا۔

''چند دن کے لیے یہاں سے غائب ہو جاؤ۔ کوئی بھی رابطہ کرے تو یہی کہنا کہ تم بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے کہا اور سر جھکا کر ایک جانب اندھیرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا، اس لیے فوراً ہی وہاں سے پلٹا اور اپنی جیپ میں جا کر بیٹھ گیا۔ جہانگیر نے جیپ آگے بڑھا دی۔

ہم ڈیرے پر پہنچ گئے تھے۔ وہ دونوں بندھے ہوئے میرے سامنے کچے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے بکا راجھستانی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

''تم تو میرے خواہ مخواہ ہی دشمن بن گئے ہو، تمہارا باپ، وہ بھی مجھے مارنے کا خواہش مند تھا، پر سلام ہے اس راجھستانی عورت کو، جس نے اپنے اصول کی خاطر مجھے تمہارے باپ کو نہیں دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہارے اور تمہارے باپ کا قصور نہیں، تم دونوں کے جینیک میں کوئی مسئلہ ہے۔''

''ہم اگر دشمنی کرتے ہیں تو پوری کرتے ہیں۔'' اس نے کہا

''چل وقت ضائع نہ کر، اپنی آخری خواہش بتا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا

''میں اپنے دشمن کا یہ بھی احسان نہیں لینا چاہتا۔'' اس نے کہا تو میں مسکراتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے تم ہندی فلمیں زیادہ دیکھتے ہو۔ تمہارا ڈائیلاگ اچھا ہے، مگر مجھے اس میں کوئی حقیقت نہیں لگتی۔''

''تمہاری بھول ہے۔'' اس نے کہا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑا، اس کی ہتھیلی کو اپنے ہاتھ میں لیا اور پھر ایک جھٹکا دے دیا۔ اس کی انگلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ اس کے منہ سے چیخ بلند ہوئی۔ وہ تڑپ کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ وہ تکلیف برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کا دوسرا ہاتھ پکڑا۔ وہ چیخنے لگا۔

''نہیں، مجھے مت مارو......''

''اپنے باپ سے بات کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس حالت میں نہیں۔'' اس نے کہا۔ میں نے اس کی جیب سے اس کا سیل فون نکال لیا پھر اس کے سامنے بیٹھ کر پوچھا۔

''بتا تیرے باپ کا نمبر کیا ہے؟''

''چھوڑ دے۔ نہ کر......'' اس نے چیختے ہوئے کہا تو میں نے گھما کے ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔

''تمہیں کیا لگتا ہے میں وہ نمبر نہیں نکال پاؤں گا۔'' میں نے کہا اور نمبر دیکھنے لگا۔ ایک جگہ ''باپو'' لکھا ہوا تھا، وہ نمبر بھی بارڈر پار کا تھا۔ میں نے کال ملا دی۔ وہ میری جانب دیکھ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ مجھے سمجھ رہا تھا۔ کال مل گئی تھی۔ میں نے اسپیکر آن کر دیا۔

''بول...... ارے بولتا کیوں نہیں......'' اس کا باپ چیخ رہا تھا۔ بکا راجھستانی نے اپنی آواز دبالی تھی۔ تبھی میں نے کہا۔

''تمہارا بیٹا تم سے خود بات نہیں کرنا چاہتا۔''

''تم کون ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے اسے پکڑ لیا ہے، ابھی صرف اس کی انگلیاں توڑی ہیں، کچھ دیر میں گردن بھی توڑ دوں گا۔'' میں نے سفاک انداز میں کہا۔

''کون ہو تم......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''وہی جسے بختاور لے گیا تھا، جسے ایک تمہارے ہی علاقے کی عورت نے تمہیں نہیں دیا تھا۔'' میں نے اُسے یاد کراتے ہوئے کہا۔

''اوہ یہ تم ہو......'' اس نے مری ہوئی آواز میں کہا پھر تیزی سے بولا۔ ''ایک بار میرے بیٹے سے میری بات کروا دو۔''

''وہ سن رہا ہے۔'' میں نے کہا تو وہ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ تبھی بکا راجھستانی نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں، میں پکڑا گیا ہوں۔''

''تو دھیرج رکھ میں بات کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''کیا بات کرے گا تو......؟'' میں نے کہا۔

''اسے مارو مت، جو لینا ہے وہ لے لو، بولو کیا مانگتے ہو، میں وہ تمہیں دوں گا؟'' اس نے کہا۔

''چل پھر ایسا کر، اسی عورت کے پاس جا، جس نے میری حفاظت کی تھی، اس کی منت کر معافی مانگ اور اسے

اتنے روپے دے کر آ کہ وہ خوش ہو جائے۔ تیرا اور میرا معاہدہ صرف دو گھنٹے تک ہے، تب تک میں اسے ماروں گا نہیں۔'' میں نے ٹھہر ٹھہر کر اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''میں دو گھنٹے سے پہلے فون کرتا ہوں۔'' اس نے کہا تو میں نے فون بند کر دیا۔ بگا راجھستانی میری طرف یوں دیکھنے لگا جیسے میں نے کوئی انہونی بات کر دی ہو۔ اس کے چہرے پر کافی حد تک اطمینان پھیل گیا تھا۔ میں نے اسے لے جانے کا اشارہ کیا اور اس ایجنٹ کے پاس چلا گیا جو تھوڑے سے فاصلے پر بندھا پڑا تھا۔ میں اس کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں پوچھوں گا تمہارا نام کیا ہے، کوئی بھی ہو، رہو گے تو میرے دشمن ہی نا۔ ہاں اتنا ضرور پوچھوں گا، تمہیں مجھ سے کوئی ذاتی دشمنی ہے؟''

''نہیں، میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''تو پھر بارڈر پار کر کے، یہاں میری دشمنی میں کیوں آئے ہو؟'' میں نے سکون بھرے لہجے میں پوچھا تو وہ خاموش رہا۔ میں اس کے چہرے پر دیکھتا رہا، جہاں سختی آ گئی تھی۔ بلاشبہ وہ بہت کچھ سوچ رہا تھا، تبھی میں نے کہا۔

''تم کوئی ایسے تربیت یافتہ ایجنٹ نہیں ہو جو اکیلا ہی سو پر بھاری ہوتا ہے، تم تو راہ چلتی عورتوں کے پرس چھیننے والے غنڈے موالی کی طرح لگتے ہو۔ اس لیے زیادہ نخرے مت دکھاؤ، جو پوچھ رہا ہوں، وہ بتاؤ۔ خاموش رہو گے تو تمہارا انگ انگ بولنے لگے گا۔''

''تم جانتے ہو کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''وہی تو، وہی تو جاننا چاہتا ہوں۔'' میں نے سختی سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

''ہمیں پوجا نے یہاں بھیجا تھا؟''

''اوہ...... پوجا، کلیان جی والی، بہت پیچھا کیا اس نے تمہارے جیسے موالیوں کو یہاں بھیج کر۔'' میں نے حقارت سے کہا پھر اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ''چل، لگا فون اپنی پوجا کو ذرا میں بھی اس سے بات کرلوں۔''

میرے یوں کہنے پر اس نے اپنی جیب سے فون نکالا، نمبر پش کیے اور کال ملنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے فون اس سے لے لیا اور اسپیکر آن کر دیا۔ کچھ دیر بعد پوجا کی آواز گونجی۔

''ارے پوجا، کیسی ہے تو......'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''کون بات کر رہا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ارے اتنی جلدی بھول بھی گئی، ابھی چند دن پہلے تو مجھے تنہائی میں وقت دینے کو مچل رہی تھی۔ میں نے......'' میں کہہ رہا تھا کہ وہ حیرت سے بولی۔

''ویر سنگھ تم......؟''

''اتنی پریشان کیوں ہو پوجا جی؟'' میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''مطلب ہمارا دوسرا آدمی بھی تمہارے قبضے میں ہے۔'' اس نے یوں کہا جیسے وہاں بیٹھی تڑپ گئی ہو۔

''ہاں پہلے کو میں نے مار دیا تھا۔'' میں نے سکون

سے یوں کہا جیسے کوئی مکھی ماردی ہو۔ وہ غصے سے بولی۔
''میں جانتی ہوں، تم اسے بھی مار دو گے مگر یہ یاد رکھو میں......''
''چھوڑو مستقبل کی باتیں، سنو مجھے تم سے ایک شکوہ ہے۔''
''کیسا شکوہ......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''یہ تم نے کیا غنڈے موالی، تھرڈ کلاس قسم کے لوگ بھیجے ہیں، کوئی کام کا بندہ بھیجتیں، پتا چلتا کہ کلیان جی نے اپنا کوئی تربیت یافتہ بندہ بھیجا ہے یا پھر تم خود ہی آجاتیں، یہاں بڑی تنہائی ہے۔'' میں نے طنزیہ کہا۔
''بہت جلد میں تم تک پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے غصے میں کہا۔
''میں تمہارا انتظار کروں گا، تم یہاں مکمل تنہائی پاؤ گی۔'' میں نے اس کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا تو وہ دہاڑی۔
''بکواس بند کرو، اسے چھوڑ دو۔ میں سب بھول جاؤں گی۔''
''چلو چھوڑ دیا، لیکن میرے پاس آنا مت بھولنا۔'' میں نے کہا۔
''تم اس لیے وہاں بیٹھے بکواس کر رہے ہو کہ ہم نے تمہیں اہمیت نہیں دی۔ اگر ہمیں پتا ہوتا کہ تم اس قدر خطرناک ہو تو میں تمہیں گولی مار دیتی۔'' اس نے حقارت سے کہا۔
''تمہارا حُسن کیا گولی سے کم ہے پوجا، ہم تو گھائل ہو گئے۔ اب بتاؤ، کیا کرنا ہے اس کا، مار دوں، یا چھوڑ دوں۔'' میں نے پوچھا۔
''چھوڑ دو، اور بتاؤ اس کے عوض کیا چاہتے ہو؟'' اس نے میری بات سمجھتے ہوئے پوچھا تو میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔
''ظاہر ہے اس غنڈے موالی کے لیے تم راکیش ورما کو تو مارنے سے رہیں۔ ہمارے کچھ لوگ تمہاری طرف پھنسے ہوئے ہیں، انہیں بارڈر تک بھیج دو، میں اسے ہی نہیں کچھ دوسرے لوگ بھی بارڈر سے بھیج دوں گا۔ ورنہ، آج کے بعد میرا یہی فرض ہوگا کہ بارڈر سے اِدھر آیا ہوا ہر بندہ اُڑا دوں۔''
''کون سے لوگ پھنسے ہوئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔
''وہی جو اکیڈمی میں تھے۔ اپنے بڑوں سے بات کرو۔ صرف دو گھنٹے ہیں تمہارے پاس۔'' میں نے کہا۔
''میں ابھی تمہیں بتاتی ہوں۔'' اس نے کہا اور کال بند کر دی۔
میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو شعیب میری طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے بھیگے ہوئے لہجے میں کہا۔
''یار، تم دوسروں کا اتنا خیال رکھتے ہو، میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔''
''کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اسے گلے لگا لیا۔ پھر میں نے بختاور سے کہا۔ ''یار ان دونوں کو پانی پلاؤ، کچھ کھانے کو دو۔ یہ اگلے دو گھنٹوں تک ہمارے مہمان ہیں۔''
''ٹھیک ہے۔'' بختاور نے کہا اور اٹھ کر صراحی کی جانب بڑھ گیا۔
میں اٹھ کر رہائشی حصے میں آگیا۔ صحن میں کچھ نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ ساوری، اماں سئین کے کمرے میں تھی۔ وہ پلنگ پر بیٹھی جاگ رہی تھی۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ میں نے اسی پولیس افسر کا فون ملایا جو شام کے وقت پنچایت میں تھا۔ کچھ دیر بعد ہی اس نے کال ریسیو کر لی۔
''ہاں بولو علی......'' اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔
''وہی تین بندے جنہوں نے سردار نور حیات کے ہاں پناہ لی ہوئی تھی، جن کا ذکر شام کے وقت بھی ہوا تھا۔'' میں نے اسے بتایا۔
''ہاں، کیا ہوا؟'' اس نے تیزی سے پوچھا۔
''انہوں نے ہم پر حملہ کیا، ایک بھاگ گیا اور دو میرے قبضے میں ہیں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔
''رئیلی......'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''وہ میرے ڈیرے پر ہیں، آکر لے جا سکتے ہیں تو ٹھیک، ورنہ مجھے بتائیں میں انہیں گولی مار دوں، وہ دونوں بارڈر پار سے ہیں۔'' میں نے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔
''نہیں نہیں، انہیں کچھ نہ کہنا، میں پہنچتا ہوں۔ وہ ہمارے لیے بڑے قیمتی ہوں گے۔''
''بس پھر آجائیں۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔
میں نے ایک طویل سانس لی اور ساوری کے چہرے کو دیکھا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر یونہی دیکھتے رہنے کے بعد بولی۔
''اب پنچایت والی بات تو نہ رہی نا؟''
''نہیں، وہ اپنی جگہ موجود ہے۔ بات تو پیروزاں کی

ہوئی تھی۔'' میں نے کہا تو وہ دھیمے سے بولی۔

''پھر یہ کیوں......؟''

''ان کے ساتھ جو بھی ہو، ان کے بارے میں تو نور حیات مانا ہی نہیں تھا، یہی اس کی کمزوری تھی۔ لیکن انہیں چھوڑ دینے کا مطلب تھا کہ ایک خوف ہم پر مسلط رہتا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''تم نے جو کیا اچھا کیا مگر یہ یاد رکھنا، اب یہاں پر تمہارا سب سے بڑا دشمن سردار نور حیات ہی ہوگا۔ وہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکے گا کہ......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑا، پھر اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔

''تم کو پریشان نہیں ہونا، ایسے دشمن تو ہماری قسمت میں لکھ دیے گئے ہوئے ہیں نا، جہاں سانپ ہوگا، وہاں مارخور تو ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کی پریشان آنکھوں میں دیکھا پھر نرمی سے بولا۔ ''تم ایسا کرو، سکون سے سو جاؤ، تاکہ صبح مجھے پراٹھے بنا کر کھلاؤ۔ بہت عرصہ ہوگیا، مکھن والے پراٹھے نہیں کھائے، ساتھ میں لسی ہوگی نا۔''

اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔''

''میں کچھ دیر تمہارے پاس......''

''مجھے سونا ہے۔'' اس نے کہا اور پلنگ پر لیٹ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور اٹھ کر باہر چل دیا۔

میں ڈیرے پر آگیا تھا۔ ابھی ڈیڑھ گھنٹا بھی نہیں گزرا تھا کہ بگا راجستانی کا فون بج اٹھا، میں نے کال ریسیو کی تو میری توقع کے مطابق اسی کا باپ تھا۔

''ہاں لے بات کر اس سے......'' اس کے باپ نے کہا اور چند لمحوں بعد ایک خمار آلود نسوانی آواز ابھری، ''تم ٹھیک ہونا؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' اس کی آواز سنتے ہی میں جذباتی ہوگیا۔

''حیرت ہے تم نے مجھے یاد رکھا۔'' اس کے لہجے میں حیرانی چھلک رہی تھی۔ میں لمحہ بھر خاموش رہا پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

''میں احسان کرنے والوں کو اور دھوکا دینے والوں کو کبھی نہیں بھولتا۔ بول، تم سے اس نے معافی مانگی؟''

''ہاں معافی مانگ لی، روپے بھی دیے ہیں۔'' اس نے خوش ہوتے ہوئے بتایا۔

''تم خوش ہونا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میں خوش ہوں۔'' اس نے تیزی سے کہا۔

''چل، اب میں اس کے بیٹے کو چھوڑ دوں گا، بتا دے اُسے۔'' میں نے کہا تو اس نے فون واپس دیتے ہوئے یہ بات بھی کہہ دی۔ اگلے چند لمحوں بعد اس کے باپ سے بات کر کے میں نے فون بگا کو واپس کرتے ہوئے کہا۔

''چل، میں نے تمہیں چھوڑ دیا، ماروں گا نہیں۔''

وہ شرمندہ سا میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کمرے میں بند کر دینے کو کہا۔

مجھے گمان تھا کہ پوجا کا فون نہیں آئے گا۔ اگر آ بھی جاتا تو وہ جانیں اور وہ لوگ جانیں جن سے وہ متعلق تھے۔ ہم سب وہاں پر گپ شپ لگانے لگے۔ یہاں تک کہ صبح کی نیلگوں روشنی پھیل گئی۔ ایسے میں پولیس افسر کی کال آگئی۔

''ہم لوگ پہنچنے والے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ تک، وہ دونوں ہیں نا ادھر؟'' اس نے تصدیق کی۔

''ہاں موجود ہیں۔'' میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔

ڈیرے کے اردگرد بھاری پولیس فورس آگئی تھی۔ صرف میں وہاں کھڑا تھا، باقی سب رہائشی حصے میں تھے۔ وہ کسی بھی غیر متوقع حالات کے لیے تیار تھے۔ لیکن پولیس افسر نے اپنا وعدہ نبھایا، اس نے کسی کے بارے میں کوئی بات نہیں کی، ان دونوں کو اٹھایا اور اگلے پانچ منٹ میں وہ واپس پلٹ گئے۔ کچھ دیر بعد ہر طرف سکون چھا گیا۔

☆☆☆

اس وقت ساوری آٹا گوندھ رہی تھی۔ سانول نے دودھ کا بھرا ہوا کین لا کر رکھ دیا تھا۔ ساتھ میں بستی چراغ شاہ سے دو تین عورتیں بھی لے آیا تھا۔ گھر کا ایک ایسا ماحول بن چکا تھا، جیسے یہاں کبھی کوئی ایک فائر بھی نہ ہوا۔ نیلگوں روشنی ختم ہوگئی تھی۔ سورج نکل آیا تھا۔ میں صحن میں بچھی چارپائی پر فریش ہو کر بیٹھا ہوا تھا۔ ایسے میں میرا فون بج اٹھا۔ میں نے چوہدری آصف کا نمبر دیکھا تو مجھے لگا، جیسے اسے ساری خبر ہوگئی ہو۔ میں نے کال ریسیو کی تو اس نے بڑے خوشگوار موڈ میں کہا۔

''اچھا کیا تم نے پولیس کی مدد کی۔''

''کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا؟'' میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

''یہی تو کہہ رہا ہوں کہ اچھا کیا۔ پتا ہے اس کا اثر کیا ہوا ہے؟''

''کیسا اثر.....؟'' میں نے پوچھا۔

''نورحیات روہی سے بھاگ کر شہر آگیا ہے۔ کہنے کو تو وہ پیروزاں سے بات کرنے آیا ہے لیکن یہاں کچھ اور ہی چل رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا چل رہا ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھ علی، تم نے...... مجھے اغوا کیا، چاہے کسی کے کہنے پر مجھے چھوڑا لیکن چھوڑ دیا۔ تم چاہتے تو مجھے قتل کر سکتے تھے۔ ظاہر ہے میں نے تمہیں نقصان بھی تو پہنچایا تھا۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے انداز میں کہتا ہوا خاموش ہو گیا پھر لمحہ بھر بعد بولا۔ ''تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ میں تمہارے احسان کا بدلہ دے دوں۔''

''کہنا کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہیں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پیروزاں آج گیارہ بجے کے قریب یہاں سے فلائی کر جائے گی۔ شاید وہ پھر بھی ہاتھ نہ آئے۔'' اس نے کہا تو میرے اندر سنسنی پھیل گئی۔

''گیارہ بجے کی فلائٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، اکلوتا فوکر اسی وقت جاتا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''اوہ......'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''تمہارے پاس تقریباً چار گھنٹے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اگر تم اس دوران کچھ کر سکتے ہو تو کر لو۔'' اس نے وہ بات کہہ دی جس کے لیے اس نے فون کیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ میں بعد میں بات کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ میں تیزی سے کچن میں گیا۔ ساوری آٹا گوندھ چکی تھی۔ میں نے اسے بلایا تو پریشان سی اٹھ کر باہر آگئی۔ میں نے اسے فون کال کے بارے میں بتایا۔

''مجھے اندازہ تھا وہ ایسے ہی کرے گی۔'' وہ سوچتے ہوئے بولی۔

''تم فوراً رحماں مائی سے پوچھو، اس اطلاع کی تصدیق کرو، فوراً۔''

''ابھی کرتی ہوں۔'' اس نے کہا اور تیزی سے اماں سئیں والے کمرے کی طرف چلی گئی۔ میں نے بختاور کو فون کر دیا۔ اسے ساری صورت حال بتا کر کہا۔

''ہو سکتا ہے ہم ابھی نکلیں۔''

''لیکن ہم سب نہیں جا سکتے۔'' اس نے کہا۔

''جو بھی کرنا ہے، جس نے بھی جانا ہے، فوراً تیاری کرو، ہمیں ابھی نکلنا ہے۔'' میں نے تیزی سے کہا اور کال بند کر دی۔

میں ساوری کے پیچھے ہی اماں سئیں کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہ رحماں مائی کی... بات سن رہی تھی۔ وہ بات سن چکی تو فون بند کر کے بولی۔

''یہ اطلاع سچ ہے۔''

''وہ اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو رحماں کو بھی نہیں پتا۔'' اس نے کہا تو میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''چل کوئی بات نہیں، میں دیکھتا ہوں۔''

''کیا تم جا رہے ہو؟'' ساوری نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، میں ابھی نکل رہا ہوں۔'' میں نے اُسے بتایا۔

''تو پھر مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔'' اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ تم کیا کرو گی وہاں جا کر؟'' میں نے پوچھا۔

''یہاں رہی تو میرے لیے خطرہ ہے، وہاں تمہارے ساتھ ہوں گی تو......'' اس نے کہنا چاہا تو میں نے ٹوک دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ خواہ مخواہ بہانہ بنا رہی ہے۔

''ساوری یہاں تمہیں کیا خطرہ ہے؟ سب ہیں نا یہاں۔ وہاں جا کر تم کیا کر سکتی ہو؟''

''میں تمہارے ساتھ رہی تو رحماں مائی سے رابطہ رکھوں گی۔ اگر پیروزاں نکلی تو مجھے رحماں مائی کو اپنے ساتھ لانا ہے، میں اسے بہاول پور نہیں چھوڑ سکتی۔'' اس نے تیزی سے دلیل دی تو میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور اسے چلنے کو کہا۔

اگلے دس منٹ میں ہم بستی چراغ شاہ سے نکل چکے تھے۔ ہم دو گاڑیوں میں تھے۔ میرے ساتھ ساوری اور جہانگیر تھے، دوسری گاڑی میں بختاور، شعیب اور مدثر تھا۔ جہانگیر ممکن حد تک تیز رفتاری سے گاڑی بھگائے چلا جا رہا تھا۔ ہم تین گھنٹوں میں شہر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ بختاور ائرپورٹ کے پورے علاقے کو جانتا تھا۔ وہ ہمیں بستیوں کے درمیان سے نہر کنارے چلتے ایسے راستوں سے لے گیا، جہاں صرف ایک چیک پوسٹ ہمارے راستے میں آئی تھی۔ ہمارے پاس ایک ایک پسٹل تھا، جسے ہم نے بڑی خوبی سے چھپایا ہوا تھا۔ تھوڑی سی چیکنگ کے بعد ہمیں

جانے دیا گیا تھا۔

صحرا کے درمیان بنے ہوئے ویران ائرپورٹ کی پارکنگ میں ہم نے گاڑیاں کھڑی کیں اور ایک شیڈ کے نیچے آکر کھڑے ہوگئے۔ ظاہر ہے ہمیں کسی کا انتظار تھا۔ ہمیں وہاں آئے دس پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ پارکنگ میں صرف دو گاڑیاں آئی تھیں۔ ان میں پیروزاں نہیں تھی۔

''ممکن ہے وہ پہلے آچکی ہو اور بورڈنگ لے کے بیٹھ چکی ہو۔'' جہانگیر نے اپنا خیال ظاہر کیا تو ساوری نے تیزی سے کہا۔

''نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ ابھی تک ائرپورٹ تک نہیں پہنچی ہے۔''

''تمہیں اتنا یقین کیسے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے رحماں مائی سے کہا ہے کہ جیسے ہی پیروزاں ائرپورٹ جائے تو مجھے فون کردے، میں آکر اسے لے جاؤں گی۔'' ساوری نے بتایا۔

''ہوسکتا ہے وہ......'' میں کہنے ہی والا تھا کہ ساوری کا فون بج اٹھا۔ اس نے تیزی سے کال ریسیو کرلی۔

''ہاں بول رحماں......'' یہ کہہ کر وہ سننے لگی پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے تم سامان باندھ لو، میں ابھی آدھے گھنٹے میں تمہیں لے لیتی ہوں۔'' یہ کہتے ہی اس نے فون بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''وہ دس پندرہ منٹ پہلے نکلی ہے۔''

''اور راستہ آدھے گھنٹے کا ہے۔'' بختاور نے کہا۔

''بس پھر، مزید دس پندرہ منٹ انتظار کرو۔'' جہانگیر نے کہا۔

میں اور ساوری ایک طرف ہوکر کھڑے ہوگئے، یوں جیسے فوراً ہم پر نگاہ نہ پڑے۔ خوف زدہ بندے کی نفسیات یہ ہوتی ہے کہ وہ چاروں طرف سے چوکنا ہوتا ہے، اس کو پارکنگ کی طرف آنا ہی نہیں تھا۔ اسے گاڑی نے ائرپورٹ کی عمارت کے بالکل سامنے اتارنا تھا جہاں سے اسے اندر چلے جانا تھا۔ ہم پارکنگ میں اس لیے کھڑے تھے کہ فوراً گاڑی لے جاسکیں۔ بختاور کے ساتھ باقی لوگ اس طرح وہاں پھیل گئے تھے کہ جیسے ہی پیروزاں کی گاڑی وہاں آئے، وہ اپنی کارروائی کرڈالیں۔

ہم سب جانتے تھے کہ یہاں ہر طرف فورسز ہیں۔ اگر تھوڑا سا بھی کسی کو شک ہوگیا تو پھر ہمیں ہر طرف سے گھیرا جاسکتا تھا۔ میں نے ہر طرف کا جائزہ لے لیا تھا۔ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں دو تین آپشن پر غور کیا اور ساوری کو وہیں چھوڑ کر ائرپورٹ عمارت کے اندر چلا گیا۔ میں نے مدثر کو فون کر کے سمجھا دیا کہ کیا کروں تو اسے کیا کرنا ہے۔

میں اور بختاور اوٹ میں کھڑے بظاہر باتیں کررہے تھے لیکن ہماری نگاہ ہر آنے والی گاڑی پر تھی۔ تبھی ایک فور وھیل تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ جیسے ہی آکر رکی، بختاور نے ڈرائیور کو پہچانتے ہوئے بےساختہ کہا۔

''وہ آگئی۔''

ہم تیزی سے باہر کی جانب آئے۔ تب تک ڈرائیور اپنا دروازہ کھول کر نیچے اتر چکا تھا۔ یقیناً اسے سامان اتارنا تھا۔ جیسے ہی وہ مڑا، بختاور نے سامنے سے آکر انتہائی سرعت سے چھلانگ ماری اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تب تک میں نے پچھلا دروازہ کھولا۔ اندر پیروزاں پھٹی پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے پسٹل اس کے ماتھے پر رکھ دیا۔ ڈرائیور نے یہ سب دیکھ لیا تھا۔ تبھی بختاور نے اس پر پسٹل تانتے ہوئے کہا۔

''پیچھے بیٹھو، ورنہ ارد گرد سے گولی آکر تمہیں لگ سکتی ہے۔''

وہ سمجھدار تھا، وہ پیروزاں کے دوسری جانب آکر بیٹھ گیا۔ اس نے دروازہ بند بھی نہیں کیا تھا کہ بختاور نے فوروھیل آگے بڑھا دی۔

پیروزاں میرے ساتھ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کی آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ سب کو پتا چل گیا تھا کہ ہم پیروزاں کو قابو کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں۔ وہ بھی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ میں نے ایک ہی گاڑی دیکھی تھی۔ ممکن ہے دوسری گاڑی اس کے پیچھے آرہی ہو۔ بختاور نے ائرپورٹ کی حدود سے نکلنا تھا اس لیے رفتار نارمل کرلی، ایک ہی چیک پوسٹ تھی۔ وہ جانے والے کو اتنا زیادہ نہیں دیکھ رہے تھے۔ ہم بغیر چیک ہوئے وہاں سے نکل پڑے۔ ابھی تھوڑا دور ہی گئے تھے کہ پیروزاں کراہی۔

''علی......تم میری بات......''

''بول کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مم...... میں...... نے سارے...... کاغذ...... نور حیات...... کو دے دیے ہیں۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''ہمیں کاغذوں کا کیا کرنا ہے، جب تک سارا کچھ ساوری کے نام نہیں ہوجاتا۔'' میں نے بےپروائی سے کہا۔

''وہ...... اس نے وعدہ کیا تھا...... کہ سب کچھ...... نام کروا...... دے گا۔'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''تیرے دستخط جب تک نہیں ہوں گے، ایسا کیسے ممکن ہے میری جان۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وہ پاور آف اٹارنی......'' اس نے کہنا چاہا تو میں دہاڑتے ہوئے بولا۔

''بھاڑ میں گئی تیری اٹارنی، سن میری بات......'' میں نے کہا تو وہ میری جانب دہشت سے دیکھنے لگی۔ میں نے سکون سے کہا۔ ''بستی چراغ شاہ جاتے ہیں، وہاں بیٹھ کر بات کریں گے۔ اس دوران اگر تھوڑی بہت بھی تیری طرف سے بے غیرتی ہوئی تو میں اسی وقت تجھے ماردوں گا۔''

''یہ ڈرائیور کو بھی چیک کر اس کے پاس اسلحہ تو نہیں ہے۔'' بختاور نے میری توجہ ڈرائیور کی طرف کراتے ہوئے کہا۔

''ن......نہیں، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے اپنی صفائی دینے لگا تو میں نے بختاور سے کہا۔

''اگر اس ڈرائیور نے کچھ بھی کیا تو مرے گی پیروزاں ہی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا تو وہ مزید سہم گئی۔

''نہیں یار، اتارا سے، یہ خرابی کر سکتا ہے۔'' اس نے کہا اور فوروھیل روک دی۔ ہم اس وقت ویران صحرا سے گزر رہے تھے۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''اسے اتارو نہیں، اسے دیکھ لو۔'' میں نے صلاح دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اتارو۔'' اس نے نجانے کیوں ضد کرلی۔

وہ ڈرائیور نیچے اتر گیا۔ اتنے میں پیچھے والی گاڑی بھی پہنچ گئی۔ انہوں نے اسے سنبھال لیا، بختاور پھر سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور فوروھیل بھگادی۔ سامنے دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

''ہاں اب بولو، تم کس طرح مرنا پسند کرو گی؟'' میں نے پیروزاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو اس نے جھک کر میرے پاؤں پکڑ لیے، پھر روتے ہوئے بولی۔

''دیکھ، میں تیرا مقابلہ نہیں کر سکتی، میں اسی لیے باہر جانا چاہتی تھی۔ میرا سب کچھ لے لو، مجھے یہاں سے جانے دو۔''

''وہ ظلم، جو تو نے کیے، اس کا کیا ہوگا، میں تو معاف کردوں گا، لیکن وہ لوگ کیسے معاف کریں گے۔'' میں نے کہا تو وہ خاموش ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے بختاور کے بھائی کو مروایا تھا۔

وہ تمام راستے روتی رہی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی مجرم کو پھانسی کے تختے تک لے جایا جاتا ہے۔ وہ کراہتی رہی، روتی رہی۔ وہ جتنا بھی ایسا کچھ کررہی تھی، میری آنکھوں کے سامنے وہ بچپن میں دیکھے شعلے آرہے تھے۔ میری ماں ایک طرف پڑی ہوئی تھی، اس کی سانسیں ختم ہو چکی تھیں۔ اسی عورت نے اسے مارا تھا۔ اس کا جرم یہ تھا کہ میرن شاہ کی شکایت لے کر گئی تھی۔ شکایت یہ تھی کہ اس نے اس کی جواں سال بیٹی کو اپنے ڈیرے پر لے جاکر اس کا ریپ کردیا تھا۔ بجائے اس کی شکایت سننے کے، اسی پیروزاں نے میری ماں کو ڈنڈوں سے مار مار کر گھر سے بھگا دیا۔ میں نے اپنی بہن کا بدلہ تو لے لیا تھا، لیکن میری ماں کی لاش اب بھی مجھ سے سوال کرتی تھی کہ اس کا بدلہ میں نے اب تک کیوں نہیں لیا تھا۔

میں اپنے باپ کا احسان مند تھا کہ اس نے مجھے بھاگ جانے کو کہا تھا۔ وہ خود شعلوں میں جل رہا تھا، ہمارے گھر کو آگ لگادی گئی تھی۔ میں بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ میرے اندر اگر زمانے سے لڑنے کی ہمت آئی تھی تو ان شعلوں کی وجہ سے، اس بھڑکتی ہوئی آگ کو میں کبھی بھی نہیں بھلا پایا تھا۔ میں کچھ عرصہ تک رویا تھا۔ اسی زمانے نے مجھے اپنی ٹھوکر پر رکھا تھا، لیکن پھر میں نے آنسو پی لیے، انہی آنسوؤں کو میں نے اپنی طاقت بنا لیا۔ میں زمانے کے ساتھ لڑنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں تو ساری زندگی آگ میں جل کر یہاں تک پہنچ گیا تھا، کیا ہر کوئی اس طرح ان بے غیرت حکمرانوں سے بدلہ لے سکتا ہے؟ کیڑے مکوڑوں جیسی زندگی گزارنے والے لوگ خود قصوروار ہیں جن کی وجہ سے یہ ان کے حاکم بن جاتے ہیں۔

ایک دم سے بریک چرچرائے، میں چونک کر اپنے خیالوں سے باہر نکل آیا۔ دائیں طرف سے سڑک پر ایک گائے آگئی تھی۔ بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''دھیان سے بختاور......''

''تم بھی دھیان کرو، کہیں یہ تمہارا پسٹل ہی نہ چھین لے۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں سنبھل گیا۔

ہم بستی چراغ شاہ پہنچ گئے تھے۔ ڈیرے کے باہر لوگ اکٹھے ہوگئے تھے۔ چاچا سائیں کو بھی خبر ہوگئی تھی۔ وہ بھی ڈیرے پر پہنچ چکا تھا۔ بختاور نے ڈیرے کے اندر لے جاکر گاڑی کھڑی کردی۔ پیروزاں فوروھیل سے نیچے اتری تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ ایک چارپائی پر ڈھ گئی۔ وہ ہونقوں کے مانند ہر طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو۔ وہ کبھی میری طرف دیکھتی اور کبھی ڈیرے کی طرف۔

''تم وہ ڈائن ہو، جس نے میرے دو بھائی کھائے ہیں، جانتی ہو نا۔'' بختاور نے انتہائی غصے میں کہا۔ وہ خاموشی سے خالی خالی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اتنے میں دوسری گاڑی داخل ہوئی۔ اس میں سے مدثر، جہانگیر کے ساتھ ڈرائیور نکلا۔

''ساوری کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پچھلی گاڑی میں ہوگی۔'' جہانگیر نے یونہی کہا۔

''اور پچھلی گاڑی کہاں ہے؟'' میں نے تیزی سے پوچھا۔

''میں نے دیکھی تو نہیں۔'' جہانگیر نے کہا تو ایک دم سے بے چینی میرے اندر پھیل گئی۔ ساوری کو اتنی دیر کیوں ہوگئی؟ وہ کہاں گئی؟ اگر وہ رحماں مائی کو لینے گئی تھی تو اب تک واپس پہنچ جانا چاہیے تھا۔ میں نے تیزی سے فون نکالا، ساوری کے نمبر ملائے اور کال کر دی۔ دوسری طرف بیل گئی تو اس نے کال ریسیو کر لی۔

''کہاں ہو تم؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں بس تھوڑی دیر میں پہنچ جاؤں گی۔'' اس نے سکون سے کہا۔

''کہاں ہو تم؟'' میں دہاڑتے ہوئے بولا۔

''میں رحماں کو لینے چلی گئی تھی، وہ میرے ساتھ ہے، بس میں پہنچ رہی ہوں۔'' میں نے سنا تو انہی لمحات میں ایک دم سے میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔ اگرچہ میں پیروزاں کو اب کوئی موقع نہیں دینا چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھ کھیل تو سکتا تھا۔ تبھی میں نے افسوس ناک انداز میں بختاور کی طرف دیکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

''ساوری کو نور حیات کے لوگوں نے اغوا کر لیا ہے۔''

میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ چاچا سائیں نے یوں مجھے دیکھا جیسے میں نے کوئی انہونی کہہ دی ہو۔

''اوہ مجھ سے غلطی ہوگئی میں ساتھ نہیں گیا۔'' جہانگیر نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا تو بختاور نے پوچھا۔

''کیا کہتے ہیں؟''

''کہہ رہے ہیں کہ ساوری کو لے جانا ہے تو پیروزاں کو واپس کر دو۔''

''اوہ...... ساری محنت اکارت گئی۔'' بختاور نے بے بسی سے کہا تو پیروزاں اٹھی اور تن کر کھڑی ہوگئی۔ اس نے ہم سب کی طرف دیکھا اور حقارت بھرے لہجے میں بولی۔

''اگر تم مجھے مارو گے تو وہ ساوری کو مار دیں گے، ایسا ہی ہے نا؟''

''ہاں، وہ یہی کہہ رہے ہیں۔'' میں نے آہستگی سے کہا۔

''چلو پھر چھوڑ آؤ مجھے اُن کے پاس، تیری تو ساری محنت بے کار گئی۔'' اس نے اسی حقارت بھرے لہجے میں یوں کہا جیسے مجھے گالی دے رہی ہو۔

''بول علی، اب ساوری کو بچانا ہے یا اس پیروزاں کو ختم کرنا ہے؟'' بختاور نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ وہ فیصلے کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالنا چاہ رہا تھا۔ ظاہر ہے جس کے سامنے اس کے بھائیوں کی قاتل کھڑی ہو، اور اس سے بدلہ لینا بھی کوئی مشکل نہ ہو، جسے وہ سسکا سسکا کر مار بھی سکتا ہو، اس کی حالت کو میں سمجھ سکتا تھا۔ ساوری اس کے لیے ایک نوکرانی کی حیثیت رکھتی تھی۔ پیروزاں کے بدلے میں ایک نوکرانی کو قربان کر دینا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بختاور کے یوں پوچھنے پر، مجھ سے فیصلہ لینے پر میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ کم از کم خود غرض نہیں ہے۔ تبھی میں نے بے بسی سے کہا۔

''بختاور...... مجھے ساوری کو بچانا ہے۔''

میرے یوں کہنے پر اس نے لمحے میں فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''چل پھر، اسے دے کر ساوری کو لے آتے ہیں۔'' بختاور کے لہجے میں ایسی بے بسی تھی جیسے کوئی جیتی ہوئی بازی اچانک ہار جانے پر ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں لیکن میرے فیصلے کے آگے اس نے سر جھکا دیا تھا۔ اپنے بھائیوں کے قاتل کو چھوڑ رہا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب بختاور کی عزت میرے دل میں گھر کر گئی۔ ہمارے سامنے پیروزاں تنی کھڑی تھی۔ اس نے سب کی طرف فاتحانہ انداز میں دیکھا اور پھر چاچا سائیں کے سامنے آ کر ہتک آمیز لہجے میں بولی۔

''دوستی اپنے جیسوں کے ساتھ ہی اچھی لگتی ہے، سردار تو پھر سردار ہی ہوتے ہیں نا، دشمنی بھی اپنے برابر والوں کے ساتھ کی جاتی ہے۔ تم جیسے لوگوں کی دشمنی ہم جیسے سرداروں کے ساتھ بالکل نہیں جچتی۔ میں واپس آؤں گی، یاد رکھنا۔'' یہ کہہ کر اس نے ڈیرے پر موجود ہر شخص کو فاتحانہ انداز سے دیکھا اور بڑے کروفر سے فور وھیل میں بیٹھ گئی۔

میں دیکھ رہا تھا، پیروزاں نے کس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلا تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر بھی اس کے اندر سے خباثت نہیں گئی تھی۔

بختاور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، میں پیروزاں کے ساتھ بیٹھنے لگا تو اس نے کہا۔ ''آگے بیٹھ......''

''وہاں، میرا ایک دوست بیٹھے گا۔''

''نہیں، تیرے اور بختاور کے سوا کوئی نہیں جائے گا۔'' اس نے تنک کر کہا۔

''دیکھ پیروزاں یہ زیادتی ہے۔ وہاں زیادہ لوگ بھی ہوسکتے ہیں۔'' میں نے لجاجت سے کہا۔

''نہیں، صرف تم اور بختاور، باقی سب یہیں۔'' اس نے تحکمانہ انداز میں کہا تو میں آگے بیٹھ گیا۔ بختاور نے فور وہیل آگے بڑھالی۔ وہ تیزی سے چل پڑا۔ جیسے ہی ہم بستی سے ذرا دور ہوئے، پیروزاں نے اپنا سیل فون نکال لیا۔ میں نے بختاور سے فور وہیل روکنے کو کہا۔ اس نے فور وہیل روک دی۔ میں اتر کے پیچھے آیا اور اس کا سیل فون چھین لیا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''ابھی بتاتا ہوں۔'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں کہا تو وہ میری طرف دیکھتی رہ گئی۔ بختاور نے فور وہیل بڑھا دی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور ساوری کا نمبر ملا کر پوچھا۔

''کہاں ہو؟''

اس نے مجھے وہ جگہ بتائی جہاں وہ اس وقت تھی۔

''وہاں رک جاؤ، میں آرہا ہوں۔'' میں نے سکون سے کہا۔

میرے یوں کہنے پر پیروزاں بے تاب ہوگئی۔ اس نے گھبراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور سہمے ہوئے انداز میں بولی۔

''یہ تم کس سے بات کر رہے تھے؟''

''ساوری سے......'' میں نے سکون سے کہا تو بختاور نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت تھی۔

''وہ تو......'' پیروزاں بس اتنا ہی کہہ سکی پھر سیٹ.... پر یوں ڈھ گئی جیسے موت کو اپنے سامنے دیکھ لیا ہو۔ وہ مجھ سے مزید کچھ پوچھ نہ سکی۔ اگلے دس منٹ تک میں وہاں پہنچ گیا۔ شعیب گاڑی سے باہر نکل کر کھڑا ہوا تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی ساوری بھی گاڑی سے باہر آگئی۔ رحماں اندر ہی بیٹھی رہی تھی۔ پیروزاں انہیں یوں سامنے دیکھ کر حیرت سے پاگل ہوگئی تھی۔

''یہ کیا......؟'' اس کے منہ سے خوف زدہ انداز میں نکلا تو میں نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔

''سردار تو پھر سردار ہی ہوتے ہیں نا۔''

''چل باہر نکل۔'' بختاور نے یوں کہا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ اسے ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا۔ پیروزاں سیٹ پر پھیل گئی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا کہے۔ بختاور نے اسے بازو سے پکڑا اور کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا۔

ہر طرف ویرانہ تھا۔ دور دور تک صحرا پھیلا ہوا تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ بڑی چھوٹی جھاڑیاں دیوانہ وار ہلتے ہوئے ماحول کو مزید خوفناک بنا رہی تھیں۔ میرے، ساوری اور بختاور کے سامنے پیروزاں مجرموں کے مانند کھڑی تھی۔ میں چند لمحے اس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ مجھے اس پر ذرا بھی رحم نہیں آرہا تھا۔ تبھی میں نے کہا۔

''معافی مت مانگو پیروزاں،...... تم اپنی فطرت میں بہت غلیظ ہو، شاید میں تمہیں معاف کر دیتا مگر تم تو سردار ہو۔ سرداروں کی طرح مرو۔''

''میں کبھی تمہارے سامنے نہیں آؤں گی۔ میں روہی کو بھول جاؤں گی۔'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''اگر چند منٹ پہلے تم ایسی بات کرتیں، ذرا سا بھی رحم دکھاتیں تو شاید میں تمہیں عورت سمجھ کر معاف کر دیتا لیکن تم وہ سانپ ہو، جس کی فطرت میں بس ڈسنا ہی ہے۔ میں تمہیں ابھی موقع دوں تو تم مجھے مار دو۔''

''نہیں میں ایسا نہیں کروں گی...... بس آخری بار معاف کر دو۔'' اس نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔

''میں تمہیں وہاں ڈیرے پر بھی مار سکتا تھا۔ تا کہ بستی والے تمہیں مرتا ہوا دیکھیں، لیکن...... میں یہاں تمہیں اس لیے لے آیا ہوں کہ دنیا کی نگاہ میں تم واپس جا چکی ہو۔ تمہیں ساوری کے عوض چھوڑا گیا ہے۔ ہم پر تمہارا قتل نہیں پڑنے والا۔ یہاں پر تمہاری لاش صحرا کے جانور یوں کھا جائیں گے کہ تمہارا وجود ہی مٹ جائے گا۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے پسٹل سیدھا کر کے سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔ انہی لمحات میں ساوری نے اپنا ہاتھ میرے پسٹل پر رکھ دیا۔ میں نے وحشیانہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

حالات کی تند و تیز آندھیوں کی زد میں آجانے والے نوجوان کی سنسنی خیز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ پڑھیے
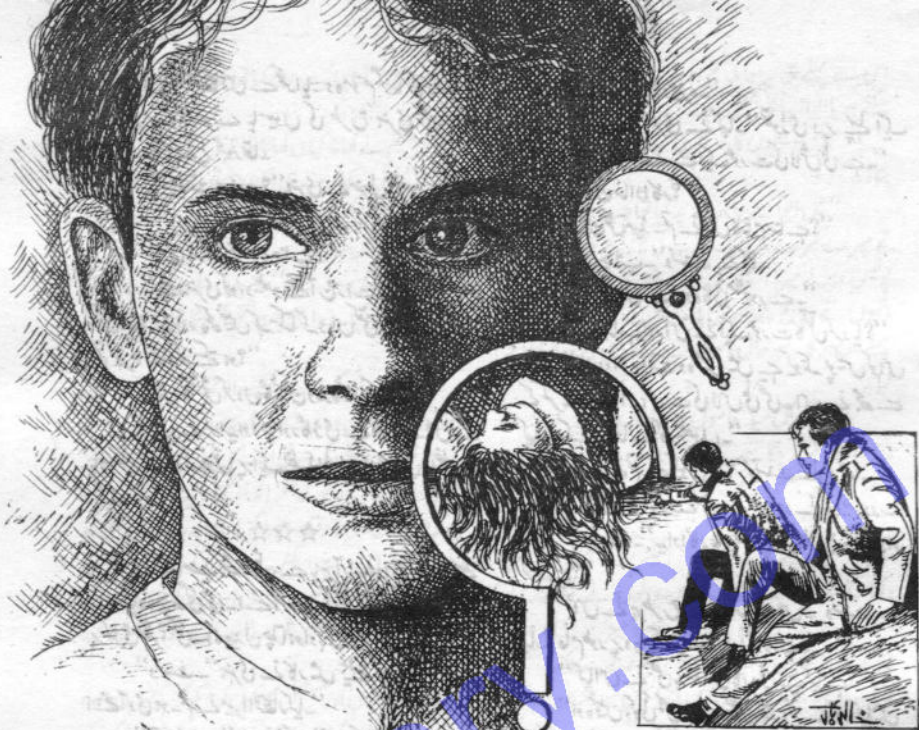
جھوٹ

جمال دستی

محبت کرنا آسان مگر اسے نبھانے کے لیے قربانیاں دینا پڑتی ہیں' بہت سے ایسی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں... جو آگے جاکر مسائل کو جنم دیتی ہیں... ایک مشہور اداکار کی زندگی جو رنگین تتلیوں سے آرزوئے وصل رکھتا تھا... اس کے الفت بھرے راستے میں اچانک خفت منتظر کھڑی تھی...

ایک ہی جست میں آسمان سے زمین پر آنے والے جفاپیشہ کا قصہ......

''کہاں جانا ہے سر؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

ہنری چونک گیا۔ اسے کبھی کسی ٹیکسی ڈرائیور نے سر، نہیں کہا تھا۔ ڈرائیور کے چہرے پر بچوں جیسی معصومت تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ونسنٹ، سر۔''

''ٹھیک ہے ونسنٹ۔ مجھے فیئر ہوٹل جانا ہے۔''

ڈرائیور نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اندرونِ شہر کی جانب روانہ ہوگیا۔ ہنری نے پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی کھولی

توگرم ہوا کا جھونکا اس سے ٹکرایا۔ وہ موسم گرما کی رات تھی اور شہر کے دوسرے باسیوں کی طرح ہنری بھی اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''کیا وقت ہوا ہے؟'' ہنری نے منزلِ مقصود پر پہنچ کر پوچھا۔

''ابھی بارہ بجے ہیں جناب۔''

''مجھے ہنری کہو، دیکھو مجھے آج رات کچھ اور جگہوں پر بھی جانا ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کتنی دیر لگے گی۔ کیا تم میرا انتظار کر سکتے ہو؟''

''میں کوشش کروں گا لیکن وعدہ نہیں کرتا۔''

ہنری نے کرایہ ادا کیا اور گاڑی سے اُتر گیا۔ اس نے باہر کھڑے ہو کر ہوٹل پر ایک نظر ڈالی اور لابی میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

وہ بیس منٹ بعد ہوٹل سے باہر آیا۔ ہوا میں تپش پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اسے ونسنٹ کی ٹیکسی لوکسٹ اسٹریٹ پر کھڑی نظر آ گئی۔ وہ پیدل چلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔

''ونسنٹ۔'' ہنری نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم اچھے آدمی ہو۔ تم نے میرا انتظار کیا۔''

''جی جناب۔'' اس نے کہا۔ ''اب کہاں جانا ہے؟''

''سچ تو یہ ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہے تم چلتے رہو۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر میں تم سے باتیں کروں۔ مجھے کچھ چیزیں معلوم کرنی ہیں۔''

''اگر ہم لوگوں سے باتیں نہ کریں تو ٹیکسی نہیں چلا سکتے۔''

''کیا تم نے کبھی کوئی قتل کیا ہے؟''

''نہیں جناب۔''

''اگر تمہیں قتل کرنا پڑتا تو کیسے کرتے؟''

''تم یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟''

''مجھے کسی نے کہا ہے کہ اسے قتل کے الزام سے بچاؤں۔''

''کیا تم سراغ رساں ہو؟''

''نہیں، میں پوکر کا کھلاڑی ہوں۔''

''پھر تم کیوں......؟''

''میری بات سنو ونسنٹ، تم کس طرح قتل کرتے اگر تم نے پہلے سے اپنا ذہن بنا لیا ہوتا؟''

ونسنٹ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں یہ قتل اس طرح کرتا کہ پکڑا نہ جاؤں اور یہ حادثہ نظر آئے مثلاً سیڑھیوں سے گرنا وغیرہ۔''

''بالکل۔'' ہنری نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے ایک مشہور ایکٹر کے کمرے سے ایک عورت کی لاش ملی ہے۔''

''کون سا اداکار؟''

''بین کل میڈ۔ تم نے اس کا نام سنا ہے؟''

''جی جناب۔'' ونسنٹ نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ کافی مشہور ہے۔''

''جی جناب اور اس نے ایک عورت کا قتل کر دیا؟''

''ہاں، اس وقت وہ جیل میں ہے کیونکہ پولیس کو اس کے کمرے سے اس عورت کی لاش ملی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ اس معاملے کو دیکھوں۔''

''اس نے تم سے کیوں کہا؟'' ونسنٹ نے پوچھا۔

''تمہیں اس بارے میں حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ہنری بولا۔ ''یہ اداکار عام طور پر کس طرح کے کردار کرتا ہے؟''

''اس نے ہر طرح کے کردار کیے ہیں۔'' ونسنٹ نے کہا۔ ''عام طور پر وہ مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔''

''کیا اس نے کبھی بدمعاش کا رول پلے کیا ہے؟''

''اوہ نہیں، کوئی بھی اس پر یقین نہیں کرے گا۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس نے تم سے کیسے رابطہ کیا؟''

''گرفتار ہونے سے کچھ دیر پہلے وہ ایک لڑکی کے ساتھ ڈنر کر رہا تھا جو میری بھی دوست ہے۔ صرف دوست۔ تم کچھ اور مت سمجھنا۔ اسی نے مجھ سے کہا کہ ایکٹر کی مدد کروں۔''

☆☆☆

اس شام ہنری جیل میں کل میڈ سے ملاقات کر چکا تھا۔

''مجھے ایوا نے بھیجا ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''میرا نام ہنری ہے۔''

''تم دیکھنے میں ہی کافی ہوشیار لگتے ہو۔'' اداکار نے کہا۔

''کیا تم فلموں میں کام کرتے ہو؟'' ہنری نے پوچھا۔

''ہاں، میرا نام بین کل میڈ ہے۔ تم نے مجھے دیکھا ہوگا۔''

''شاید پوسٹروں میں دیکھا ہو۔'' ہنری نے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچے؟''

''گزشتہ شب جب میں اپنے ہوٹل واپس آیا تو میرے کمرے میں ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ کیا تم نے اس بارے میں ریڈیو پر کچھ سنا؟''

''نہیں۔'' ہنری نے کہا۔

''کل صبح یہ خبر اخبارات کے پہلے صفحے پر شائع ہوگی اور میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن میں چاہتا ہوں کہ

اس سے پہلے ہی یہ معاملہ ختم ہو جائے اور شاید تم میری مدد کر سکتے ہو یا ایوا ایسا ہی سمجھتی ہے۔''

''میں دیکھوں گا۔'' ہنری نے کہا۔ ''مجھے پوری بات بتاؤ۔''

''میں ایوا کے ساتھ ڈنر پر گیا تھا جب ہوٹل واپس آیا تو میرے کمرے میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی اور پولیس والے میرا انتظار کر رہے تھے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ انہوں نے وہاں کچھ شور شرابا سنا لیکن وہ میرے پہنچنے سے پہلے ہوا ہوگا۔ بہر حال انہوں نے مجھے اسی وقت گرفتار کر لیا۔''

یہ کہہ کر کل میڈ خاموش ہو گیا اور ہنری یہ سمجھا کہ وہ اپنی بات ختم کر چکا ہے۔ ''ایک بات اور۔'' ایکٹر نے کہا۔ ''میرے کف لنکس غائب ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''میرے کف لنکس۔'' ایکٹر نے اپنی کلائیاں دکھاتے ہوئے کہا۔ ''جب پولیس والوں نے مجھے پکڑا تو انہوں نے میرا والٹ لینے کے علاوہ میز پر پڑی ہوئی چیزیں بھی اٹھا لیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ میرے کف لنکس غائب ہیں۔ میں نے انہیں نہیں بتایا لیکن میرا خیال ہے کہ کوئی مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے اور کوئی بات؟''

''نہیں۔''

ہنری نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بھی ہنری کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں ایک وکیل کی ضرورت ہے۔''

''ایوا نے کہا تھا کہ تم میری مدد کرو گے۔''

''میں ایسے شخص کی مدد نہیں کر سکتا جو خود اپنی مدد نہ کر سکے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''تم نے مجھے جو کچھ بتایا اس میں کچھ جھوٹ بھی شامل ہے۔''

''میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

''میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔'' ہنری نے کہا۔ ''تم احمق ہو یا مایوس یا پھر دونوں۔''

''بہت عمدہ، تم نے اچھا پتا کھیلا ہے۔'' ایکٹر نے کہا۔ ''تم کیا جاننا چاہتے ہو؟''

ہنری نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ اب بھی جا سکتا تھا لیکن اس نے ایوا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایکٹر کی بات سنے گا۔

''تم نے کھانا کہاں کھایا تھا؟''

''ہوٹل کے قریب ہی ایک ریستوران میں۔''

''وہ لاش کس عورت کی تھی؟''

''میں نہیں جانتا۔''

''تم نہیں جانتے؟'' ہنری نے اس کے الفاظ دہرائے اور مڑ گیا۔ وہ اپنی بات ختم کر چکا تھا۔ ''اوکے، گڈ لک۔''

وہ سیکیورٹی گیٹ سے نکلنے والا تھا کہ ایکٹر نے پیچھے سے آواز لگائی لیکن وہ بہت دور جا چکا تھا۔

جیل سے نکل کر ہنری ایک میل پیدل چل کر دریا پر پہنچا جہاں ڈچز ریور بوٹ لنگر انداز تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ یہاں اس کا وقت اچھا گزر جاتا اور کچھ کمائی بھی ہو جاتی تھی گو کہ اس رات ایکٹر سے ملنے کے بعد اس کا ذہن پراگندہ ہو چکا تھا۔ تاہم وہ جھوٹوں اور بے وقوفوں کی بات پر دھیان نہیں دیتا تھا لیکن کل میڈ جیسا بے وقوف خطرناک لگ رہا تھا۔

وہ راستوں اور مستقل گاہکوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتا ہوا بار کی جانب بڑھ گیا اور اپنے پسندیدہ بارٹینڈر پیٹرک کو ایکٹر کی کہانی سنائی۔

''لگتا ہے کہ وہ اپنے میلے کپڑے دھونے کا عادی ہے۔'' پیٹرک نے تبصرہ کیا۔

''اور مجھے یقین ہے کہ اب اسٹوڈیو کا کوئی شخص ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے لیکن ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

''ایوا نے تم سے اس کی مدد کرنے کے لیے کیوں کہا؟''

''بالکل۔'' ہنری بولا۔ ''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے؟''

''میں عورتوں کی نیت کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔''

''یہ بہت اچھی بات ہے۔'' ایک زنانہ آواز سنائی دی۔

ہنری نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے عقب میں ایوا کھڑی تھی۔ اس نے ایوننگ گاؤن پہن رکھا تھا اور پورے میک اپ میں تھی جس سے لگتا تھا کہ اس وقت بھی وہ اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔ وہ سینٹ لوئیس اور گرد و نواح میں گھوم پھر کر مختلف طریقوں سے لوگوں سے

رقوم نکلوالیتی اور ڈچز بوٹ کا جواخانہ اس کا ٹھکانا تھا۔
''ایوا۔'' ہنری نے کہا۔ ''میں ابھی تمہاری ہی بات کرر ہا تھا۔''
''کیا تم میرے ایکٹر دوست کی مدد کرو گے؟''
''کیا وہ تمہارا دوست ہے؟''
''یعنی تم اس کی مدد نہیں کرر ہے؟''
''میں نے ابھی اندازہ لگایا ہے۔'' ہنری نے کہا۔
''تم اس لیے پریشان ہو کہ اس پر قتل کا الزام نہ آجائے۔''
''لگتا ہے کہ وہ شخص کسی نہ کسی حوالے سے قصوروار ہے۔''
''ہاں ایوا نے کہا۔'' پہلی بات یہ کہ اس نے اپنی بیوی سے بے وفائی کی اور دوسرے یہ کہ اس نے اپنی ایک دوست سے کچھ رقم ادھار لی جو ابھی تک واپس نہیں کی لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ اس نے قتل نہیں کیا۔''
''مقتولہ کون تھی؟''
''مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کا تعلق بھی فلم بزنس سے تھا۔''
''کوئی اداکارہ؟''
''ممکن ہے۔''
''ٹھیک ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''مجھے سچ بتاؤ کہ تم اس کی وجہ سے کتنی مشکل میں ہو؟''
''میں اس جھنجٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔'' ایوا نے کہا۔ ''لیکن میری زندگی اور زیادہ آسان ہو جائے گی اگر کوئی دوسرا شخص اس معاملے کو دیکھے۔ پولیس والے ان سب لوگوں سے پوچھ گچھ کریں گے جن کا اس شخص سے کوئی تعلق ہے۔''
''میں آج رات دیکھوں گا کہ کیا کر سکتا ہوں۔'' ہنری نے کہا۔
''شکریہ۔'' ایوا بولی۔ ''کیا میں اسے بتا دوں کہ تم اس معاملے کو دیکھ رہے ہو؟''
''نہیں، میں اس کے لیے رات کی نیند خراب کروں گا۔ وہ بھی یہ کر سکتا ہے۔''

☆☆☆

ہنری کو ایوا سے معلوم ہوا تھا کہ مقتولہ کی لاش مے فیئر ہوٹل میں کل میڈ کے کمرے سے ملی ہے لہٰذا وہ ونسنٹ کی ٹیکسی میں وہاں گیا۔ واپس ٹیکسی میں آنے کے بعد اسے جو کچھ معلوم ہوا تھا، وہ اس نے ونسنٹ کو بتا دیا۔
''ایسا لگتا ہے کہ کل میڈ شام چھ بجے ڈنر پر گیا اور جب وہ نو بجے کے قریب ہوٹل واپس آیا تو اس کے کمرے میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے وہاں پہنچتے ہی پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ میں نے ہوٹل کے دو ملازمین سے بات کی اور ان سے کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ ایک نے میڈ کی تصدیق کی کہ جب وہ ہوٹل سے باہر گیا تو کمرا خالی تھا۔ جب واپس آیا تو وہاں بدقسمت عورت کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ مجھے ایوا نے یہ نہیں بتایا کہ وہ ایک اداکارہ تھی جس کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایکٹر سے محبت کرتی تھی۔ اس کا نام لیلا ہیڈوس ہے۔''
''لیلا ہیڈوس؟'' ونسنٹ نے کہا۔
''تم اسے جانتے ہو؟''
''ہاں وہ ابھرتی ہوئی اداکارہ تھی گو کہ اتنی مقبول نہیں تھی لیکن اس کی شہرت میں اضافہ ہو رہا تھا۔''
''کیا اس نے کبھی کل میڈ کے ساتھ کسی فلم میں کام کیا تھا؟''
''ہاں دو فلموں میں۔''
''اور وہ یہ ظاہر کرر ہا ہے کہ وہ اس عورت کو نہیں جانتا۔''
''ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا؟''
''میں نہیں سمجھتا کہ وہ کسی سین میں ایک ساتھ آئے ہوں۔''
''کیا فلم میں کام کرنے والے اداکار سیٹ پر ایک دوسرے کو نہیں جانتے۔ خاص طور پر ابھرتی ہوئی خوب صورت اداکاراؤں کو کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں؟''
''ضروری نہیں۔'' ونسنٹ نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ بڑے اداکار اپنے محدود حلقے میں رہنا پسند کرتے ہیں۔''
''ٹھیک ہے ہم اس پر بعد میں سوچیں گے۔ فی الحال تم ففتھ وارڈ پولیس اسٹیشن چلو۔''

☆☆☆

''ہم پہنچ گئے۔'' ونسنٹ نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے کہا۔
''کیا تم دوبارہ انتظار کر سکتے ہو؟''
''جی جناب۔''
ہنری ٹیکسی سے اترتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچا رہا تھا۔
''کیا ہوا؟'' ونسنٹ نے پوچھا۔
''پولیس اسٹیشن دیکھ کر مجھے گھبراہٹ ہونے لگتی

ہے۔“

”پھر کیوں جارہے ہو؟“

”کیونکہ مجھے یہاں ایک جاننے والے سے ملنے کی اُمید ہے۔“ ہنری نے کہا۔ ”میں ایک منٹ میں واپس آتا ہوں۔“

ہنری کار سے اُتر کر پولیس اسٹیشن میں چلا گیا جہاں استقبالیہ ڈیسک پر ایک کرخت چہرے والی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ”میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں؟“ اس نے روکھے لہجے میں کہا۔

”کیا آفیسر پیٹ موجود ہے؟“

”تم آفیسر ٹسبی کو پوچھ رہے ہو؟“

”ہاں۔“

”تمہارا نام؟“

”ہنری فریڈرک۔“

”ایک منٹ۔“ اس نے کہا اور عقبی کمرے میں چلی گئی۔ ٹھیک ایک منٹ بعد پیٹ ٹسبی باہر آیا۔ ہنری اسے دیکھ کر کھڑا ہوگیا اور اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟“

”کیا ہم کہیں بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں، آؤ میرے ساتھ۔“

وہ اسے ایک خالی کمرے میں لے گیا جہاں ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ ”ہاں، اب کہو کیا بات ہے؟“ آفیسر نے کہا۔

”کیا تم مے فیئر ہوٹل میں ہونے والے قتل کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟“

آفیسر کا منہ بن گیا۔ ”معاف کرنا، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔“

”تم غلط سمجھے، میں کسی کارروائی کے لیے نہیں کہہ رہا، مجھے کچھ معلومات چاہئیں جو کل صبح کسی اخبار میں شائع نہیں ہوں گی لیکن مجھے یہ جلد از جلد درکار ہیں۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ مجھ سے اس معاملے کو دیکھنے کے لیے کہا گیا ہے۔“

”وہ کون ہے؟“

”ایک مشہور شخصیت جو اس وقت جیل میں ہے۔“

”میں اسی لیے اس معاملے سے الگ ہوگیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”کوئی ایکٹر یا بدمعاش مجھ سے طرف داری کے لیے نہیں کہہ سکتا۔“ آفیسر نے کہا۔

”تم جیسے لوگ تنے ہوئے رسے پر چلنا پسند کرتے ہیں۔ تم پولیس اسٹیشن آئے ہو جبکہ تم نے کچھ نہیں کیا لیکن تم سے کسی نے طرف داری کرنے کے لیے کہا اور یہی تمہاری روزی روٹی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم یہاں صرف معلومات حاصل کرنے نہیں آئے تم دیکھنا چاہتے تھے کہ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں۔“

ہنری خاموش رہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ آفیسر نے کہا۔ ”میرے علم میں جو کچھ ہے۔ وہ تمہیں بتا رہا ہوں۔ کسی نے ہوٹل سے فون کرکے پولیس کو بتایا کہ انہوں نے کچھ شور سنا ہے اور کل میڈ کے کمرے سے ایک عورت کی لاش ملی ہے جس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ پولیس ہوٹل پہنچ کر اس کی واپسی کا انتظار کرنے لگی جو کسی دوسری عورت کے ساتھ ڈنر پر گیا ہوا تھا۔“

”کیا انہیں کمرے سے کوئی سراغ ملا؟“

”تمہارا مطلب ہے ثبوت؟“ آفیسر بولا۔ ”جب پولیس نے اسے گرفتار کیا تو اس کے پاس ایک چھوٹا آئینہ تھا جسے اس نے فینسی جیبی رومال میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ عورتوں کے استعمال میں آنے والا آئینہ تھا۔ پولیس والوں نے سوچا کہ شاید یہ مقتولہ کا ہوگا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اس کا نہیں ہے۔ اس کے پاس اپنا شیشہ تھا۔“

”فینسی جیبی رومال سے تمہاری کیا مراد ہے؟“

”بظاہر لگتا ہے کہ ایکٹر کو عمدہ چیزیں پسند ہیں۔“ آفیسر نے کہا۔ ”وہ اپنی سب چیزوں پر مختصر دستخط کرتا ہے جیسے رومال، موزے اور ٹائیاں وغیرہ۔ پولیس کو یہ تمام اشیا اس کے کمرے سے ملیں۔“

”اس نے آئینے کے بارے میں کیا کہا؟“

”اس کا کہنا تھا کہ اسے یاد نہیں یہ کہاں سے آیا۔“ آفیسر کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”اس شخص کی بیوی اور ایک گرل فرینڈ ہے۔ اس کے علاوہ وہ دوسری عورت کے ساتھ ڈنر پر جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سچ بول رہا ہو۔“

پندرہ منٹ بعد ہنری کی واپسی ہوئی۔ اس نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ ”اسٹائلر ہوٹل چلو۔“

”یہاں کیا ہے؟“

”مس بیڈوس وہیں ٹھہری ہوئی تھی۔“

☆☆☆

استقبالیہ کاؤنٹر پر ایک بوڑھا شخص بیٹھا ہوا تھا جو

دیکھنے میں ہی بیزار اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ہنری اسے نظرانداز کر کے لابی میں نصب فون کی جانب بڑھا اور وہاں سے ایک کال کی پھر وہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا تیسری منزل پر آیا اور راہداری میں دبے قدموں چلتا ہوا کمرا نمبر 310 کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد لفٹ کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان ویٹر ٹرالی سمیت باہر آیا جب اس نے ہنری کو دیکھا تو اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

''یہ میں نے منگوایا ہے۔'' ہنری نے کہا پھر اس نے اپنے عقب میں کمرے کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ''میری بیوی سو رہی ہے اور میں بھوکا ہوں اس لیے یہیں کچھ کھا لوں گا۔''

ویٹر نے کندھے اچکائے اور ٹرالی اس کی طرف بڑھا دی۔ ''تم اسے یہیں چھوڑ دینا۔'' ویٹر نے کہا۔ ''میں بعد میں لے جاؤں گا۔''

ہنری نے اسے ٹپ دی اور جیب سے ایک پانچ کا نوٹ دیا۔ ''کیا میں تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں۔'' ہنری نے ویٹر سے کہا۔

''ضرور۔'' نوٹ دیکھ کر ویٹر کے منہ میں پانی آ گیا۔

''تم اس عورت کو جانتے ہو جو کمرا نمبر 312 میں ہے۔''

''ہاں۔''

''میں نے اس کے بارے میں کچھ سنا ہے۔ وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ تمہیں کچھ معلوم ہے؟''

ویٹر نے پہلے نوٹ اور پھر ہنری کی طرف دیکھا۔

ہنری واپس آیا اور اس نے ٹیکسی میں بیٹھ کر ایک کلب سینڈوچ ڈرائیور کو دیا۔

''مجھے بھوک لگ رہی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے روم سروس کو آرڈر دے کر یہ منگوایا۔''

''شکریہ جناب۔'' ونسنٹ نے سینڈوچ لیتے ہوئے کہا۔ ''کچھ معلوم ہوا؟''

''ہاں لیکن ابھی اس پر تہ جمی ہوئی ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''کیا وقت ہوا ہے؟''

''دو بج رہے ہیں۔''

''میری نیند تو خراب ہو گئی لیکن میں کچھ اور لوگوں کو بھی نہیں سونے دوں گا۔''

''کہاں جانا ہے؟''

''کل میڈ نے اپنے اسٹوڈیو کے ساتھیوں کا ذکر کیا تھا۔ ممکن ہے کہ تمہیں معلوم ہو، وہ کہاں ٹھہرے ہوں گے؟''

''جی جناب سبھی ٹیکسی ڈرائیور جانتے ہیں۔ اس ہوٹل کا نام ڈی سوٹو ہے۔''

''ٹھیک ہے، وہیں چلتے ہیں۔''

راستے میں ونسنٹ نے پوچھا۔ ''تمہیں اس ویٹر نے کیا بتایا؟''

''اس کے کہنے کے مطابق مس بیڈوس بہت ہی پُرکشش، نفیس اور نرم گفتار تھی۔ وہ ہر وقت مسکراتی رہتی تھی پھر ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک بیل بوائے اس کا سامان باہر لے جا رہا ہے جس میں اس کے سوٹ کیس، گارمنٹ بیگز اور ہیٹ باکس شامل تھے۔ اس سامان کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ ایک مہینہ قیام کرے گی۔''

ونسنٹ نے ہوٹل پہنچ کر سڑک کے کنارے گاڑی کھڑی کی اور انجن بند کرتے ہوئے بولا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ عورت وہاں خوش تھی پھر وہ اپنا سامان لے کر کیوں چلی گئی۔ کیا ویٹر نے اس کے جانے کا وقت بتایا؟''

''تقریباً سہ پہر تین بجے۔ اس کے پانچ گھنٹے بعد کل میڈ کو اس کی لاش اپنے کمرے میں ملی۔''

''تمہارے خیال میں اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ اسے کوئی خوش خبری ملی اور اسی وجہ سے اس کا قتل ہوا۔'' ہنری نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اسے کوئی بڑا رول مل گیا یا اس کا کوئی انکل اس کے لیے لاکھوں ڈالر چھوڑ کر مر گیا ہو۔''

''کیا ویٹر نے بتایا کہ کون سا بیل بوائے اس کا سامان لے کر گیا تھا؟''

''وہ اسے نہیں جانتا لیکن اس نے بیل بوائے کا حلیہ بتایا ہے۔ چھوٹا قد، سیاہ بال، عام سی شکل۔''

''یہ ناکافی ہے۔ اس سے کوئی مدد نہیں ملتی۔''

ہنری نے کار سے اتر کر پسنجر سیٹ پر رکھے ہوئے کلپ بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا میں یہ لے سکتا ہوں؟''

☆☆☆

''مجھے اسٹوڈیو کے لوگوں میں اپنے دوستوں سے ملنا ہے۔ وہ کس کمرے میں ہیں؟'' ہنری نے استقبالیہ کلرک سے پوچھا۔

''نام بتاؤ۔''

''وارنر اور برادرز۔''

"انہوں نے پورا فلور بک کر رکھا ہے۔ تم خود جا کر تلاش کرلو۔"

ہنری کچھ کہے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ لفٹ کا انتظار کرتا۔ تیسری منزل پر پہنچ کر وہ راہداری میں آگے بڑھ گیا۔ سب سے آخر میں ہال تھا جس کے دروازے سے روشنی باہر آرہی تھی۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک مردانہ آواز آئی۔

"کون ہے؟"

"میں لیلا بیڈوس کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں، وہ لاپتا ہے۔"

ٹی شرٹ اور نیکر پہنے ہوئے ایک شخص نے دروازہ کھولا اور حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "لاپتا؟"

"ہاں، وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔" ہنری نے کہا۔ "کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟"

"نہیں" اس آدمی نے جواب دیا۔ "تم کون ہو؟"

"میرا نام ہنری ہے۔ مجھے اسٹوڈیو والوں نے بھیجا ہے۔ وہ اس کے لیے پریشان ہیں۔"

"میں جوئے پنسکی ہوں، اندر آجاؤ۔"

ہنری اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔ "تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کہاں ہوگی؟"

"تھوڑا بہت۔" جوئے نے کہا۔ "کیا تم نے کل میڈ سے پوچھا؟"

"اس کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟"

"وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ کل میڈ اپنی بیوی سے چھپ کر اس سے ملتا تھا۔"

"ہاں۔" ہنری نے کہا۔ "یہ ایک افواہ ہے یا تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"تم اس سے اندازہ لگالو کہ ہم سب تیسرے فلور پر ہیں۔ کل میڈ کی بیوی جوائس پانچویں فلور پر ہے اور لیلا اسٹائلر، میں ٹھہری ہوئی ہے جبکہ کل میڈ خود سے فیئر میں ہے۔"

اس نے پیکٹ سے سگریٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "اسٹوڈیو والے کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ کیا وہ صبح تک انتظار نہیں کرسکتے؟"

"کسی شخص نے لیلا کے کمرے میں شور کی آواز سنی تو اس نے اسٹوڈیو فون کیا اور انہوں نے مجھے صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے۔" ہنری نے کہا۔ "کل میڈ کی بیوی کا کمرا کون سا ہے؟"

اردو... اور... فطرت

سردیوں کے موسم میں جب آپ نہانے کے لیے بیٹھیں اور آپ کے سامنے بائیں طرف گرم اور دائیں طرف ٹھنڈا پانی پڑا ہو اور آپ پہلا لوٹا پانی کا اپنے جسم پر ڈال بیٹھیں اور تب پتا چلے کے ابھی آپ نے اس میں گرم پانی ملایا ہی نہیں......!

اس پہلے لوٹے کے بعد جو آپ کی کیفیت ہوگی، اس سے آپ کو اردو کے کئی محاورے فطری طور پر کما حقہ سمجھ میں آجائیں گے۔ مثلاً دم بخود رہ جانا، اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ جانا، دنیا جہاں کی خبر نہ رہنا، گم صم ہو جانا، حلق میں سانس اٹکنا، کلیجہ منہ کو آنا، دل دھک دھک کرنا، نظامِ کائنات تھم جانا، سانس دھونکنی کی طرح چلنا، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جانا، آنکھوں کے حلقے پھیل جانا، دیدے پھٹ جانا، دماغ ماؤف ہو جانا، وغیرہ وغیرہ......

کوہاٹ شہر سے سید ندیم بونیری کی اردو دانی

"510 کیا تم اس سے بات کرنا چاہتے ہو؟"

"یہ ضروری ہے۔"

کمرا نمبر 510 میں تاریکی تھی۔ ہنری نے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ ایک نیند میں ڈوبی ہوئی آواز نے پوچھا۔

"کون ہے؟"

"میرا نام ہنری ہے۔ میں اسٹوڈیو سے آیا ہوں۔"

"بین یہاں نہیں ہے۔" اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا۔

"میں کسی اور کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔" ہنری نے کہا۔

"کون؟"

"لیلا بیڈوس۔"

ایک پرکشش سنہرے بالوں والی عورت نے دروازہ کھولا اور تیکھے لہجے میں بولی۔ "رات کے تین بجے تم میرے شوہر کی محبوبہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟"

ہنری کا منہ کھلا رہ گیا اس نے کہا۔ "کیا میں اندر

''تم پھر آ گئے؟'' پنسکی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔
ہنری جواب دیے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا اور تلاشی شروع کر دی۔ پنسکی نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔ ''تمہارے پاس وارنٹ ہے؟''
''میں پولیس والا نہیں ہوں۔'' ہنری نے کہا۔ ''پیچھے ہٹ جاؤ۔''
پنسکی اسے گھورتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ہنری نے تلاشی جاری رکھی۔ بالآخر اسے الماری کے نچلے خانے سے بیل بوائے کی سرخ رنگ کی ٹوپی مل گئی۔
''شاید وہ غلطی سے یہاں چھوڑ گیا ہے۔'' پنسکی نے کہنا شروع کیا لیکن ہنری نے ہاتھ اٹھا کر نفی میں سر ہلایا۔
''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے کہا۔
پنسکی نے اسے غصے سے دیکھا اور بستر پر بیٹھ گیا۔
''میں نے ایک نظریہ قائم کیا تھا۔'' ہنری نے کہا۔ ''جو مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جا رہا ہے لیکن اس میں کچھ جھول ہیں اور تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے۔''
پنسکی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''تم لیلا بیڈوس سے محبت کرتے ہو؟'' ہنری نے کہا۔
پنسکی کے چہرے کا رنگ بدل گیا لیکن وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''ہاں۔''
''اور تم گزشتہ روز اس سے ملنے گئے تھے؟''
پنسکی نے رونا شروع کر دیا اور ہنری سب کچھ سمجھ گیا۔

☆☆☆

''ٹھیک ہے ونسنٹ۔'' ہنری نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہم آج رات ہی اس معاملے کو نمٹا سکتے ہیں لیکن اس سے پہلے ہمیں دو جگہوں پر جانا ہوگا۔ پہلے اسٹاکر، چلو۔''
''اس کے بعد پولیس اسٹیشن؟''
''نہیں۔ میں کل میڈ سے ملنے جیل جاؤں گا۔''
''تم اسے کیا بتاؤ گے؟''
''اس مرحلے پر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' ہنری نے کہا۔

☆☆☆

کل میڈ اس وقت سو رہا تھا۔ ڈیوٹی پر موجود پہرے دار نے اسے جگایا۔ وہ ہنری کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ پہرے دار کے جانے کے بعد کل میڈ نے پوچھا۔ ''تمہارے پاس کوئی خبر ہے؟''
''پہلے میں تم سے کچھ سوالات کروں گا۔'' ہنری نے

آ سکتا ہوں؟''
''نہیں۔''
''تم ان کے بارے میں جانتی تھیں؟''
''ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''بین محتاط نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس کی زندگی میں آنے والی پہلی عورت ہے، تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''
''وہ لاپتا ہے۔''
''کیا تم پولیس والے ہو؟''
''نہیں۔''
''پھر تمہیں اس کی فکر کیوں ہے؟''
''مجھ سے کہا گیا ہے کہ اسے تلاش کروں۔''
''بہت بہادر ہو۔ ایک بیوی سے اس کے شوہر کی محبوبہ کے بارے میں پوچھ رہے ہو، مجھے کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی مجھے اس کی پروا ہے۔''
''کیوں؟''
''تمہارا نام کیا ہے؟''
''ہنری۔''
''دیکھو ہنری۔'' اس نے کہا۔ ''میرا وکیل طلاق کے کاغذات تیار کر رہا ہے میرے پاس بین کے معاشقوں کے ثبوت ہیں اور مجھے امید ہے کہ طلاق کی صورت میں مجھے اس سے بڑی رقم ملے گی۔''
''پھر تم فلم کے لوگوں کے ساتھ کیوں سفر کر رہی ہو؟'' ہنری نے پوچھا۔
''مجھے صرف پیسوں سے غرض ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ اچھا کام کرے تاکہ مجھے آسانی سے ادائیگی کر سکے۔ اس کے علاوہ کچھ اور پوچھنا ہے؟''
''ہاں۔'' ہنری نے کہا۔ ''کیا میں تمہارا میک اَپ باکس دیکھ سکتا ہوں؟''
''میرے پاس ایسا کوئی باکس نہیں ہے۔''

☆☆☆

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد ہنری نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ مجھے تمام ضروری معلومات مل گئی ہیں لیکن ایک چیز مجھے پریشان کر رہی ہے۔''
''وہ کیا؟'' ونسنٹ نے پوچھا۔
''کف لنکس۔''
''میں سمجھا نہیں۔''
''مجھے ایک اشارہ ملا ہے۔ ہمیں دوبارہ ڈی سوگو جانا ہوگا۔''

کہا۔

"ٹھیک ہے پوچھو۔"

"تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ مقتولہ کو جانتے ہو؟"

کل میڈ نے ایک سرد آہ بھری۔ "یہ اعتراف کرنا مشکل تھا۔ میں جانتا ہوں کہ یہ کتنی بُری بات ہے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور امید کر رہا تھا کہ معاملہ ٹل جائے گا۔"

"تم پروڈکشن کے لوگوں کے بارے میں کتنا جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح لیکن مجھے ان کی تاریخ پیدائش یا دیگر تفصیلات کا علم نہیں۔"

"جوئے پنسکی کے بارے میں کیا کہو گے؟"

"ہاں، میں اسے جانتا ہوں۔ بہت زیادہ نہیں لیکن چہرے۔سے پہچانتا ہوں۔"

"وہ لیلا سے محبت کرتا تھا۔ کیا تمہیں یہ بات معلوم ہے؟"

"اسی لیے اس نے اسے قتل کر دیا؟"

"اس نے قتل نہیں کیا۔" ہنری نے کہا۔ "پولیس کو تمہارے سامان میں سے رومال میں لپٹا ہوا ایک آئینہ ملا ہے۔تم نے کہا کہ وہ تمہاری بیوی کا ہے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس کا ہے؟"

"کیا اس کی کوئی اہمیت ہے؟"

"ہاں۔" ہنری نے کہا۔ "بیوی سے تمہارے تعلقات کی نوعیت کوئی راز نہیں کیا وہ آئینہ کسی اور عورت کا تھا؟ شاید یہ وہی عورت ہو جس کے ساتھ تم نے ڈنر کیا تھا؟"

"جوائس کے ساتھ میرے اختلافات تھے لیکن ہم شہرت کی خاطر یہ رشتہ برقرار رکھے ہوئے تھے۔ پرستار اسے پسند کرتے ہیں۔ وہ صورتِ حال سے باخبر ہے۔ شاید گزشتہ شب بھی اس کے ساتھ کوئی دوست تھا لیکن لیلا اس سے مختلف تھی۔ میں نے کبھی اسے قتل کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔"

ہنری نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں سب سمجھ چکا ہوں لیکن ایک بات نہیں جانتا کہ اس نے ایسی کیا بات کہہ دی تھی جس پر تم غصے میں آ گئے کہ تم نے اسے قتل کر دیا۔"

"میں نے اسے قتل نہیں کیا۔"

"یقیناً تم نے ہی کیا ہے لیکن میں ابھی تک اس کی وجہ نہیں جان سکا گو کہ مجھے کچھ اندازہ ہے۔"

"دیکھو دوست۔" کل میڈ نے کہا۔ "یہ اچھا نہیں لگتا لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ اسے قتل نہیں کیا۔ وہ میرے کمرے میں پہنچنے سے پہلے ہی مر چکی تھی۔"

"یہ تم نے پہلی سچی بات کی ہے۔"

"میں......" کل میڈ نے کہنا شروع کیا پھر رک گیا۔ اس نے دانت بھینچ لیے اور پریشان دکھائی دینے لگا جس پر ہنری مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"پولیس کا کہنا ہے کہ تم اپنے ہوٹل کے کمرے میں اس کی لاش دیکھ کر حیران ہو گئے۔ میں نے اس بارے میں سوچا اور تمہاری جیب میں رکھے ہوئے آئینے کے بارے میں بھی اور میں نے اندازہ لگایا کہ تم واقعی حیران ہوئے ہو گے کیونکہ تم نے اسے اس کے ہوٹل کے کمرے میں قتل کیا تھا۔"

ہنری نے اس کے ردِعمل کا انتظار کیا۔ کل میڈ نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ ہنری نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میرا اندازہ ہے کہ اس نے تمہیں اپنے حاملہ ہونے کے بارے میں بتایا ہو گا یا شاید وہ چاہتی ہو گی کہ تم اپنی بیوی کو چھوڑ دو۔ اس نے تمہیں اپنے ہوٹل کے کمرے میں بُلایا۔ وہ بہت خوش تھی اور تمہیں یہ خبر سنانے کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے تم سے جو کچھ بھی کہا، وہ تمہیں پسند نہیں آیا اور تم نے اسے قتل کر دیا۔ تم جائے وقوعہ سے اپنی غیر موجودگی ظاہر کرنے کے لیے ایک اور خاتون کے ساتھ ڈنر پر چلے گئے اور پورے وقت یہی سوچتے رہے کہ اس قتل کا شُبہ سب سے پہلے تم پر ہی آئے گا۔ کیونکہ مقتولہ کے ساتھ تمہارا معاشقہ راز نہیں رہا تھا پھر تم نے سوچا کہ اور کس پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ شاید اس خاتون دوست پر۔ لہٰذا تم نے اس کا آئینہ چرا لیا لیکن جب تم اپنے ہوٹل پہنچے تو کمرے میں لیلا کی لاش دیکھ کر حیران رہ گئے اور پولیس وہاں پہلے سے موجود تھی۔"

مین خاموش رہا۔ ہنری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہے ہو گے کہ لیلا کی لاش تمہارے کمرے میں کیسے پہنچی؟ میں بتاتا ہوں کہ کیا ہوا۔ ہمارا دوست جوئے پنسکی، لیلا کے کمرے میں گیا۔ وہ اس سے اظہارِ محبت کرنا چاہ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ لیلا کا قتل ہو گیا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ تمہارا کام ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ خود ایک لاش کے پاس کھڑا ہوا تھا جس سے یہی سمجھا جاتا کہ وہی قاتل ہے۔ وہ پریشان ہو گیا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ تمہیں پکڑوایا جائے۔ اس نے فوری طور پر بیل بوائے کا روپ دھارا پھر لاش کو بنڈل بنا کر گارمنٹ بیگ میں ڈالا اور تمہارے کمرے میں پہنچا دیا اور پولیس کو اطلاع دے

دی۔"

"تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔" کل میڈ نے کہا۔

"میں پولیس والا نہیں ہوں۔" ہنری نے کہا۔ "میں اسے اپنے طور پر ثابت کر رہا ہوں۔ میں نے ففتھ وارڈ میں ایک پولیس آفیسر کو فون کر کے کہا کہ وہ لیلا کے کمرے کا بغور معائنہ کرے جہاں تم نے اسے قتل کیا تھا۔ تمہیں معلوم ہے کہ وہاں سے اسے کیا ملا۔ ایک جیبی رومال جس پر تمہارا مونوگرام بنا ہوا ہے۔ وہ اس کے تکیے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ جب انہوں نے تمہیں گرفتار کیا اور تمہاری چیزیں اکٹھی کیں تو میں نے کسی طرح وہ حاصل کر لیا۔

"میں اپنے آپ سے سوال کرتا رہا کہ تم قتل کرنے کے بعد اپنی دوست کے ساتھ ڈنر پر کیوں گئے۔ پھر میں سمجھ گیا کہ تم کسی کو پھنسانا چاہ رہے تھے لہٰذا تم ایوا کو ڈنر پر لے گئے اور کسی طرح اس کا آئینہ چرا لیا تاکہ اس پر قتل کا الزام آجائے لیکن اس سے پہلے ہی پولیس نے تمہیں گرفتار کر لیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اسے آئینے کے ساتھ تمہارا رومال بھی واپس کر دوں۔"

☆☆☆

"تمہیں معلوم ہے ونسنٹ۔" ہنری نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس شخص نے ایک عورت کو قتل کیا، دوسری عورت کو پھنسانے کی کوشش کی اور پھر سمجھتا ہے کہ وہ اس مشکل سے نکل سکتا ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو کہ ایسا ہوگا؟"

"نہیں۔" ہنری نے کہا۔ "پولیس کو اس کے کمرے سے ثبوت مل جائیں گے۔"

"اگر اس نے اپنے آدمیوں سے کہہ دیا کہ وہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ثبوت ضائع کر دیں۔"

"اوہ تم جیبی رومال کی بات کر رہے ہو؟" ہنری نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں اس بارے میں پریشان نہیں ہوں۔"

"کیوں؟" ونسنٹ نے پوچھا۔

"کیونکہ میں نے جھوٹ بولا تھا۔" ہنری نے کہا۔

"کیا وہاں کوئی جیبی رومال نہیں ہے؟"

"نہیں۔"

"پھر تم کیوں مسکرا رہے ہو؟"

☆☆☆

"معافی چاہتا ہوں خاتون۔" ہنری نے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ کیا تم ایک کف لنکس کی جوڑی تلاش کرنے میں میری مدد کر سکتی ہو؟"

ہنری نے ایوا سے کہا جو ایک اور عورت سے باتیں کر رہی تھی۔ ایوا نے اس عورت سے معذرت کی اور اس کے جانے کے بعد بولی۔ "تم کف لنکس کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟"

"جانِ من۔" ہنری نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔"

☆☆☆

ونسنٹ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "یعنی جب وہ اس کا آئینہ چوری کر رہا تھا تو وہ اس کے کف لنکس چرا رہی تھی؟"

"بالکل یہی بات ہے۔" ہنری بولا۔ "جیسے ہی اس نے مجھے بتایا کہ اس کے کف لنکس غائب ہیں تو میں سمجھ گیا کہ یہ ایوا کا کام ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"کیونکہ وہ چور ہے۔"

"میں سمجھ گیا پھر اس نے سوچا کہ دونوں ہی بے قصور ہیں اور تم سے مدد کے لیے کہا جبکہ کل میڈ جانتا تھا کہ وہ مجرم ہے۔ اس کے باوجود اس نے تم سے مدد مانگی جبکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے بھی پھنسا رہا تھا۔"

"یہی منافقت ہے۔"

"کیا ثبوت کے لیے کف لنکس کافی ہوں گے؟" ونسنٹ نے پوچھا۔

"نہیں۔" ہنری نے کہا۔ "لیکن تھوڑی دیر میں جوئے پنسکی پولیس اسٹیشن جا رہا ہے جہاں وہ ایک ایمان دار فرض شناس پولیس آفیسر کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے گا۔ میں نے اسے سمجھایا ہے کہ پولیس کو کیا بیان دینا ہے کہ جب وہ لیلا کے کمرے میں داخل ہوا تو اس نے کل میڈ کو باہر نکلتے دیکھا۔"

"کیا یہ سچ ہے؟"

"نہیں۔" ہنری نے کہا۔ "لیکن ایسا ہو سکتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ مس بیڈوس کو اس پر کوئی اعتراض ہوگا اگر ہم اس کے قاتل کو پکڑنے کے لیے چھوٹا سا جھوٹ بولیں۔"

"اچھا نکتہ ہے۔"

"ٹھیک ہے ونسنٹ۔ مجھے واپس ریور بوٹ پر لے چلو۔ مجھے ایوا سے مل کر تمہارے کرائے کا بندوبست کرنا ہے کیونکہ اسی نے مجھے یہ مشن سونپا تھا۔"

❖❖❖

سارجنٹ مورس نے شیرف کے آفس کا دروازہ کھولا اور پھر اندر داخل ہوگیا۔ شیرف نے آج اسے فون کر کے فوری طور پر اپنے آفس طلب کیا تھا۔ مورس کو یہ تو علم نہیں تھا کہ شیرف نے اسے کیوں بُلایا ہے تاہم اسے اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ کوئی اہم بات ضرور تھی ورنہ عام طور پر شیرف اسے اس طرح طلب نہیں کرتا تھا، کوئی بات کرنی ہوتی تو فون پر ہی کر لیتا تھا۔

"آؤ مورس، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" شیرف

آسیب

شاکر لطیف

سراغرساں کی زندگی آسان نہیں ہوتی... ہر دفعہ ایک نیا اور انوکھا کیس منتظر ہوتا ہے... پچاس سال پرانے ایک بھوت کا سنسنی خیز ماجرا... اس کی وجہ سے ہنستے بولتے لوگ اچانک ہی موت کے گھاٹ اتر گئے...

قتل کی واردات کی انوکھی روداد...... خوف و دہشت کی زندہ مثال......

نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے اس کے سامنے موجود کرسی پر براجمان ہوگیا۔

''کیا لوگے؟'' شیرف نے اس سے پوچھا۔

''میں کافی پی کر آیا ہوں اس لیے فی الحال کچھ نہیں۔'' مورس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تو پھر میں مدعے کی طرف آتا ہوں۔ میں تمہیں ایک دور افتادہ جگہ پر ایک قتل کے کیس کے سلسلے میں بھیجنا چاہتا ہوں۔ یہ تین قتل کا معاملہ ہے اور میرے خیال میں وہاں کی پولیس اس سلسلے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکی ہے۔'' شیرف نے کہا تو سارجنٹ مورس بے اختیار چونک پڑا۔

''کون سے تین قتل میں نے تو اِس بارے میں کچھ نہیں سنا اور پھر میڈیا میں بھی ایسی کوئی خبر زیرِ گردش نہیں ہے؟''

''میں نے اسی لیے تو دور افتادہ علاقے کی بات کی ہے۔'' شیرف نے تفہیمی لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو امریکا اور ریاست میکسیکو کے بارڈر پر واقع ہے ویسے تو الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے اور میڈیا کی رسائی ہر جگہ تک ہو چکی ہے مگر شاید وہ جگہ عام شہری آبادی سے اتنی دور ہے کہ میڈیا کو وہاں ہونے والے ان قتل سے یا تو کوئی دلچسپی نہیں ہے یا انہیں ابھی اس بارے میں علم ہی نہیں ہے مگر ہم قانون کے محافظ ہیں اور ہمیں قاتل کا سراغ لگانا ہے، قطع نظر اس سے کہ اس بارے میں میڈیا شور مچاتا ہے یا نہیں۔''

''آپ کی یہ بات تو درست ہے۔'' سارجنٹ مورس نے کہا۔ ''مگر مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آسکی کہ وہاں کی پولیس اس سلسلے میں ناکام کیسے ہوگئی۔''

''وہاں کی پولیس کی جانب سے مجھے جو رپورٹ موصول ہوئی ہے اگر اس کے بارے میں میڈیا کو علم ہوگیا تو ایک شور مچ جائے گا اور پولیس کا مذاق بن جائے گا اس لیے میں نے یہ رپورٹ ابھی تک خفیہ رکھی ہوئی ہے مگر ظاہر ہے دیر بہ دیر یہ بات میڈیا تک پہنچ ہی جائے گی۔'' شیرف نے ہونٹ چباتے ہوئے بتایا۔

''ایسا کیا ہے اس رپورٹ میں کہ اس کے منظرِ عام پر آنے سے پولیس کا مذاق بن جائے گا۔ پولیس کا کسی کیس کی تفتیش میں ناکام ہوجانا کوئی انہونی تو نہیں ہے۔'' مورس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''جو رپورٹ مجھے موصول ہوئی ہے وہ ایک انہونی ہی ہے۔'' شیرف نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''کیونکہ اس رپورٹ کے مطابق یہ تمام قتل کسی بھوت نے کیے ہیں اور بھوت بھی اس شخص کا ہے جو مر چکا ہے۔''

''کیا......'' مورس نے متحیر لہجے میں کہا۔ ''کیا یہ رپورٹ وہاں کی پولیس کی جانب سے موصول ہوئی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ ہمارے محکمے میں آج بھی اس طرح کے دقیانوسی خیالات رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں۔ آپ کو تو رپورٹ بنانے والوں کے خلاف انکوائری کا آرڈر دینا چاہیے تھا۔''

''میں نے وہاں کے پولیس انچارج سارجنٹ جوناتھن سے فون پر بات کی ہے، وہ بھی اس بات پر بضد ہے کہ یہ کام کسی مرے ہوئے شخص کے بھوت کا ہی ہے اور جوناتھن کا کہنا ہے کہ ایسے بہت سے گواہ موجود ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں سے اس بھوت یا بدروح کو دیکھا ہے۔ جہاں تک انکوائری کی بات ہے تو وہ ضرور ہوگی فی الحال میں نے اسے نوکری سے معطل اس لیے نہیں کیا کہ وہ وہاں کا پرانا آدمی ہے اس لیے وہاں جانے پر تمہارے لیے کام کا آدمی ثابت ہوسکتا ہے۔''

''میرے خیال میں تو سارجنٹ جوناتھن کو کسی ماہرِ نفسیات کی ضرورت ہے، ایسے بیوقوف لوگوں کی ہمارے محکمے میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور آپ نے کہا کہ اس بھوت کو دیکھنے والے کافی گواہ موجود ہیں شاید اس جگہ پر پاگل پن کی کوئی بیماری پھیل گئی ہے۔'' مورس نے ہلکے سے غصے سے کہا۔

''اسی لیے تو میں نے تمہیں وہاں بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تم نے بڑے بڑے پیچیدہ کیس حل کیے ہیں۔ ہمارے محکمے میں اس وقت تم سے زیادہ قابل آفیسر کوئی نہیں ہے۔ بہرحال میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔ جس قصبے کی میں بات کر رہا ہوں اس کا نام روز میری ہے اور اس کی کل آبادی صرف ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہے اس لیے وہاں کے پولیس اسٹیشن کا عملہ بھی خاصا مختصر ہے۔ ایک سارجنٹ جوناتھن اور اس کے ساتھ چھ دیگر پولیس والے۔ ان قتل سے پہلے وہاں سب کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا۔ کسی بڑے کرائم کی رپورٹ کبھی درج نہیں ہوئی تھی، خاصا پُرامن قصبہ تھا مگر تین ماہ پہلے اس کے امن کو کسی کی نظر لگ گئی اور قتل کا یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ اب تین ماہ میں تین قتل ہو چکے ہیں۔ علاقے کے کافی لوگ اس آسیب کے خوف سے اپنا گھر اور زمین فروخت کرکے وہاں سے رخصت ہو چکے ہیں اور میری

اطلاع کے مطابق مزید افراد بھی اپنی زمین وغیرہ فروخت کر کے وہاں سے رخصت ہونے کے متمنی ہیں۔ جوناتھن کے مطابق جلد ہی وہ پورا علاقہ خالی ہوجائے گا اور وہاں صرف اس پُراسرار آسیب کا راج رہ جائے گا جو لوگوں کو مار رہا ہے۔"

"آپ نے بتایا تھا کہ جوناتھن کے مطابق یہ کام کسی مرے ہوئے شخص کے بھوت کا ہے، اس کا حدود اربعہ کیا ہے۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ وہی یہ سارے قتل کر رہا ہو اور اس کی موت واقع نہ ہوئی ہو۔ اہلِ علاقہ کو اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔" مورس نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

"میں نے جوناتھن سے اس کے بارے میں بھی فون پر تفصیلی بات چیت کی ہے۔ اس شخص کا نام جوزف ہے اور اس کی تین ماہ پہلے ہی موت واقع ہوئی ہے۔ وہ ایک لاوارث آدمی تھا، اس کی تدفین بھی قصبے کے لوگوں نے ہی کی تھی۔ سارجنٹ جوناتھن کے مطابق جوزف ایک نیم پاگل یا خبطی قسم کا آدمی تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ سفلی علوم کا بہت بڑا ماہر ہے اور جب اس کی موت واقع ہوگی تو وہ مرنے کے بعد پھر سے زندہ ہوجائے گا۔ اس میں ڈین نام کے کسی پانچ سو برس پرانے آسیب کی روح حلول کر جائے گی۔ وہ ایک نئی طاقت سے جنم لے گا اور پھر اسے دوبارہ موت نہیں آئے گی۔ سردی ہو یا گرمی یا بارش ہو رہی ہو وہ ہمیشہ ایک پھٹے پرانے رین کورٹ میں ملبوس رہتا تھا۔ سر پر بھی ایک پرانی گول ٹوپی پہن کر رکھتا تھا اس کے گندے لباس اور عجیب و غریب باتوں کی وجہ سے قصبے کا کوئی بھی فرد اسے منہ لگانا پسند نہیں کرتا تھا، اس کے سفلی علوم کے دعوے پر بھی کوئی یقین نہیں کرتا تھا۔

"جب اس کی موت ہوئی تو اسے اہل علاقہ کی موجودگی میں دفنایا گیا تھا، اس کی تدفین کے اخراجات قصبے کے ایک لارڈ نے برداشت کیے تھے۔ جوزف کو سب کے سامنے دفن کیا گیا تھا مگر کچھ دن بعد ہی علاقے میں قتل کی پہلی واردات ہوئی اور جس شخص نے قاتل کو دیکھا اس کا دعویٰ تھا کہ وہ جوزف تھا۔ قصبے کے افراد نے اس عینی شاہد کی بات پر یقین نہیں کیا مگر کچھ عرصے بعد ہی قتل کی دوسری واردات ہوئی اور اس بار بھی دو چشم دید گواہوں نے پولیس کو یہ بیان دیا کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے متوفی جوزف کو دیکھا تھا۔ اس بار عینی شاہدین کی بات نے قصبے کے سبھی افراد کو حیران کردیا۔ کچھ افراد خوف زدہ بھی ہوگئے اور پھر جوزف اکثر اوقات قصبے کے افراد کو رات کی تاریکی میں دکھائی دینے لگا اسی دوران تیسرے آدمی کا بھی قتل ہوگیا اور اس بار بھی دو آدمیوں نے گواہی دی کہ انہوں نے جوزف کو یہ قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ جوزف کے ہاتھوں میں قتل کے وقت کوئی بڑا سا کلہاڑا دیکھنے کے بارے میں بھی چشم دید گواہوں کا بیان موجود ہے بہرحال اس صورتِ حال سے پورے علاقے میں بے چینی اور خوف و ہراس پھیل گیا اور اس وجہ سے انہوں نے وہ کام کر ڈالا جسے عام طور پر کرنے کی اجازت ہمارا قانون بھی نہیں دیتا۔"

"کون سا کام۔" مورس نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

"وہاں کے لوگوں نے جوزف کی قبر کشائی کر ڈالی۔" شیرف نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔ "اور تمہیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ قبر میں رکھا ہوا تابوت ٹوٹا ہوا تھا اور اس میں جوزف کی لاش موجود نہیں تھی، یہ دیکھ کر اہلِ علاقہ کے خوف و ہراس میں مزید اضافہ ہوگیا اور کچھ افراد تو اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ اپنے گھر بار، زمین وغیرہ فروخت کر کے اس قصبے کو ہی خیر باد کہہ گئے ان کا خیال تھا کہ جوزف کے جسم میں پانچ سو برس پرانا وہی بھوت یا بدروح سرایت کر گئی ہے جس کے قصے وہ اپنے بڑوں سے سنتے آئے ہیں۔ اس قصبے میں پانچ سو برس پہلے کا کوئی آسیبی قصہ مشہور ہے جس کو وہاں کے لوگ حقیقت مانتے ہیں۔"

"اس طرح کے قصے ہم نے بھی اپنے دادا جان سے سنے ہیں۔" مورس پُرخیال لہجے میں بولا۔ "اور حقیقت میں یہ سب من گھڑت کہانیاں ہیں جو ہمارے آبا و اجداد نے رات کو بچوں کو سلانے کے لیے گھڑ رکھی ہیں، یہ کہانیاں نسل در نسل آگے بھی منتقل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید دور کے باشعور افراد اب ان من گھڑت کہانیوں کے اثر سے باہر نکل آئے ہیں تاہم توہم پرستانہ سوچ کے حامل افراد اب بھی ان باتوں پر یقین رکھتے ہیں کچھ اثرات ہماری فلموں کے بھی ہیں جن میں ایسے بھوت پریت کے قصوں کو حقیقت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ کہانی ایک حقیقی واقعے کو مدِنظر رکھ کر بنائی گئی ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" شیرف نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "دراصل انسان کی فطرت میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور جب انسان کسی ایسی شے کو دیکھ لیتا ہے جس کی کوئی سائنسی تاویل نہیں کر پاتا تو پھر اسے بھوت یا آسیب قرار دینے میں دیر نہیں لگاتا۔ بہرحال اب تمہیں وہاں روانہ ہونا ہے۔ میں نے جوناتھن کو احکامات دے دیے ہیں اگرچہ وہ رینک میں تمہارے برابر ہے مگر

اس کیس میں تمہاری ماتحتی میں کام کرے گا۔ اگر تم یہاں سے کسی کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میں کام کے دوران زیادہ بھیڑ بھاڑ پسند نہیں کرتا مگر پھر بھی میں اپنے ماتحت ڈیوڈ کو ساتھ لے کر جانا چاہتا ہوں۔" مورس نے کہا۔

"تو پھر ٹھیک ہے تم کل روانہ ہو جاؤ۔ بہتر ہے کہ تم گاڑی پر ہی یہ طویل سفر طے کرو۔ ویسے تو میں تمہیں اس کیس کے چیدہ چیدہ نکات سے آگاہ کر چکا ہوں تاہم یہ فائل بھی لے لو یہ جوناتھن نے بھجوائی ہے اس میں سب کچھ تفصیل سے درج ہے۔" مورس نے فائل تھامی اور پھر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس سے پہلے کہ اس آسیب کا قصہ میڈیا تک پہنچے اور پولیس کے محکمے کا مذاق بنے اب یہ تمہاری ذمے داری ہے کہ تم اس آسیب تک پہنچ جاؤ۔" شیرف نے کہا تو مورس اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازے کی جانب بڑھ گیا، روانگی سے قبل اسے فائل کا اچھی طرح مطالعہ کرنا تھا اور ڈیوڈ کو فون کر کے روانگی کے لیے تیار رہنے کا بھی حکم دینا تھا۔

اگلے دن وہ اپنے خاص ماتحت ڈیوڈ کے ہمراہ صبح تقریباً نو بجے سفر پر روانہ ہوا۔ ڈیوڈ نے کار کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھال رکھی تھی جبکہ مورس اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر براجمان تھا۔ مورس کے فون کرنے کے بعد ڈیوڈ نے رات کو ہی اپنا سامان پیک کر لیا تھا وہ مورس کی ماتحتی میں کافی عرصے سے کام کر رہا تھا اور دونوں نے مل کر بڑے بڑے پیچیدہ کیس حل کیے تھے۔ راستے میں مورس نے ڈیوڈ کو اس کیس کے چیدہ چیدہ نکات سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"تو اس بار ہم ایک آسیب کو پکڑنے جا رہے ہیں ویسے یہ میرے دس سالہ کیریئر کا پہلا کیس ہے جس میں ہمیں ایک بھوت کو گرفتار کرنا ہے۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"بھوت کو نہیں بھوت کے پیچھے چھپے ہوئے...... اصل قاتل کو۔" مورس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھی تک جو کچھ میں نے سارجنٹ جوناتھن کی ارسال کردہ فائل میں پڑھا ہے اس نے مجھے بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ جوزف نامی اس شخص کو سیکڑوں افراد کی موجودگی میں سپردِ خاک کیا گیا تھا اور اس کے بعد سیکڑوں افراد نے اسے زندہ بھی دیکھا جبکہ کچھ افراد نے اسے قتل کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے میں ابھی تک نہیں سمجھ پایا، قصبے کے افراد کا تو خیال ہے کہ ان کے قصبے میں کوئی پانچ سو سال پرانا آسیب پھر سے آ گیا ہے۔"

"اس کو۔۔ بھی ابھی ہی آنا تھا اگر کچھ سال بعد آتا تو کم از کم ہماری جان تو اس کیس سے چھوٹ جاتی۔ میں تو اپنی بیوی کے ساتھ اِس ماہ چھٹیاں لے کر کہیں جانے کا پروگرام بنائے بیٹھا تھا مگر درمیان میں یہ آسیب آ گیا۔" ڈیوڈ نے منہ بناتے ہوئے کہا تو مورس بے اختیار ہنس پڑا۔

"اب پولیس کی نوکری میں تو اس طرح ہوتا ہی رہتا ہے۔ اچانک ہی کسی ایسے کیس سے واسطہ پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنی ساری چھٹیاں اور پروگرام ملتوی کرنے پڑ جاتے ہیں۔" مورس ہنستے ہوئے بولا۔

"مگر ہم اپنی تفتیش کا آغاز کہاں سے کریں گے؟" ڈیوڈ نے کار کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا کیونکہ اب وہ رش والی جگہ سے نکل کر ایسی سڑک پر آ گیا تھا جہاں ٹریفک کی آمدورفت خاصی کم تھی۔

"میرے خیال میں سب سے پہلے ان افراد سے ملاقات ضروری ہے جنھوں نے جوزف کو دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے۔ ان افراد میں سے بھی سرفہرست وہ لوگ ہیں جنھوں نے جوزف کو قتل کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اس کے بعد ہی آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ شیرف کا کہنا ہے کہ ہمیں اس کیس پر بہت تیزی سے کام کرنا ہوگا، اس سے پہلے کہ یہ خبر میڈیا تک پہنچے ہمیں قاتل تک پہنچنا ہوگا ورنہ پولیس کی بہت بدنامی ہوگی۔" مورس نے کہا۔

"ویسے اگر سچ مچ ہمارا سامنا کسی آسیب سے ہو گیا تو پھر ہم کیا کریں گے؟" ڈیوڈ نے اس بار شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر میں اس سے یہی درخواست کروں گا کہ وہ پانچ سو برس قبل کی اپنی دنیا میں واپس چلا جائے کیونکہ ہماری جدید سائنس کو ماننے والی دنیا میں کسی آسیب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔" مورس نے کہا تو ڈیوڈ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

روز میری نامی قصبے میں وہ اگلے دن پہنچے کیونکہ انہوں نے آدھا سفر طے کرنے کے بعد راستے میں ایک ہوٹل میں کمرا لے کر آرام کیا تھا۔

وہ قصبے کے چھوٹے سے پولیس اسٹیشن پہنچے تو سارجنٹ جوناتھن نے ان کا استقبال کیا۔ جوناتھن ساٹھ سال کا ایک بوڑھا شخص تھا اور شاید جلد ہی ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس نے جو رپورٹ شیرف کو دی تھی اس کے بعد مورس کا

بھی یہی خیال تھا کہ اب اسے جلد از جلد ریٹائر ہو جانا چاہیے۔ جوناتھن نے پولیس اسٹیشن کے اندر ہی اپنے آفس سے ملحق ایک کمرے میں ان کی عارضی رہائش کا بھی بندوبست کر دیا۔ وہ طویل سفر کے بعد قدرے تھکاوٹ کا شکار تھے اس لیے اس رات بھی انہوں نے آرام کیا۔

اگلے دن صبح سویرے ہی سارجنٹ موریس نے ڈیوڈ کے ساتھ اپنی تفتیش کا آغاز کر دیا۔ وہ سب سے پہلے اس قصبے میں قتل ہونے والے تین افراد کے لواحقین سے ملنا چاہتے تھے۔

پہلا قتل انتھونی نام کے ایک بوڑھے شخص کا ہوا تھا۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق اسے کسی بڑے اور تیز آلے سے قتل کیا گیا تھا۔ چشم دید گواہ کے مطابق یہ قتل کلہاڑے ٹائپ کے کسی ہتھیار سے کیا گیا تھا۔ باقی دو افراد جن کے نام رابرٹ اور مارش تھے ان کو بھی بالکل اسی طرح قتل کیا گیا تھا، تاہم یہ تینوں قتل رات کے وقت ہوئے تھے۔ بوڑھا انتھونی اس وقت قتل ہوا تھا جب وہ ویک اینڈ پر شہری علاقے سے اپنے گھر واپس آ رہا تھا، وہ شہر میں کہیں ملازمت کرتا تھا اور صرف ویک اینڈ پر ہی گھر آتا تھا اس دن بھی وہ معمول کے مطابق اپنی بائیک پر واپس آ رہا تھا مگر قصبے کے پاس پہنچتے ہی وہ قاتل کا شکار بن گیا، اس کے قتل کا ایک چشم دید گواہ بھی موجود تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ تینوں قتل کی وارداتوں میں ایسے دیگر گواہ بھی موجود تھے جنھوں نے قتل کی یہ وارداتیں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں مگر کسی نے بھی مقتولین کی زندگی بچانے کی کوشش نہیں کی تھی شاید آسیب کے خوف نے انہیں ایسا نہیں کرنے دیا تھا۔ سب نے اپنے سامنے جوزف نامی شخص کو سپردِ خاک ہوتے دیکھا تھا ایسے میں اسے سامنے دیکھ کر کسی میں آگے بڑھنے کی شاید ہمت ہی نہیں تھی۔ مارش اور رابرٹ کا قتل بھی رات کے اندھیرے میں ہوا تھا۔

سارجنٹ موریس نے ڈیوڈ اور پولیس اسٹیشن سے دو مزید افراد کو ساتھ لیا اور پھر فائل میں درج پتوں کے مطابق تمام مقتولین کے لواحقین سے ملاقات کر کے ان سے خاصی تفصیلی بات چیت کی اور پھر واپس آ گیا۔ اب اسے ان چشم دید گواہوں سے ملنا تھا جنھوں نے جوزف نامی مقتول کے بھوت کو قتل کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ موریس نے ان کے گھر جانے کے بجائے پولیس کے ذریعے انہیں پولیس اسٹیشن طلب کرنا زیادہ مناسب سمجھا تھا۔

انتھونی کو قتل ہوتے جس شخص نے دیکھا تھا اس کا نام جیکب تھا اور وہ سب سے پہلے پولیس اسٹیشن پہنچا تھا۔ جیکب تیس سال کی عمر کا ایک نوجوان تھا، وہ قصبے کے سب سے دولت مند شخص لارڈ ہنکس کے ہاں ملازمت کرتا تھا اور اس وقت بھی اسی کے گھر سے آ رہا تھا۔ موریس نے جن پولیس والوں کو اسے بلانے کے لیے بھیجا تھا، انہوں نے موریس کو بتایا کہ باقی کے چار افراد کو بھی مطلع کر دیا گیا ہے وہ کچھ ہی دیر میں پہنچ جائیں گے فی الحال جیکب موجود تھا لہٰذا موریس اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گیا، ڈیوڈ اس کے ساتھ ہی تھا۔

جیکب کو ایک کرسی پر بٹھا کر موریس اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں تو جیکب تم بتاؤ کہ جس رات تم نے انتھونی کا قتل ہوتے دیکھا تم اس جگہ پر کیسے اور کیوں موجود تھے اور تم نے اتنے وثوق سے یہ بات کیسے کی ہے کہ وہ قاتل جوزف یا اس کا بھوت ہی تھا؟''

''میں اپنا بیان لکھوا چکا ہوں۔'' جیکب نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''میں پڑھ چکا ہوں مگر اس وقت میں از سرِنو تم سے سننا چاہتا ہوں۔'' موریس نے کہا۔ ''اور ہاں ذہن پر اچھی طرح زور دے کر کوئی ایسی بات یاد کرنے کی کوشش کرو جو تم نے معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دی ہو اور اپنے بیان میں نہ لکھوائی ہو۔''

''میرے خیال میں تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' جیکب پُرخیال لہجے میں بولا۔ ''میں نے اس رات جو دیکھا تھا سب کچھ ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا تھا، اس وقت تو میری بات کا کسی نے یقین ہی نہیں کیا تھا الٹا سارجنٹ جوناتھن کو مجھ پر شک ہو گیا تھا اس نے تفتیش مکمل ہونے تک مجھ پر قصبے سے باہر جانے پر بھی پابندی لگا دی تھی، مگر بعد میں ہونے والے واقعات نے میری بات کی تصدیق کر دی۔ جوزف کی شکل میں ڈین نامی پانچ سو برس پرانا بھوت واپس آ گیا ہے وہی بھوت جو کسی زمانے میں لوگوں کا خون پیا کرتا تھا۔''

''تم شاید ڈریکولا کی بات کر رہے ہو، ہمارے ہاں اس موضوع پر کافی فلمیں بن چکی ہیں۔'' پاس بیٹھے ڈیوڈ نے قطع کلامی کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا تو موریس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ اس بات پر یقین نہیں کریں گے۔'' جیکب نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے سمجھی

لہجے میں جواب دیا۔ ''بظاہر یہ بات حقیقت سے بہت دور لگتی ہے کہ اس قصبے میں کوئی پانچ سو برس پرانی بدروح پھر آگئی ہے جس نے جوزف کے جسم کو استعمال کر کے لوگ کو مارنا شروع کر دیا ہے۔ اب تک تین افراد اس کا شکار بن چکے ہیں اور اس عفریت کے خون کی پیاس ابھی بجھی ہے یا نہیں اس بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ میں بھی اپنے آباؤاجداد کی سنائی ہوئی اس کہانی کو..... من گھڑت ہی سمجھتا تھا مگر اب تو میں نے اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے اور قصبے کے سیکڑوں لوگ ان تینوں قتل کے گواہ ہیں۔''

''تمہارے علاوہ صرف چار لوگ اور ہیں۔'' مورس نے جیکب کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''باقی افراد نے جوزف کو دیکھنے کا دعویٰ ضرور کیا ہے مگر اسے کسی کا خون کرتے دیکھنے کا دعویٰ تم سمیت صرف پانچ افراد کا ہی ہے۔''

مورس کی بات سن کر جیکب تیز لہجے میں بولا۔ ''تو کیا جوزف کا دکھائی دینا کوئی نارمل بات ہے۔ قصبے کے سیکڑوں افراد کی موجودگی میں اسے منوں مٹی تلے دفن کیا گیا تھا اور وہ بھی لکڑی کے تابوت میں بند کر کے مگر اس کے باوجود وہ اتنے زیادہ افراد کو دکھائی دیا۔ کیا یہ ثبوت کافی نہیں ہے کہ جوزف مرنے کے بعد ایک آسیب کا روپ دھار چکا ہے وہی آسیب جو پانچ سو برس پہلے بھی اس بستی پر قہر بن کر برسا تھا اور قصبے کے پچاس سے زائد افراد اس کا نشانہ بن گئے تھے وہ پھر سے آگیا ہے ہمارے لوگوں کا خون پینے کے لیے۔'' بات کرتے ہوئے جیکب کے چہرے پر بے پناہ خوف کے تاثرات عود کر آئے۔

''وہ پھر سے آگیا ہے مگر شاید اس نے اپنا طریقۂ واردات بدل لیا ہے۔'' ڈیوڈ سے رہا نہ گیا تو وہ دوبارہ بول پڑا۔ ''اب دیکھو نہ پانچ سو برس پہلے وہ لوگوں کا خون پیا کرتا تھا مگر اب جن افراد کا قتل ہوا ہے ان کا خون نہیں پیا گیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں تو ایسی کوئی بات درج نہیں ہے۔''

''دیکھو جیکب۔'' اس بار مورس قدرے سخت لہجے میں بولا۔ ''ہمیں یہ بھوت کی کہانی مت سناؤ اور صرف یہ بتاؤ کہ اس رات تم نے کیا دیکھا تھا؟''

''او کے.....'' اس بار جیکب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''دراصل انتھونی شہر میں ملازمت کرتا تھا اور ویک اینڈ کی رات معمول کے مطابق اپنے گھر واپس آرہا تھا، یہ اتفاق تھا کہ اس رات میں بھی شہر گیا ہوا تھا اور میں بھی اس وقت اپنی بائیک پر واپس آرہا تھا۔ ان دنوں بہت سردی تھی اور اس دن دھند بھی بہت زیادہ تھی، زیادہ دور تک کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مجھے اپنے سے کچھ آگے ایک بائیک کی ہیڈ لائٹس دکھائی دیں تو میں نے یہ سوچ کر اپنی بائیک کی رفتار تیز کی کہ یقیناً میرے قصبے کا ہی کوئی آدمی ہوگا مگر جیسے ہی میں اس کے قریب پہنچا، میں نے سڑک کے ایک سائیڈ سے اس پر ایک سایہ سا جھپٹتے دیکھا اور اس کے ساتھ ہی بائیک کا سوار بھی زمین پر جا گرا۔ اس وقت تک مجھے اندھیرے اور دھند کی وجہ سے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ انتھونی ہے۔ کیونکہ دھند کی وجہ سے اس کی شکل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔''

''تمہیں انتھونی کی شکل دکھائی نہیں دی کیونکہ دھند تھی مگر تمہیں اسے مارنے والے جوزف کی شکل دکھائی دے گئی؟'' مورس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

''جی کچھ ایسا ہی ہوا ہے، میں آپ کو پوری بات بتاتا ہوں۔'' جیکب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جیسے ہی وہ سایہ انتھونی پر جھپٹا میں نے گھبرا کر بریک لگا دی۔ میری بائیک اس سے کچھ دوری پر ہی رک گئی تھی پھر میں نے اس سائے کو کسی بڑے سے ہتھیار سے انتھونی پر وار کرتے دیکھا۔ اس نے اس پر کافی وار کیے اور پھر سڑک کے دوسری طرف موجود درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوگیا۔ مڑتے وقت کچھ لمحوں کے لیے اس کا چہرہ میری بائیک کی ہیڈ لائٹس کی زد میں آیا تھا اور اسی وقت میں نے اسے پہچان لیا تھا، وہ جوزف ہی تھا۔ میرے تو خوف کے مارے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے، میں اپنی جگہ پر سن سا ہوگیا تھا، مجھ میں گویا حرکت کرنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی۔''

''مگر اس آسیب نے تمہیں زندہ کیوں چھوڑ دیا؟'' ڈیوڈ نے ایک بار پھر لقمہ دیا۔ ''بھئی آخر اسے ایک چشم دید گواہ چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''اب اس بارے میں بھلا میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' جیکب نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ویسے کسی قاتل کو گواہ کو ختم کرنے کی بات سمجھ میں آتی ہے مگر کسی آسیب کو بھلا اس سے کیا فرق پڑتا ہے، اسے گرفتاری کا خوف تھوڑی ہوتا ہے۔''

''اس کے بعد تم نے کیا کیا تھا؟'' مورس نے پوچھا۔

''میں فوراً اپنے قصبے پہنچا اور وہاں کے کچھ افراد کو اس قتل سے آگاہ کیا پھر ہم نے پولیس اسٹیشن جا کر پولیس کو بھی مطلع کر دیا۔ مجھے یہ بعد میں علم ہوا کہ مرنے والا انتھونی تھا، میں نے تو وہاں سے بھاگتے وقت خوف کے مارے اس

لاش کی جانب دیکھا بھی نہیں تھا۔" جیکب نے کہا۔

"ٹھیک ہے، فی الحال تم جاسکتے ہو مگر یاد رکھنا ابھی تفتیش چل رہی ہے اس لیے پولیس کو آگاہ کیے بغیر قصبے کو چھوڑ کر کہیں مت جانا۔" سارجنٹ مورس نے کہا تو جیکب اثبات میں سر ہلاتا ہوا کرسی سے اٹھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"مجھے تو سارجنٹ جوناتھن پر حیرت ہے اس نے اس آدمی کی کہانی پر یقین کیسے کرلیا۔" جیکب کے جاتے ہی ڈیوڈ نے کہا۔

"اس نے بھی فوری یقین نہیں کیا تھا مگر جب جوزف کو زندہ دیکھنے کی گواہی قصبے کے دیگر لوگوں نے دی ہوگی تو اسے یقین کرنا پڑا ہوگا ویسے اس کا تعلق بھی اسی قصبے سے ہے۔ پانچ سو برس پرانے بھوت کا قصہ وہ بھی اپنے بڑوں سے سنتا رہا ہے اس لیے اس کی سوچ بھی توہم پرستانہ ہے۔"

"ویسے یہ پانچ سو برس پرانے بھوت یا آسیب کا قصہ ہے کیا، جس نے آج تک اس قصبے کو اس کے خوف سے نہیں نکلنے دیا۔" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

"سارجنٹ جوناتھن نے جو رپورٹ شیرف کوارسال کی ہے اس میں اس قصے کو بھی لکھا ہے۔" مورس نے کہا۔ "بہر حال میں تمہیں سارا قصہ سناتا ہوں۔ یہ قصبہ بہت قدیم ہے یہاں کے باسی تقریباً چھ صدیوں سے اسی جگہ آباد ہیں۔ پانچ سو برس قبل اس قصبے میں ڈین نام کا ایک شخص رہا کرتا تھا جس پر لوگوں کو یہ شک تھا کہ وہ سفلی علوم کا ماہر ہے۔ اس دور میں کالے جادو کرنے والے افراد کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور لوگ کالے جادو کرنے والوں کو زندہ جلا دیتے تھے۔ ڈین پر لوگوں کو صرف شک تھا مگر اس کے خلاف کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے وہ ان لوگوں کے شر سے محفوظ رہا جو اس سے نفرت کرتے تھے مگر پھر ایک دن وہ واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں کا شک یقین میں بدل دیا۔ ایک دن قصبے سے ایک بچہ غائب ہوگیا اس بچے کی عمر کوئی نو دس سال کے قریب تھی اور وہ اکثر ڈین کے پاس کھڑا اس سے باتیں کرتا تھا۔ جب شام تک بچے کا کوئی پتا نہ چلا تو لوگوں کو یہ شک ہوا کہ ڈین نے اس بچے کو اپنے کسی سفلی عمل کو مکمل کرنے کے لیے شیطان کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ ڈین کے کچھ دشمنوں نے اس بات کا اتنا پروپیگنڈا کیا کہ قصبے کے لوگوں کا ڈین پر شک یقین میں بدل گیا۔ انہوں نے ڈین کو پکڑا اور اس کو زندہ جلا ڈالا۔ ڈین چیختا رہا کہ اس کا بچے کی گمشدگی سے کوئی تعلق نہیں ہے مگر کسی نے اس کی بات کا یقین نہ کیا۔ جب اسے زندہ جلایا جا رہا تھا تو اس نے کہا کہ وہ ایک دن لوٹے گا اور اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا حساب لے گا۔ وہ خود پر ظلم کرنے والوں کی نسلوں کو بھی نہیں بخشے گا۔ ڈین تو جل مرا مگر اس کی کہانی یا جھوٹی کہانی مشہور ہو گئی۔"

"ہوں تو اب مسٹر ڈین پانچ سو برس بعد لوٹے ہیں۔ جن افراد نے ان کو مارا تھا ان کی اگلی نسلوں سے بدلہ لینے کے لیے اور یہ تین قتل بھی انہوں نے اسی لیے کیے ہیں۔" ڈیوڈ نے کہا۔

"کم از کم یہاں کے لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ ڈین واپس لوٹ آیا ہے جوزف کے روپ میں اور اب وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا بدلہ لے گا۔ اس کہانی کا سب سے حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ ڈین کی موت کے چند گھنٹوں بعد ہی وہ گمشدہ بچہ مل گیا تھا اس کی گمشدگی سے ڈین کا کوئی تعلق نہیں تھا، وہ جنگل میں غلطی سے راستہ بھٹک گیا تھا۔ قصبے کے لوگوں کو اپنے کیے کا پچھتاوا تو ہوا مگر اب جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس قصبے میں پچاس افراد کی موت واقع ہوئی اور یہ کام ڈین کے بھوت نے کیا۔ میرے خیال میں یہ کہانی اس دور کے کسی ذہنی بیمار نے گھڑی تھی مگر کیونکہ اس کہانی میں بڑی چاشنی ہے کہ ڈین کو بے گناہ قتل کیا گیا ہے اس لیے یہ کہانی نسل در نسل آگے منتقل ہوتی رہی اور آج اس قصبے کے بھی لوگ اسے سچ سمجھ بیٹھے ہیں، ان کا خیال ہے کہ پچاس افراد کے خون سے ڈین کی پیاس نہیں بجھی اس لیے وہ خود پر ظلم کرنے والوں کی نسلوں سے بدلہ لینے کے لیے جوزف کے روپ میں دوبارہ آگیا ہے۔"

"مگر لوگوں کو یہ یقین کیوں ہو چلا ہے کہ ڈین کا بھوت جوزف کے اندر موجود ہے؟" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

"کیونکہ جوزف یہ بات اکثر قصبے کے افراد سے کہا کرتا تھا کہ وہ جب مرے گا تو ڈین اس کے اندر زندہ ہو جائے گا۔ اس کا انتقام ابھی ادھورا ہے اس لیے وہ ایک بار پھر آئے گا۔ جوزف ایک نیم پاگل اور خبطی قسم کا انسان تھا اس لیے اس وقت کسی نے بھی اس کی بات کو سیریس نہیں لیا مگر اس کی موت کے بعد جو ڈراما شروع ہوا اس نے سب کو یہ یقین کرنے پر مجبور کر دیا کہ ڈین پھر آگیا ہے اور اب وہ اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر کے ہی جائے گا۔ اب ہمیں مسٹر ڈین یا جوزف کے پیچھے چھپے ہوئے اس اصل قاتل تک پہنچنا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ ان افراد کی جان لینے سے وہ کون سا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کچھ نہ کچھ تو ایسا ہے جو ابھی میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ ہمارے پاس یہاں پولیس کی زیادہ نفری بھی نہیں ہے اس لیے زیادہ کام ہم دونوں کو ہی کرنا ہے۔‘‘

ڈیوڈ نے اس بار موریس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا، وہ سر جھکائے خاموشی سے کچھ سوچنے لگا اسی اثنا میں کمرے میں ایک پولیس والا داخل ہوا اور اس نے قتل کے باقی چار چشم دید گواہان کی آمد کی اطلاع دی۔

موریس اور ڈیوڈ نے کافی دیر تک ان چاروں افراد سے بھی پوچھ گچھ کی۔ ان کے بیانات بھی جیکب کے بیان سے ملتے جلتے تھے۔ سب نے جوزف کا چہرہ دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا۔ پوچھ گچھ کے بعد موریس نے انہیں بھی جانے کی اجازت دے دی۔

قتل کے گواہان سے تو تفتیش ہو گئی تھی تاہم ابھی قصبے کے ان افراد سے ملنا تھا جنہوں نے جوزف کو دیکھنے کی گواہی دی تھی، ان افراد کی تعداد سو سے زیادہ تھی اس لیے موریس نے مناسب یہی سمجھا کہ ان سب کو پولیس اسٹیشن بلانے کے بجائے کسی ایک ہی جگہ ان سے ملاقات کر لی جائے، اس مقصد کے لیے جوناتھن کے تعاون کی ضرورت تھی لہٰذا موریس نے اسے طلب کر لیا، کچھ ہی دیر میں وہ آ گیا۔

موریس نے اس کے سامنے مدعا پیش کیا۔

’’میرے خیال میں سب کو ایک ساتھ پولیس اسٹیشن بلانا یا کسی ایک جگہ اکٹھا کرنا مشکل ہوگا کیونکہ وہ سب ملازمت پیشہ افراد ہیں، ہاں کل سنڈے ہے اور چرچ میں وہ سب عبادت کے لیے اکٹھے ہوں گے۔ آسیب سے نجات حاصل کرنے کے لیے وہاں خصوصی دعائیں مانگی جاتی ہیں اور ایسا ہر سنڈے ہوتا ہے۔‘‘ موریس کا مقصد جان کر جوناتھن نے حل پیش کیا۔

’’ٹھیک ہے تو پھر کل ان سے وہیں ملاقات ہوگی۔‘‘ موریس نے کہا۔ ’’میں دراصل اس کیس سے وابستہ زیادہ سے زیادہ افراد سے ملاقات چاہتا ہوں اور ہاں مجھے ان افراد کے پتے یا سیل فون نمبر بھی درکار ہیں جو آسیب کے خوف سے اس علاقے کو چھوڑ کر جا چکے ہیں۔‘‘

’’ان افراد کا اب اس کیس سے کیا تعلق اور پھر وہ کہاں گئے ہیں اس کا علم ہمیں کیسے ہوگا۔‘‘ جوناتھن نے کہا تو موریس اس کی کند ذہنی پر بے اختیار مسکرا دیا۔

’’انہوں نے علاقہ چھوڑا ہے اپنے رشتے داروں سے قطع تعلق تو نہیں کیا۔ آپ ان کے یہاں موجود عزیز اقارب سے رابطہ کریں اور ان کے سیل فون نمبر وغیرہ لے لیں۔‘‘ موریس نے کہا۔

’’اوہ آپ نے درست کہا، میں جلد ہی آپ کو ان کے نمبر لے کر دے دوں گا۔‘‘ بوڑھے سارجنٹ جوناتھن نے کہا تو موریس نے جواباً بس تفہیمی انداز میں سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

’’یہ شخص تو ضرورت سے زیادہ ہی احمق ہے۔‘‘ جوناتھن کے جانے کے بعد ڈیوڈ نے کہا۔

’’ہاں احمق ہونے کے ساتھ ساتھ خاصی سادہ طبیعت کا مالک بھی ہے ورنہ بھوت کی کہانی پر اتنی آسانی سے یقین نہ کرتا۔ بہرحال دیکھتے ہیں ممکن ہے کل کی تفتیش سے اس کیس کی کوئی نئی راہ متعین ہو جائے۔‘‘

’’میرے نزدیک تو قتل کے تمام چشم دید گواہ ہی جھوٹ بول رہے تھے۔‘‘ ڈیوڈ نے کہا۔ ’’ان کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ رٹے ہوئے جملے بول رہے ہوں۔‘‘

’’تمہاری بات درست ہے۔‘‘ موریس اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’ان کے بارے میں میرا بھی یہی گمان ہے۔ بہرحال کل چرچ میں ان افراد سے ملاقات کر لیں جنہوں نے جوزف کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا پھر سوچیں گے آگے کیا کرنا ہے۔‘‘

اس دن کا باقی وقت موریس اور ڈیوڈ نے اپنے کمرے میں ہی گزارا وہ صرف رات کا کھانا کھانے کے لیے کمرے سے باہر آئے۔

اگلے دن وہ ڈیوڈ اور جوناتھن کے ہمراہ چرچ کے باہر عین اس وقت پہنچا جب وہاں عبادت کی رسومات ادا کی جا رہی تھیں۔ چرچ کے اندر تو بالکل جگہ نہیں تھی بلکہ اندر سے زیادہ لوگ تو چرچ کے باہر موجود تھے ایسا لگتا تھا جیسے پورا قصبہ ہی امنڈ آیا تھا۔

’’میں لوگوں کی بھیڑ میں ان افراد کو تلاش کرتا ہوں جن سے آپ ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔‘‘ جوناتھن نے کہا۔

’’اگر سب سے ملاقات نہ بھی ہو سکے تو کوشش کیجیے گا کہ زیادہ سے زیادہ افراد سے ملاقات ہو جائے۔‘‘ موریس نے کہا تو جوناتھن اثبات میں سر ہلاتا ہوا لوگوں کی بھیڑ میں گھس گیا۔

’’حیرت ہے اتنے لوگ تو ہمارے شہر کے کسی چرچ میں اکٹھے نہیں ہوتے یہاں کے لوگ اتنے مذہبی ہوں گے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، یہاں تو گویا پورا قصبہ ہی امنڈ آیا

ہے۔" ڈیوڈ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ آسیب کا خوف ہے جس نے ان سب کو مذہبی بنا دیا ہے۔" موریس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ "ورنہ اس سے پہلے شاید یہاں اتنی بھیڑ نہیں ہوتی ہوگی۔ لوگوں کے ذہن میں موت کا خوف بیٹھ گیا ہے اور اب انہیں اس خوف کا علاج چرچ میں ہی نظر آتا ہے۔ آسیب نے انہیں خدا یاد کروا دیا ہے ورنہ آج کل امریکی عوام چرچ جانا ہی پسند نہیں کرتی، زیادہ تر افراد مذہب پسندانہ سوچ ہی نہیں رکھتے۔"

"سر یہ پادری تو چرچ کے اندر ہے مگر یہ چرچ کے باہر ایک بلند اسٹیج کس مقصد کے لیے لگائی گئی ہے۔" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتا، میں بھی تمہارے ساتھ ہی یہاں آیا ہوں۔" موریس نے کہا۔

اسی لمحے اسٹیج کے ساتھ موجود سیڑھیوں سے ایک شخص اوپر آ گیا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا مائیک بھی موجود تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس شخص نے مائیک کے ذریعے لوگوں کے ہجوم کو مخاطب کیا۔

"میرے پیارے دوستو اور ساتھیو، میں لارڈ ہنگس آپ سے مخاطب ہوں جیسا کہ آپ سب افراد آگاہ ہیں کہ ہمارا یہ چھوٹا سا قصبہ عام دنیا سے دور امن کا گہوارہ تھا، ہم سب کتنے چین اور سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے، پسماندہ علاقہ ہونے کے باجود ہمیں زندگی کی ہر سہولت میسر تھی اور آج بھی ہے مگر اب ہماری ان خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی ہے، پورا قصبہ بے چینی اور خوف کی ایک عجیب کیفیت کا شکار ہو چکا ہے، پانچ سو برس پرانے ایک آسیب نے ہماری زندگی اجیرن کر دی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اس آسیب کا کیسے خاتمہ کیا جا سکتا ہے، ہم نے اپنے بڑوں اور آباؤاجداد سے اس کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اس سے یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنا بہت مشکل ہے، وہ ایک خون آشام بلا ہے جو جوزف کے روپ میں ہمارے سر پر منڈلا رہی ہے، اب تک تین افراد اس کا شکار بن چکے ہیں اور نہیں معلوم کہ وہ آسیب مزید کتنے افراد کی جانیں لے گا، اس کے خون کی پیاس کب بجھے گی۔ جب جوزف زندہ تھا تو ہمیں کہا کرتا تھا کہ ڈین کا آسیب اس کے روپ میں پھر سے آنے والا ہے۔

"ہم اس وقت جوزف کی باتوں کو مذاق سمجھتے تھے، اس کا تمسخر اڑایا کرتے تھے، اسے نیم پاگل اور خبطی قسم کا انسان سمجھتے تھے مگر اب ہم پر عیاں ہو چکا ہے کہ وہ سچ کہتا تھا ڈین کی بدروح اس کے جسم میں سرایت کر چکی ہے، اسے برسوں بعد پھر سے لوگوں کا خون پینے کی عادت پڑھ چکی ہے، ہماری زندگیاں سخت خطرے میں ہیں۔ وہ لوگ سمجھدار تھے جو اس علاقے کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں، سچی بات تو یہ ہے کہ اب میں نے بھی یہاں سے نقل مکانی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے اس آسیب کا شکار کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال میں نے چرچ کے پادری کے مشورے سے اگلے اتوار کو بھی چرچ میں ایک خصوصی عبادت کروانے کا اہتمام کیا ہے اِس عبادت میں اس خونی آسیب سے نجات کے لیے خصوصی دعائیں کی جائیں گی۔ میں جانتا ہوں کہ قصبے کے کچھ افراد کسی آسیب کو نہیں مانتے مگر یاد رکھو جو آسیب کو نہیں مانتا وہ اسے نہیں چھوڑے گا، ابھی تک کے واقعات سے بھی یہی اندازہ ہو رہا ہے۔ انتھونی ہمارے آباؤاجداد کا مذاق اڑایا کرتا تھا، وہ پانچ سو برس پرانے کسی آسیب کی کہانی کو محض ہمارے آباؤاجداد کی ذہنی اختراع قرار دیتا تھا مگر پھر کیا ہوا سب سے پہلے وہی اس آسیب کا شکار ہو گیا اور اس کے بعد رابرٹ اور مارش بھی مارے گئے، وہ بھی کسی آسیب اور بھوت پر یقین نہیں رکھتے تھے مگر اب بہت سے افراد کو علم ہو چکا ہے کہ بدروح ہماری زندگی کی ایک حقیقت ہے تاہم اس پر یقین وہی رکھتا ہے جس کا اس سے سامنا ہوتا ہے اور وہ لوگ بھی خوش قسمت ہوتے ہیں جو اسے دیکھنے کے بعد زندہ بچ جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے ابھی تک جوزف کے بھوت کو دیکھا ہے میرا ان کو مشورہ ہے کہ وہ جلد از جلد اس علاقے کو چھوڑ کر چلے جائیں کیونکہ ہمارے بڑوں نے ہمیں بتایا ہے کہ جس کسی کو وہ آسیب دکھائی دے گیا سمجھ لو پھر اس کی موت یقینی ہے بچنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ آسیب کو دیکھنے والا شخص اس علاقے سے نقل مکانی کر جائے۔ مجھے ابھی تک وہ نہیں دکھا ورنہ میں کب کا یہ علاقہ چھوڑ کر جا چکا ہوتا۔ میرا مقصد آپ کو خوفزدہ کرنا نہیں ہے، میں تو آپ کو حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں اور یہ سچ ہے کہ ہم سب اس وقت سخت خطرے میں ہیں، کسی بھی وقت کوئی سانحہ رونما ہو سکتا ہے اس لیے اپنا اور اپنے بچوں کا خاص خیال رکھیے گا، آپ کا خیر خواہ۔" لارڈ ہنگس اتنا کہہ کر اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔

"یہ لارڈ ہنگس ہے جیکب بھی اسی کا ملازم ہے نا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"ہاں مجھے اس کے بارے میں علم ہے۔" موریس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مگر یہ اپنی وضع قطع سے تو باشعور آدمی دکھائی دیتا ہے، مجھے حیرت ہے کہ یہ بھی بھوت پریت پر یقین رکھتا ہے۔" ڈیوڈ نے متحیر لہجے میں کہا۔

"کسی کی وضع قطع سے اس کے شعور اور ذہنی بلاغت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اب دیکھو نہ بظاہر تو جوناتھن بھی ایک باشعور انسان دکھائی دیتا ہے مگر اس نے شیرف کو جو رپورٹ ارسال کی ہے اس نے اس کی ذہنی حالت و پسماندگی کا پول کھول دیا ہے....." مورس نے پرخیال لہجے میں کہا۔

اسی اثنا ان کی توجہ سامنے کی جانب مرکوز ہوگئی جوناتھن واپس آتا دکھائی دیا تھا مگر اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔

"سب افراد سے تو ملاقات نہیں ہوسکی کیونکہ کچھ افراد قصبے سے نقل مکانی کر چکے ہیں تاہم میں نے تقریباً پچاس افراد کو آپ سے ملنے کا کہہ دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ اس وقت وہ عبادت میں مصروف ہیں اس لیے یہاں سے فارغ ہوکر وہ اپنا بیان دینے پولیس اسٹیشن پہنچ جائیں گے۔"

"مگر میں تو آپ کے کہنے پر ہی یہاں آیا تھا۔" مورس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"معذرت چاہتا ہوں، مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ آج خصوصی عبادت کا پروگرام اتنا طویل ہوجائے گا ورنہ عام طور پر اس وقت عبادت ختم ہوجاتی ہے شاید آج خصوصی دعا ہے۔ دراصل جب سے اس آسیب کا قصہ شروع ہوا ہے لارڈ ہنگس کی جانب سے اکثر اس قسم کی عبادت کے پروگرام منعقد کروائے جاتے ہیں، یہ چرچ بھی انہوں نے اپنے ذاتی خرچ پر تعمیر کروایا تھا اور پادریوں کے اخراجات وغیرہ بھی وہی برداشت کرتے ہیں۔" جوناتھن نے بتایا۔

"ٹھیک ہے تو پھر ہم واپس جارہے ہیں، میں نے کل آپ کے ذمے ایک اور کام بھی لگایا تھا، کیا وہ ہوگیا ہے۔" مورس نے اس بار ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"جی مجھے یاد ہے آپ نے ان افراد کے سیل فون نمبر مانگے تھے جو یہ علاقہ چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے ہیں۔ میں نے دو پولیس والوں کی ڈیوٹی لگادی ہے وہ آج ان افراد کے قصبے میں موجود رشتے داروں سے مل کر ان کے سیل فون نمبر حاصل کرلیں گے۔ آپ کو شام تک لسٹ مل جائے گی فی الحال مجھے اجازت دیں مجھے بھی ذرا اس خصوصی عبادت میں شرکت کرنی ہے۔" یہ کہتے ہوئے سارجنٹ جوناتھن واپس مڑ گیا۔

"آؤ ڈیوڈ۔" مورس نے بھی مڑتے ہوئے کہا اور پھر وہ پولیس اسٹیشن کی جانب چل پڑے۔

وہ دن سارجنٹ مورس نے کافی مصروفیت میں گزارہ اور جوزف کو دیکھنے کے دعوے داروں سے پولیس اسٹیشن میں ملاقات کی اور سب کو اپنے کمرے میں الگ الگ بلاکر ان سے پوچھ گچھ کی۔ اس تفتیش میں اس پر کچھ نئے انکشافات بھی ہوئے تھے۔

شام تک مورس کو ان افراد کے سیل فون نمبر بھی مل گئے جو آسیب کے خوف سے اس علاقے سے نقل مکانی کر گئے تھے۔ مورس نے ان میں سے بھی کافی افراد سے فون پر بات کرلی تھی۔

اس دن کی پوچھ گچھ کے بعد مورس کو لگنے لگا تھا کہ اب اس کی تفتیش نے درست راہ متعین کرلی ہے اور وہ جلد ہی اس کیس کو حل کرلے گا۔

دن بھر کی مصروفیت کے بعد رات کا کھانا کھا کر ڈیوڈ اور مورس جلدی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اس رات تھکاوٹ کی وجہ سے انہیں جلدی نیند آگئی تھی تاہم رات دو بجے کے قریب کھٹکے کی آواز سن کر مورس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی آنکھ یونہی نہیں کھلی تھی، کوئی غیر معمولی بات ضرور ہوئی تھی۔ کمرے میں نیلے رنگ کا چھوٹا سا بلب روشن تھا۔ باقی لائٹس بند تھیں اس نے ایک طرف موجود ڈیوڈ کے بستر کی جانب نگاہ دوڑائی۔

"سر، وہ کھڑکی کے سامنے کھڑا ہے۔" ڈیوڈ نے سرگوشی کی گویا ڈیوڈ اس سے پہلے جاگ چکا تھا۔

سارجنٹ مورس نے گردن گھما کر کھڑکی کی جانب دیکھا، شیشے میں اسے صرف اتنا دکھائی دیا کہ باہر کوئی کھڑا ہوا تھا اور شاید کھٹکے کی آواز بھی کھڑکی سے ہی آئی تھی۔ چھوٹے بلب کی نیلگوں روشنی میں اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کی، وہ کھڑکی کے دوسری طرف موجود اس ہیولے کی شکل تو نہیں دیکھ سکا مگر اس کے لمبے رین کوٹ اور سر پر موجود گول ہیٹ کو دیکھنے میں کامیاب رہا۔

"سر، جوزف یا اس کا بھوت۔" ڈیوڈ نے دوبارہ سرگوشی کی۔

"اسے جانے نہیں دینا ڈیوڈ شاید ابھی اسے اندازہ نہیں ہوا کہ ہم جاگ چکے ہیں۔ تکیے کے نیچے سے اپنا پسٹل نکال لو، یہ ہمارے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے یہ ہمیں بھی مارنے کے لیے آیا ہو۔" مورس نے

سرگوشیانہ لہجے میں کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اس نے جان بوجھ کر کھڑکی میں کھٹکا پیدا کیا ہے، وہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اسے دیکھ لیں اور اس کے بعد خوفزدہ ہو جائیں، وہ کھڑکی سے ہٹ گیا ہے شاید اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ ہم نے اسے دیکھ لیا ہے۔'' یہ کہتے ہی ڈیوڈ بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور تکیے کے نیچے سے اپنا ریوالور نکالتے ہی ایک ہی چھلانگ میں دروازے تک پہنچ گیا۔

مورس نے بھی اس کی تقلید کی۔ اس نے بھی اپنا ریوالور نکال لیا اور پھرتی سے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ ڈیوڈ کی طرح اس کے پاس بھی جوتے پہننے کا وقت نہیں تھا۔ رات کے گہرے سکوت میں اسے بھاگتے قدموں کی آواز بہ آسانی سنائی دے رہی تھی، وہ تیزی سے کمرے سے نکل کر لان میں آ گیا۔ باہر پولیس اسٹیشن کی کچھ لائٹس آن تھیں اس لیے دھند کے باوجود دکھائی دے رہا تھا۔ مورس نے ایک طرف ڈیوڈ کو دیکھا جو دیوار پھاند رہا تھا شاید وہ ہیولا بھی اس دیوار کو پھاند کر اندر داخل ہوا تھا اور اسی راستے سے فرار ہوا تھا اسی لیے ڈیوڈ بھی اس کے پیچھے لپکا تھا۔ مورس جانتا تھا کہ ڈیوڈ دوڑ کا چیمپئن رہ چکا ہے اس لیے وہ اس ہیولے کو جا لے گا۔ تاہم اس پتھریلی جگہ پر ننگے پاؤں دوڑنا کسی ٹریک پر دوڑنے سے خاصا مختلف ثابت ہو سکتا تھا اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ اصولی طور پر مین گیٹ کے پاس کسی پہرے دار کو ہونا چاہیے تھا۔ تاہم پولیس اسٹیشن کے دروازے پر اس وقت کوئی پہرے دار نظر نہیں آ رہا تھا اسی لمحے اسے فائر کی آواز سنائی دی تو وہ بھی تیزی سے دوڑتا ہوا مین گیٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گیٹ کا چھوٹا دروازہ اندر سے کھولا اور پھر برق رفتاری سے باہر نکل گیا۔ پولیس اسٹیشن کے آس پاس کافی دور تک چٹیل میدان تھا جبکہ پچھلی جانب خاصی دور تک پھیلا ہوا درختوں کا جھنڈ تھا۔ یہاں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا اس لیے دھند کی وجہ سے زیادہ دور تک دیکھ پانا ممکن نہ تھا اسے ڈیوڈ کہیں دکھائی نہیں دیا وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ ڈیوڈ کی وجہ سے اسے کچھ تشویش بھی لاحق تھی مگر چند ثانیوں بعد ہی اسے دھند میں سے ڈیوڈ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔

''وہ نکل گیا، میں نے اس پر آخری آپشن کے طور پر فائر بھی کیا تھا مگر وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔'' قریب آتے ہی ڈیوڈ نے اپنی بے ترتیب سانسوں کے ساتھ کہا۔

''حیرت ہے میرا تو خیال تھا کہ تم اسے پکڑ لو گے، تم دوڑ کے چیمپئن رہ چکے ہو، اگر وہ اس کے باوجود تمہارے قابو میں نہیں آیا تو مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ کہیں واقعی کوئی بھوت تو نہیں تھا؟'' مورس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''سر، میں اسے پکڑ لیتا اگر میں اس کا کسی سیدھے ٹریک پر پیچھا کر رہا ہوتا مگر درختوں کے جھنڈ میں اس کے پیچھے جانا حماقت ہی تھی۔ وہ اس جنگل میں بنے راستوں اور پگڈنڈیوں سے واقف تھا اور میں انجانے میں کانٹوں میں الجھ کر زخمی ہو سکتا تھا ویسے بھی میں ننگے پیر تھا۔'' ڈیوڈ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''اونہہ۔'' مورس نے ڈیوڈ کا جواب سن کر ہنکارا بھرا۔

''سر، میرا خیال ہے کہ ہمیں اندر چلنا چاہیے، سردی کی وجہ سے میرے پیر سُن ہو رہے ہیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''آؤ سارجنٹ۔'' مورس نے کہا اور پھر واپس مڑ گیا۔ مین گیٹ سے پولیس اسٹیشن کے اندر داخل ہوتے ہی اس بار اس کا سامنا گیٹ پر موجود دونوں اہلکاروں سے ہو گیا شاید فائر کی آواز نے انہیں چونکنا کر دیا تھا اور وہ اس کمرے سے باہر نکل آئے تھے جہاں وہ اپنی ڈیوٹی سے غفلت برتتے ہوئے آرام فرما رہے تھے۔

''تم دونوں کہاں تھے؟ تمہیں تو گیٹ کے پاس موجود کیبن میں ہونا چاہیے تھا، اس جگہ کوئی بھی پولیس اہلکار اپنی ڈیوٹی درست طریقے سے نہیں دے رہا، یہ پولیس اسٹیشن ہے یا کوئی چڑیا گھر۔ ایک شخص پولیس اسٹیشن کی دیوار پھاند کر ہمارے کمروں کی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہوا تھا اور یہاں کے سیکیورٹی اہلکار آرام سے کمرے میں سو رہے تھے۔ یہ سارجنٹ جوناتھن کہاں ہے اور باقی اہلکار بھی دکھائی نہیں دے رہے۔'' مورس نے غصیلے لہجے میں ان دونوں کو مخاطب کیا۔

''سر...... سارجنٹ جوناتھن اس وقت یہاں نہیں ہوتے، وہ اپنے گھر چلے جاتے ہیں، ان کا گھر اسی قصبے میں ہے باقی اہلکار بھی اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ رات کے وقت صرف ہم دونوں ہی یہاں ہوتے ہیں کیونکہ ہم اس قصبے سے تعلق نہیں رکھتے، ہمارا یہاں ٹرانسفر ہوا ہے۔ ویسے سر کون آیا تھا پولیس اسٹیشن کی دیوار پھاند کر اور کیا یہ فائر کی آواز آپ کے ریوالور کی تھی؟'' ایک پولیس اہلکار نے اس کے اور ڈیوڈ کے ہاتھوں میں موجود ریوالور کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جو بھی آیا تھا اب چلا گیا ہے اور اب تم دونوں ڈیوٹی کرو گے، آج کے بعد میں یہاں اس قسم کی غیر ذمے داری برداشت نہیں کروں گا، حد ہوتی ہے ہر چیز کی۔" یہ کہتے ہوئے مورس اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا، ڈیوڈ نے بھی اس کی تقلید کی۔

مورس نے کمرے میں آکر اپنے سامان میں سے ایک ٹارچ نکالی اور پھر باہر نکل آیا، ڈیوڈ بھی اس کے پیچھے کمرے سے باہر آگیا۔ تاہم اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات موجود تھے۔ "کھڑکی کے اس طرف باہر والی سائڈ کی لائٹ خراب ہے شاید، میں نے صبح بھی چیک کی تھی۔" مورس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر جھک کر کھڑکی کے آس پاس کا ٹارچ کی روشنی میں جائزہ لینے لگا۔

"سر شاید آپ وہ خط تلاش کر رہے ہیں جو یہاں کچھ دیر قبل کھڑا شخص مع اپنے ایڈریس چھوڑ کر گیا ہے۔" ڈیوڈ سے رہا نہ گیا اور وہ اس سچویشن میں بھی مذاق کرنے سے باز نہ آیا۔

اس کی بات سُن کر مورس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔

"سر میرا خیال ہے کہ اس کھڑکی کے پاس سے اب کچھ نہیں ملنے والا، ہمیں سونا چاہیے اب لکیر پیٹنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔" ڈیوڈ اسے مسکراتے دیکھ کر بولا۔

"کبھی کبھی لکیر پیٹنے سے بھی فائدہ ہو جاتا ہے سارجنٹ۔" مورس نے کھڑکی کے بالکل پاس سے ایک ادھ جلا ہوا سگریٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ دیکھو، یہ سگریٹ ہے۔" اس نے سگریٹ ڈیوڈ کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"سر معاف کیجیے گا میں نے کب کہا ہے کہ یہ سگار ہے۔" ڈیوڈ نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"تمہاری حسِ مزاح آج کل کچھ زیادہ ہی پھڑکنے لگی ہے۔ میں نے تم سے سگریٹ کے بارے یونہی بات نہیں کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ سگریٹ جیکب کا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جس وقت وہ پوچھ گچھ کے لیے ہمارے پاس آیا تھا تو اسی برانڈ کا سگریٹ پی رہا تھا۔"

"سر، اس برانڈ کا سگریٹ تو بہت سے لوگ پیتے ہوں گے پھر آپ نے جیکب کا نام ہی کیوں لیا؟" ڈیوڈ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں نے سگریٹ دیکھ کر جیکب کا نام ہی کیوں لیا ہے اس کی بھی ایک وجہ ہے، تمہیں یاد ہوگا جب جیکب ہمارے سامنے پیش ہوا تھا تو اس نے آدھا سگریٹ پی کر زمین پر پھینک دیا تھا اور پھر اپنے پاؤں سے مسل بھی دیا تھا۔ آدھا سگریٹ پی کر پھینک دینا اور پھر پاؤں سے مسل دینا یہ عادت ہر کسی کو نہیں ہوتی ہے۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" ڈیوڈ کے حلق سے بے اختیار نکلا۔ "مگر وہ یہاں کس لیے آیا تھا، کیا وہ ہمیں مارنے کے لیے آیا تھا؟"

"نہیں وہ ہمیں مارنے کے لیے نہیں آیا تھا۔ وہ اچھی طرح یہ بات جانتا ہے کہ کسی پولیس والے کا قتل ہونے کے بعد اس علاقے میں کتنے اعلیٰ پیمانے پر تفتیش شروع ہو جائے گی اس لیے وہ ہمیں مارنے نہیں ڈرانے آیا تھا، اس نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو جوزف پہنتا تھا یعنی رین کورٹ اور سر پر گول ہیٹ، شاید اس کا خیال تھا کہ ہم خوفزدہ ہو جائیں گے اور یہ تسلیم کر لیں گے کہ جوزف نامی مقتول کے مردہ جسم میں واقعی کسی ڈین نامی پانچ سو برس پرانے بھوت کی روح حلول کر گئی ہے اسی لیے اس نے جان بوجھ کر کھڑکی کو کھٹکھٹا کر ہمیں بیدار کیا تھا پھر جیسے ہی اسے علم ہوا کہ ہم نے اس کا ہیولا دیکھ لیا ہے وہ فوراً فرار ہو گیا کیونکہ اس کا مقصد پورا ہو گیا تھا وہ ہمیں محض خوفزدہ کرنا چاہتا تھا اسی لیے اس طرح کی حماقت کر بیٹھا، اس کا خیال تھا کہ ہم بھی اس قصبے کے باسیوں کی طرح احمق ہیں۔"

"سر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جوزف واقعی مر چکا ہے اور انتھونی سمیت یہ سارے مرڈر جیکب کر رہا ہے۔" ڈیوڈ نے تیز لہجے میں کہا۔

"کل صبح ہم جیکب کو اٹھا لیں گے اور پولیس اسٹیشن میں اس سے تفتیش بھی کریں گے۔" مورس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ باقی کے قتل کے چاروں چشم دید گواہ بھی جیکب سے ملے ہوئے ہیں کیونکہ صرف انہوں نے ہی جوزف کی شکل دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے ورنہ ان کے علاوہ جن افراد نے جوزف کو ویسے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا ان میں سے کافی افراد سے میں نے اچھی طرح پوچھ گچھ کی ہے، کسی نے بھی جوزف کی شکل نہیں دیکھی بس اندھیرے اور دھند میں رین کورٹ اور گول ہیٹ پہنے کسی شخص کو دیکھ کر یہ یقین کر لیا کہ وہ جوزف ہی تھا باقی کا کام ان کے ذہنوں میں موجود نفسیاتی خوف کی وجہ سے ہوا تھا۔ انہوں نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ انہوں نے جوزف کو دیکھا ہے، بیان لینے والا جوناتھن بھی ایک توہم پرست انسان ہے اس لیے اس نے بھی ان کی باتوں پر یقین کر لیا اور تفصیلی پوچھ گچھ

کی ضرورت محسوس نہ کی ورنہ جوزف کو دیکھنے کے دعوے داروں اور قتل کے چشم دید گواہوں کے بیان میں فرق تلاش کرنا بہت آسان تھا۔''

''میرے خیال میں جیکب سے ملنے کے بعد ہم اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمیں دکھائی دینے والا ہیولا اسی کا تھا یا نہیں۔'' ڈیوڈ نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔

''وہ کیسے؟'' مورس نے چونک کر پوچھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ میں بہت تیز دوڑتا ہوں۔ مجھے اپنے پیچھے آتا دیکھ کر وہ ہیولا بھی بہت تیزی سے درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جنگل میں داخل ہونے کے بعد بھی بدحواسی کے عالم میں تیزی سے بھاگا ہوگا اور ایسی صورت میں اس کے چہرے پر خراشیں ضرور آئیں ہوں گی۔ میں نے آج صبح اس جھنڈ کے اندر داخل ہو کر وہاں کا جائزہ لیا تھا، وہاں جگہ جگہ خاردار اور بلند و بالا جھاڑیاں موجود ہیں۔''

''تم درست کہہ رہے ہو اگر وہ واقعی جیکب ہی تھا تو پھر یہ ممکن ہے کہ تیز رفتاری اور بدحواسی کی وجہ سے بھاگتے ہوئے وہ جھاڑیوں وغیرہ میں الجھ گیا ہو رین کورٹ کی وجہ سے بازو وغیرہ تو خراشوں سے بچ سکتے ہیں مگر چہرہ نہیں بچ سکتا۔ صبح اس معاملے کو دیکھ لیں گے فی الحال کچھ دیر سو لیتے ہیں۔ صبح جوناتھن کے ذریعے جیکب کو بلوا لیتے ہیں۔ اب جیکب سے ذرا ٹیڑھے طریقے سے پوچھ گچھ کرنی پڑے گی اور تم اس کام میں بہت ماہر ہو۔''

''آپ بالکل بے فکر رہیں، میں اس سے سب کچھ اگلوا لوں گا۔''

☆☆☆

اگلے دن ابھی وہ بیدار ہی ہوئے تھے کہ جوناتھن ان کے کمرے میں آدھمکا۔ مورس کو اس کی آمد پر حیرت نہیں ہوئی تھی، وہ جانتا تھا صبح پولیس اسٹیشن میں قدم رکھتے ہی اسے رات والے واقعے کے بارے میں اطلاع مل جائے گی۔

''مجھے رات والے واقعے کا علم ہوا ہے۔'' توقع کے مطابق اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب آپ کی جان کو بھی خطرہ ہے۔''

''سارجنٹ جوناتھن ہمارے لیے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اپنی حفاظت کرنا جانتے ہیں اور یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ رات کو کسی بھوت وغیرہ کی آمد نہیں ہوئی تھی، وہ جو کوئی بھی تھا کھڑکی کے پاس کھڑا ہو کر سگریٹ پی رہا تھا اور اس کا مقصد ہمیں محض خوف زدہ کرنا ہی تھا، ورنہ اگر اسے ہمیں مارنا ہوتا تو سوتے میں ہم پر گولی چلانا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔ اصل قصور وار تو رات کی ڈیوٹی پر مامور پولیس اہلکار ہیں جو پہرا دینے کے بجائے آرام فرما رہے تھے۔''

''میں نے ان دونوں کی سرزنش کر دی ہے ویسے پولیس اسٹیشن کی دیوار پھاند کر اندر داخل ہونا خاصا عجیب لگتا ہے، وہ جو کوئی بھی تھا خاصا بہادر انسان تھا۔'' جوناتھن نے کہا۔

''آپ کے قصبے کے افراد ویسے تو خاصے بہادر ہیں، پولیس اسٹیشن میں داخل ہونے سے بھی نہیں ڈرتے مگر آسیب کی ایک کہانی سُن کر اتنا خوفزدہ ہونا مجھے حیرت میں مبتلا کر دیتا ہے۔'' اس بار ڈیوڈ بولا۔

''آپ ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے ورنہ جس جس نے جوزف کی تدفین میں شرکت کی ہے اور اس کے بعد اسے زندہ حالت میں بھی دیکھا ہے، اِس خوف کا ادراک وہی کر سکتا ہے۔'' جوناتھن نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''سارجنٹ میں نے کافی افراد سے بات چیت کی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ صرف انہی افراد نے جوزف کی شکل دیکھنے کا دعویٰ کیا ہے جن افراد نے اسے قتل کرتے ہوئے دیکھا ہے اور یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ قاتل نے ہمیشہ چشم دید گواہوں کو زندہ رہنے دیا ہے ورنہ عام طور پر ایسا نہیں ہوتا۔'' مورس نے کہا۔

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، کھل کر بات کریں۔'' جوناتھن نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میری رپورٹ پر شیرف اور آپ کو یقین نہیں آیا ہوگا مگر یہ حقیقت ہے کہ پانچ سو برس پرانے آسیب کا قصہ جھوٹ نہیں ہے۔''

''بس......'' مورس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے روک دیا۔ ''میں اتنی صبح سویرے کسی بھوت کا قصہ سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ آپ بس اس وقت اتنا کریں کہ کچھ پولیس والوں کے ساتھ جائیں اور جیکب کو گرفتار کر کے لے آئیں۔ مجھے اس پر رات والے معاملے پر شک ہے اور میں اس سے ذرا سختی سے تفتیش کرنا چاہتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ ہمارے کام میں مداخلت کی کوشش نہیں کریں گے۔''

''ٹھیک ہے میں ابھی جاتا ہوں۔ جیکب اس وقت اپنے گھر پر ہی ہوگا ویسے بھی مجھے شیرف کی جانب سے ہدایت کی گئی ہے کہ میں آپ کے ہر حکم کی پابندی کروں۔'' یہ کہتے ہوئے جوناتھن کمرے سے باہر نکل گیا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہی جوناتھن اور اس کے سپاہیوں کی واپسی ہوگئی۔ وہ جیکب کو گرفتار کرلائے تھے۔

جیکب بظاہر مطمئن نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا مگر مورس

کی تیز نگاہوں سے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی بے چینی کے تاثرات چھپ نہیں سکے تھے۔
''اِس نے پولیس کو دیکھتے ہی بھاگنے کی کوشش کی تھی۔'' جونا تھن نے کہا، تو مورس بے اختیار چونک پڑا۔
''اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہے تو پھر ہمارا اس پر شک سو فیصد درست ہے۔''
''آپ کیا بات کر رہے ہیں، مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں اپنے گھر میں تھا کہ پولیس مجھے گرفتار کرنے آگئی اسی گھبراہٹ میں...... میں نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔'' جیکب نے لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں کہا۔
''تمہیں پیشگی پتا چل گیا کہ پولیس تمہیں گرفتار کرنے آئی ہے؟'' ڈیوڈ نے غصیلے لہجے میں کہا۔
''میں نے کہا نا کہ پولیس کو دیکھ کر میں خوامخواہ گھبرا گیا تھا۔'' جیکب اس بار سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔
''تمہاری ساری گھبراہٹ اور کس بل کچھ ہی دیر میں نکل جائیں گے۔ اس کو اندر لے جا کر کرسی کے ساتھ رسیوں سے باندھ دو اور ڈیوڈ تم جاؤ اور اپنا کام شروع کردو۔'' مورس نے سخت لہجے میں حکم دیا۔
''یہ تم لوگ میرے ساتھ ٹھیک نہیں کر رہے، میں ایک باعزت امریکی شہری ہوں، میں تم کو نہیں چھوڑوں گا، میں تم پر کیس دائر کروں گا۔'' پولیس والے جیکب کو کمرے میں لے جانے لگے تو وہ چیختے ہوئے بولا۔ پولیس کے جوان جیکب کو زبردستی وہاں سے لے گئے، ڈیوڈ بھی ان کے ہمراہ تھا۔
ان کے جانے کے بعد مورس نے شیرف کا نمبر ملایا۔
کچھ دیر تک بیل کی آواز سنائی دیتی رہی پھر شیرف نے فون اٹینڈ کرلیا ہے۔
''ہیلو مورس کیسے ہو تم؟'' اس نے کہا۔ ''اور سناؤ کیس کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔'' شیرف نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔
''سر میں نے اسی سلسلے میں فون کیا ہے اصل میں میرے ذہن میں اس کیس کو لے کر کچھ الجھنیں ہیں جن کو صرف آپ کی مدد سے دور کیا جاسکتا ہے۔ مجھے اعلیٰ حکام سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں اور یہ معلومات آپ کے توسط سے حاصل ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔'' مورس نے کہا۔
''حکومت کے اعلیٰ حکام کا اس دور دراز کے علاقے میں ہونے والے قتل سے کیا تعلق ہے، میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا، یہ کس قسم کی معلومات ہیں؟'' شیرف نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔
''سر میرے ذہن میں بس ایک آئیڈیا ہے ورنہ ابھی میں وثوق سے خود بھی کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں بس یوں سمجھ لیں کہ ان معلومات کا یہاں ہونے والے قتل سے تعلق بن سکتا ہے۔''
''ٹھیک ہے، کہو تمہیں کس قسم کی معلومات درکار ہیں۔'' شیرف نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو مورس نے اسے تفصیل سے بتادیا کہ اسے کس قسم کی معلومات درکار ہیں۔
''ٹھیک ہے۔'' شیرف نے مفاہمت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں سو فیصد گارنٹی تو نہیں دے سکتا مگر پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں تمہاری مطلوبہ معلومات فراہم کردوں اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے کہ تم یہ معلومات کیوں حاصل کرنا چاہتے ہو۔ بہرحال میرے فون کا انتظار کرو، میں اپنے کچھ ایسے دوستوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں جو اس وقت اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ ممکن ہے کہ اس بارے میں ابھی کچھ معلوم ہوجائے۔'' یہ کہتے ہوئے شیرف نے رابطہ منقطع کردیا۔
مورس نے سیل فون اپنی جیب میں ڈالا اور بے قراری سے ٹہلنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ شیرف اس کی مطلوبہ معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائے گا۔
پولیس کے جوان ڈیوڈ اور جیکب کو تنہا چھوڑ کر باہر آچکے تھے۔ جیکب کی چیخوں کی آوازیں باہر آرہی تھیں۔
مورس خاموشی سے اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔
''ہیلو۔'' مورس نے فون کان سے لگاتے ہوئے بے چینی سے پوچھا۔
''تمہارا گمان درست ہے۔'' شیرف کی آواز سنائی دی۔ میں تمہیں پوری تفصیل بتادیتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے شیرف نے اسے وہ معلومات فراہم کردیں جن کی ڈیمانڈ مورس نے کی تھی۔ مورس نے شیرف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رابطہ منقطع کردیا۔ عین اسی وقت اسے ڈیوڈ کمرے سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دیا، وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس آگیا۔
''کیا اس نے کچھ بتایا ہے؟'' سارجنٹ مورس نے پوچھا۔
''ہاں اس نے سب کچھ بک دیا ہے ماسوائے ایک بات کے۔ بہرحال میرے ایک گھونسے سے اس کا ایک عدد دانت ٹوٹ گیا ہے۔'' ڈیوڈ نے جواب دیا۔
''کوئی بات نہیں۔'' مورس نے کہا۔ ''کوئی ہڈی وغیرہ تو نہیں ٹوٹی؟ دانت والا معاملہ میں سنبھال لوں گا۔''
''نہیں، میں نے اسے مارا کم اور دہشت زدہ زیادہ کیا

ہے اب وہ طوطے کی طرح فرفر بول رہا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈیوڈ نے جیکب سے حاصل کردہ معلومات مورس کو بتانا شروع کردیں۔

''وہ جس آدمی کے خوف سے اس کا نام نہیں لے رہا، مجھے اندازہ ہے کہ وہ کون ہوسکتا ہے بہرحال اگر جیکب اعترافِ جرم کررہا ہے تو اسے جوناتھن کے آفس میں لے آؤ، میں چاہتا ہوں کہ وہ اس کے سامنے ہی ساری حقیقت بیان کرے تاکہ اس بیوقوف آدمی کو بھی اپنی اس نادانی کا احساس ہوسکے کہ اگر وہ پہلے قتل کے بعد ہی درست طریقے سے تفتیش کرتا تو شاید باقی کے دو افراد کی جان نہ جاتی۔'' یہ کہتے ہوئے مورس، جوناتھن کے آفس کی جانب بڑھ گیا جبکہ ڈیوڈ، جیکب کو لانے کے لیے واپس مڑ گیا۔

کچھ دیر بعد ہی جیکب نے جوناتھن کے سامنے اپنا بیان دے دیا جسے سن کر جوناتھن کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ جیکب نے نہ صرف قصبے کے تین افراد کے قتل کا اعتراف کرلیا تھا بلکہ اس نے یہ بھی اعتراف کیا تھا کہ جوزف کی موت بھی شراب کی زیادتی کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے کسی کے کہنے پر اس کی شراب میں زہر ملایا تھا اور اس کی لاش بھی قبر سے اسی نے غائب کی تھی۔ لاش کو بعد میں جلا کر راکھ میں تبدیل کردیا تھا تاکہ جوزف کے آسیب کا ڈراما کامیابی سے کھیلا جاسکے، باقی افراد کے قتل کے جو چشم دید گواہ تھے وہ بھی اس کے ساتھی تھے اور انہوں نے یہ کام کسی سے پیسے لے کر کیا تھا۔ تاہم وہ ابھی بھی اس شخص کا نام لینے سے گریزاں تھا جس کے اشارے پر یہ سارا کھیل کھیلا گیا تھا۔

جیکب کا اعتراف سُن کر جوناتھن کے چہرے پر غصے اور خجالت کے ملے جلے تاثرات اُبھر آئے تھے شاید اب اسے بھی اس حقیقت کا درست ادراک ہوگیا تھا کہ اس نے شیرف کو آسیب والی رپورٹ ارسال کرکے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔

''تمہیں اس آدمی کا نام بتانا پڑے گا جس کے کہنے پر تم نے اتنے افراد کی جانیں لی ہیں۔ میں ہی احمق تھا جو تمہاری بھوت والی کہانی پر یقین کر بیٹھا۔ مجھ سے بڑا بیوقوف شاید اس پورے قصبے میں نہیں ہے۔'' جوناتھن نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

''اس معاملے میں، میں آپ سے پوری طرح متفق ہوں۔'' جیکب کے بجائے ڈیوڈ نے قطع کلامی کی تو مورس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

سارجنٹ جوناتھن نے ڈیوڈ کے طنز کا کوئی جواب نہ دیا، وہ بدستور جیکب کی جانب غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

''اس آدمی کا نام میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' مورس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس ساری گیم کے اصل ماسٹر مائنڈ کا نام ہے لارڈ ہنکس، اسی کے کہنے پر جیکب نے یہ سارے قتل کیے تھے۔ اس کھیل کا آغاز جوزف کی موت سے ہوا تھا جس کے بارے میں یہ خیال کرلیا گیا تھا کہ اس کی موت شراب پینے کی زیادتی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ درحقیقت اس کی موت شراب کی زیادتی سے نہیں ہوئی تھی بلکہ لارڈ ہنکس کے کہنے پر جیکب نے اس کی شراب میں زہر ملایا تھا۔ جوزف ہر کسی سے کہتا تھا کہ وہ سفلی علوم کا بہت بڑا ماہر ہے اور جب اس کی موت واقع ہوجائے گی تو وہ پانچ سو برس پرانے بھوت ڈین کی شکل میں پھر سے لوٹ آئے گا۔ یہ بات قصبے کے دیگر افراد کی طرح لارڈ صاحب بھی جانتے تھے اور اس نے اسی وجہ سے یہ سارا پلان ترتیب دیا تھا۔ اس نے جوزف کو مروا دیا اور پھر جیکب کے ذریعے انتھونی کو قتل کروانے کے بعد جیکب کے ذریعے پولیس کو یہ بیان دلوایا کہ اس نے جوزف کو یہ قتل کرتے دیکھا ہے، ظاہر ہے پولیس اور قصبے کے افراد اتنے بیوقوف بھی نہیں تھے کہ فوراً اس کہانی پر یقین کرلیتے مگر جب مزید دو افراد کی جان گئی اور اس بار بھی چشم دید گواہوں نے جوزف کو دیکھنے کا دعویٰ کیا تو قصبے میں خوف وہراس پھیل گیا۔ مجھے جوناتھن کی معصومیت پر بھی حیرت ہے۔ قتل کے بارے میں جن افراد نے بھی گواہی دی تھی، وہ سب لارڈ ہنکس کے ہی ملازم تھے اور مجھے اسی وقت یہ شک ہوگیا تھا کہ ممکن ہے کہ لارڈ ہنکس اس سارے کھیل میں ملوث ہو۔ میرا شک اس وقت یقین میں بدلنے لگا جب مجھے علم ہوا کہ قصبے کے جتنے افراد بھی بھوت یا آسیب کے خوف سے اس علاقے سے اپنا سب کچھ فروخت کرکے رخصت ہوئے ہیں ان کی تمام زمین کو ایک ہی شخص نے خریدا ہے اور اس کا نام ہے لارڈ ہنکس۔ لارڈ ہنکس نے یہ سارا کھیل یہاں کی زمین حاصل کرنے کے لیے کھیلا تھا مگر محض بھوت کے خوف سے تو کوئی یہ علاقہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتا اس لیے لارڈ ہنکس نے جوزف کے بعد بھی کچھ افراد کو قتل کروایا۔ چشم دید گواہوں کی جھوٹی گواہی کے بعد علاقے کے توہم پرست افراد خوف میں مبتلا ہونے لگے اور اسی خوف کی وجہ سے انہوں نے رات کے اندھیرے میں شکل دیکھے بغیر ہی دور سے ایک رین کوٹ اور گول ہیٹ پہنے شخص کو دیکھ کر یہ سمجھ لیا کہ وہ جوزف کا بھوت ہے حالانکہ وہ جیکب ہوتا تھا۔ قتل کے باقی چشم دید گواہ بھی جیکب کی طرح لارڈ ہنکس کی دولت کا شکار ہوئے تھے۔ لارڈ ہنکس قصبے کی زیادہ سے زیادہ زمین خریدنا چاہتا

تھا۔ عام حالات میں کوئی اس طرح اپنی زمین فروخت نہیں کرتا اسی لیے اس نے قصبے کے افراد کے ذہنوں میں راسخ پانچ سو برس پرانے بھوت کے افسانے کی تشہیر کی۔ اس نے یہاں کے افراد کی توہم پرستانہ سوچ کو پیشِ نظر رکھ کر یہ سارا پلان بنایا تھا اور وہ کافی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ کافی افراد نے اسے اپنی زمین فروخت کر دی تھی۔ وہ چرچ کو استعمال کر کے آسیب کی مزید تشہیر بھی کر رہا تھا تاکہ لوگوں میں خوف و ہراس کی فضا قائم رہے اور وہ اس علاقے کو چھوڑ کر چلے جائیں۔ جانے والے افراد کو جب لارڈ کی جانب سے ان کی زمین کی اچھی قیمت کی آفر دی جاتی تھی تو وہ زمین بھی فروخت کر دیتے تھے اور لارڈ کے شکر گزار بھی ہوتے تھے۔

''مگر لارڈ ہنکس کو یہ سب کرنے سے کیا فائدہ ہونے والا تھا؟'' جوناتھن نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس زمین میں کون سا سونا دفن ہے یا یہاں سے تیل نکلنے والا تھا جو وہ اس کو خریدنے کے لیے اتنا بے چین ہو گیا تھا۔''

''یہ سوال میرے ذہن میں بھی تھا اور اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے مجھے شیرف کو فون کرنا پڑا تھا۔ شیرف نے مجھے میری مطلوبہ معلومات فراہم کر دی ہیں۔ درحقیقت یہ امریکی علاقہ میکسیکو کے بارڈر پر ہے اور یہاں حکومت کی جانب سے امریکا اور میکسیکو کے درمیان حال ہی میں ایک معاہدہ طے پایا ہے جس کے مطابق اس علاقے میں ایک مشترکہ تجارتی منڈی قائم کی جائے گی۔ ایسے معاہدے ہمیشہ خفیہ رکھے جاتے ہیں کیونکہ اگر معاہدوں کو قبل از وقت اوپن کر دیا جائے تو پراپرٹی مافیا حرکت میں آ جاتی ہے اور فوراً ایسی جگہ کی ساری زمین خرید کر لاکھوں لگا کر کروڑوں کماتی ہے۔ میں نے جوناتھن کے توسط سے ان افراد کے سیل فون نمبر حاصل کر لیے تھے جو اس جگہ سے نقل مکانی کر چکے تھے اور ان سے فون پر بات کرنے پر مجھ پر انکشاف ہوا کہ سبھی افراد نے اپنی پراپرٹی لارڈ ہنکس کو فروخت کی ہے۔ مجھے لارڈ پر اسی وقت شک ہو گیا تھا مگر اس وقت میرے پاس لارڈ کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس لیے میں نے فوری طور پر کوئی کارروائی نہیں کی۔ تاہم جیکب نے اس دوران ہمیں خوفزدہ کرنے کی ایک احمقانہ اور بھونڈی کوشش کی جس کی وجہ سے یہ ہماری گرفت میں آ گیا اور اس نے سارا پول کھول دیا۔ اب اس کے ان ساتھیوں کو اور لارڈ ہنکس کو گرفتار کرنا آپ کی ذمّے داری ہے۔

''میرا خیال ہے کہ اب آپ ساری بات سمجھ چکے ہوں گے۔ دراصل لارڈ ہنکس کو کسی طرح حکومت کے منصوبے کا علم ہو گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لاکھوں کی زمین کروڑوں میں تبدیل ہونے والی ہے، وہ چاہتا تو یہاں کے افراد کو قانونی طریقے سے تین چار گنا زیادہ رقم کی آفر دے کر بھی زمین خرید سکتا تھا تاہم اس لالچی اور گھٹیا انسان نے آسیب والا طریقہ اختیار کر کے کم رقم خرچ کر کے یہ ساری زمین حاصل کرنا چاہی مگر اب جیل اس کا مقدر ہو گی۔''

''جی بالکل اور میں ابھی لارڈ ہنکس اور جیکب کے دوسرے ساتھیوں کو گرفتار کر کے لاتا ہوں۔'' سارجنٹ جوناتھن نے اٹھتے ہوئے کہا تو سارجنٹ مورس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اس جیکب کا بیان لکھ کر اس پر اس کے دستخط لے لو اور پھر اسے لاک اپ میں بند کر دو پھر میرے ساتھ ریڈ کے لیے چلنے کی تیاری کرو، سب جوان مسلح ہو کر ساتھ جائیں گے باہر موجود جوانوں کو بھی میرا حکم سنا دو۔'' سارجنٹ جوناتھن نے کمرے میں موجود دو پولیس اہلکاروں سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ کچھ ہی دیر میں اس کے احکامات کی تعمیل کر دی گئی۔ جیکب سے تحریری بیان پر دستخط لے لیے گئے اس بار جیکب نے اپنے بیان میں لارڈ ہنکس کے نام کا اضافہ بھی کر دیا تھا کیونکہ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ مورس کو حقیقت کا علم ہو چکا ہے، اب لارڈ کا نام چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

اس کام سے فارغ ہو کر جوناتھن اپنے سپاہیوں کے ہمراہ جیکب کے دیگر ساتھیوں اور لارڈ ہنکس کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ ہو گیا جبکہ ڈیوڈ اور مورس اپنے کمرے میں آ گئے۔

''اب یہاں ہمارا کام ختم ہو گیا ہے اس لیے کل واپسی کی تیاری کر لو۔'' سارجنٹ مورس نے ڈیوڈ سے کہا۔

''ٹھیک ہے ویسے میرا خیال تھا کہ ہمیں بھی جوناتھن کے ساتھ جانا چاہیے تھا، پتا نہیں یہ لارڈ کو گرفتار کر بھی سکے گا یا نہیں اور پھر اسے عدالت میں مجرم بھی ثابت کرنا ہے، معاملہ صرف گرفتاری پر ہی ختم نہیں ہوتا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''ہمارا کام تھا قاتل کا سراغ لگانا اور وہ ہم نے لگا لیا ہے جہاں تک عدالت کی بات ہے تو سارجنٹ جوناتھن نے ایک کام تو سمجھداری والا کیا ہے اور وہ یہ کہ جیکب سے اعترافِ جرم کا تحریری بیان لے لیا ہے اور اس بیان کے بعد اب لارڈ کا بچنا ناممکن ہی ہے۔'' سارجنٹ جوناتھن یہ کام آسانی سے کر لے گا۔ مورس نے وضاحت سے بتایا تو ڈیوڈ مطمئن نظر آنے لگا۔

❖❖❖
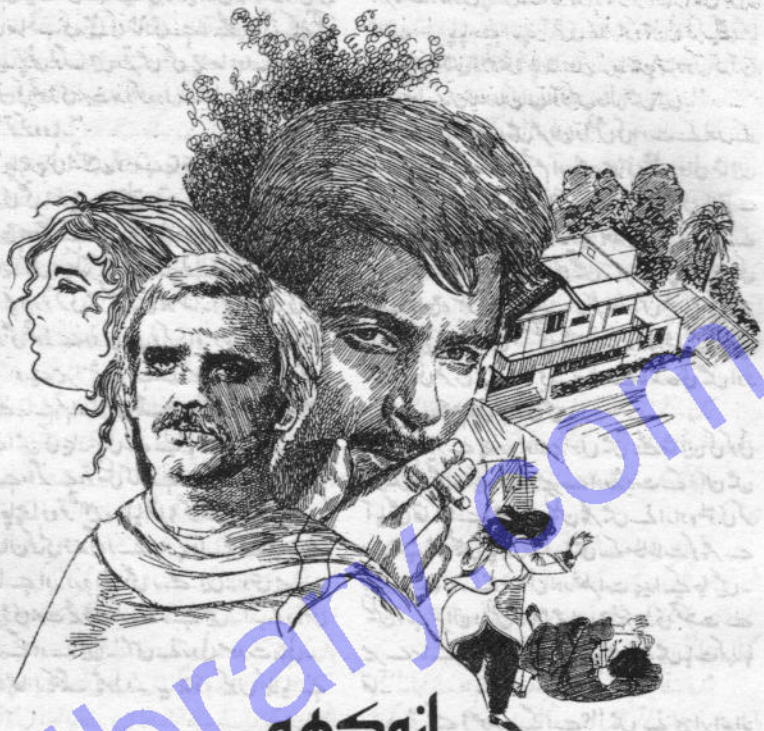
انوکھی میزبان

طاہر جاوید مغل

یادگار کردار ہوں یا مخصوص بام و در... مدتوں تک نگاہوں میں محفوظ رہ جاتے ہیں... سیدھے... سادے ویران سے راستے... ہم راز... شناسا چہرے... دور تک اور دیر تک ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں... قدم بہ قدم ساتھ نبھانے والے اچانک راستوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں... وقت کی دبیز تہوں میں چھپے ایک ایسے ہی کردار کی کھوج و جستجو...

ایک انوکھی میزبان کی یادگار و دلچسپ مہمان داری کا احوال......

میں عمران کے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اُداس موڈ میں نظر آرہا تھا۔ کھوئی کھوئی آواز میں گنگنا بھی رہا تھا۔
اُساں چڑیاں دا چنبا ہو، بابل اساں اُڑ جانا......
مجھے دیکھ کر اس نے گڑبڑانے کی اداکاری کی اور چپ ہوگیا۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے؟ یہ کوئی جنس کی تبدیلی والا معاملہ تو نہیں؟ یہ لڑکیوں والا گیت گا رہے ہو؟''
''چاچو! تم مذاق کرو تو مذاق۔ میں کروں تو پھکو پن۔ یہ لڑکیوں والا گانا نہیں، بہنوں، بیٹیوں والا گانا

ہے اور میں ایک بہن کے لیے ہی گا رہا ہوں۔ ساتھ والی گلی کے رفیق صاحب کی بیٹی کی شادی ہے۔ مجھے بھائی کہنے لگی ہے۔ سفید پوش لوگ ہیں، قرض بھی چڑھا ہوا ہے۔ چاہتا ہوں کہ ان کی تھوڑی بہت مدد کردوں۔"

"تو کردو نا۔"

"چاچو جانی! تمہیں تو سب پتا ہی ہے۔ امی جان نے کچھ رقم دی تھی انڈیا سے چلتے وقت۔ آٹھ دس ماہ میں وہ ساری خرچ ہو چکی ہے۔ اب تو اپنی دال روٹی مشکل ہو رہی ہے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم مجھے کہیں نوکری دلا دو؟"

"تم اور نوکری؟ کبھی نہیں ہوسکتا۔ جس کی نوکری کرو گے اس کو بھی تھوڑے دنوں میں نوکری ڈھونڈنے پر مجبور کر دو گے...... ویسے میرا مشورہ ہے کہ دوسروں کو الو بنانا چھوڑ دو...... مجھے پتا ہے تم اتنے بھی تنگ دست نہیں ہو۔ ابھی پچھلے ہفتے لالے امین کی بیمار بیوی کے لیے تم نے پندرہ بیس ہزار روپیا دیا ہے، اگر ہے، تو نیکی کما رہے ہو نا۔"

"چاچو! وہ تو تمہیں بتایا تھا نا کہ حاجی فراز صاحب ہیں۔ اللہ ان کو لمبی زندگی دے۔ اوپر والے نے بہت کچھ دے رکھا ہے اور دردِ دل بھی رکھتے ہیں۔ وہی میرے ذریعے تھوڑی بہت خیرات کرتے رہتے ہیں۔ اب تو وہ بھی عمرے پر گئے ہوئے ہیں۔" اس نے رونی صورت بنائی۔

"اچھا ایکٹنگ چھوڑو۔ یہ بتاؤ، کیوں بُلایا ہے مجھے؟"

اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "چاچو! سگریٹ پینے کی اجازت ہے؟"

"پی لو...... پی لو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"انکار بھی کرو گے تو میں نے کون سا باز آجانا ہے۔" اس نے زیرِلب کہا۔

"کیا بک رہے ہو؟"

"کہہ رہا ہوں۔ ایک دو مہینے میں بالکل باز آجانا ہے۔"

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ اس نے کش لے کر کہا۔ "چاچو! آج کوئی یاد آرہا ہے بُری طرح۔"

"مثلاً کون؟"

"وہی جو پاپا سے پیار کرتی تھی......"

"پاپا سے تو بہت سی پیار کرتی تھیں اور شاید اب بھی کرتی ہوں۔"

"میں اس خاص کی بات کر رہا ہوں جو موت کے کنویں میں ان کے ساتھ ہوتی تھی جو سرکس کے بلند، خطرناک جھولوں پر ان کے ساتھ "ڈیمانسٹریشن" کرتی تھی۔ شاہین...... پاپا نے اپنے آخری خط میں ان کا ذکر بھی کیا ہے۔ میں انہیں ڈھونڈنا چاہتا ہوں۔ جاننا چاہتا ہوں کہ آج پندرہ سولہ برس بعد وہ کہاں اور کس حال میں ہیں۔"

میری نگاہوں میں عمران دانش کی موت کے بعد کے مناظر گھوم گئے۔ سُبک جسم اور من موہنی شکل والی شاہین آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اس سے میری آخری ملاقات عمران دانش کی تدفین کے کچھ دیر بعد ہوئی تھی۔ میں نے عمران کی کچھ ذاتی اشیا اسے دی تھیں۔ عمران کا پرس، اس کی رسٹ واچ، سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر اور اس طرح کی کچھ دوسری چیزیں۔ روتی سسکتی شاہین نے وہ اشیا کسی قیمتی اثاثے کی طرح اپنی اوڑھنی کے پلو سے باندھ لی تھیں اور چپ چاپ ہجوم میں گم ہوگئی تھی۔

گزرے پندرہ سولہ برسوں میں مجھے شاہین کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ ایک دو بار میرے اور ثروت کے ذہن میں آیا بھی تھا کہ اسے ڈھونڈیں لیکن پھر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ تب میں نہیں چاہتا تھا کہ ماضی کے معاملات کو پھر سے چھیڑا جائے اور نئے مسائل اور خطرات پیدا کیے جائیں۔ لیکن اب عمران دانش کا بیٹا عمران جونیئر بڑی تمکنت سے میرے سامنے بیٹھا تھا اور شاہین کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"کیسے ڈھونڈو گے اسے؟" میں نے بیزار انداز میں پوچھا۔

"ایک کلیو ہے میرے پاس۔" وہ دبے دبے جوش سے بولا۔

"فرماؤ۔"

"میں نے گوگل کیا ہے۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"یہی تو آپ جناب کو پتا نہیں کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ آپ ذرا پرانے زمانے کے ہیں۔ نیٹ کے بارے میں بس ضروری باتیں جانتے ہیں مگر اصل گڑبڑ گوٹالا اور رنگینی تو غیر ضروری باتوں میں ہے۔ میں آپ کو بتانا شروع کردوں تو آپ جناب جوتا اتار لیں گے......"

"تم کچھ بکتے ہو یا میں واقعی جوتا اُتاروں؟"

اس نے سگریٹ بجھایا اور فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے گوگل پر ایک سرکس کے بوڑھے مالک کا پرانا انٹرویو ڈھونڈا ہے۔ اس طویل انٹرویو میں اس نے ایک جگہ پاپا کا ذکر بھی کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ جانباز شخص

تھا۔ بغیر حفاظتی جال کے جھولوں پر ایسے خطرناک کرتب کرتا تھا کہ لوگوں کی سانسیں رک جاتی تھیں۔ اس انٹرویو میں اس نے ایک جگہ شاہین صاحبہ کا مختصر ذکر بھی کیا ہے جو پاپا کی ساتھی تھیں۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ شاہین ایکروبیٹکس مکمل طور پر چھوڑ چکی ہے اور اب اپنی فیملی کے ساتھ گلبرگ تین کے علاقے میں کہیں رہتی ہے۔''

''کہاں ہے وہ انٹرویو؟''

عمران نے اپنے سیل فون پر مجھے وہ چار پانچ سال پرانا انٹرویو دکھایا۔ میرا اندازہ بالکل درست نکلا۔ یہ انٹرویو اسی سرکس کے مالک جان محمد صاحب کا تھا، جہاں عمران نے دھومیں مچائی تھیں۔ (جان صاحب کوئی تین سال پہلے انتقال کر چکے تھے)

میں نے اس انٹرویو کو دھیان سے سنا اور خاص طور سے وہ حصہ جس میں شاہین کا مختصر ذکر تھا۔

بالآخر میں نے عمران سے پوچھا۔ ''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

''چاچو یار! بے شک تم فزیکل ٹرینر ہو لیکن پولیس افسر تو ہو۔ گلبرگ تین کے علاقے میں تھوڑی سی چھان بین کراؤ اور پتا کرو کہ ماضی کی یہ معروف فن کارہ شاہین صاحبہ کہاں رہائش پذیر تھیں، یا ہیں۔''

میں نے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم بات ماننے والے تو نہیں ہو...... لیکن اونچ نیچ سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ دیکھو اس کہانی کے جو کردار ماضی کی دھند میں چھپ چکے ہیں، انہیں چھپا رہنے دو۔ انہیں ڈھونڈنے سے کئی مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ مسائل تمہارے لیے ہو سکتے ہیں اور ان کرداروں کے لیے بھی۔''

''ہو، ہائے۔'' اس نے عورتوں کی طرح اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''میرا چاچو جانی، المعروف تابش تابی اتنا محتاط اور مصلحت پسند کب سے ہو گیا؟ چاچو شاید تم بھول گئے ہو تم نے اور پاپا نے ڈر کا لفظ اپنی ڈکشنری سے نکال دیا تھا۔ تم خطروں کے کھلاڑی تھے اور تم نے اپنے کھیل کو دنیا سے منوایا تھا۔''

میں خاموش ہو گیا۔ میں جانتا تھا کہ بحث اور انکار کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ دو گھنٹے تک میرا دماغ چاٹے گا اور مانے گا پھر بھی نہیں۔ میں نے آدھے دل کے ساتھ رضامندی ظاہر کر دی۔

☆☆☆

ورزش میری زندگی کا معمول بن چکی تھی۔ میں نے اپنے گھر میں ہی ایک جدید جمنازیم بنا رکھا تھا۔ اس وقت بھی میں رننگ مشین پر تھا...... ایکسرسائز کر رہا تھا مگر ذہن کہیں اور کھویا ہوا تھا...... جب سے یہ افلاطون وارد ہوا تھا اس نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ اس کے آنے سے یادوں کے بے شمار دریچے کھل گئے تھے اور ہر دریچے میں سے درجنوں چہرے جھانک رہے تھے۔ سلطانہ، صفورا، جیلانی، جگت سنگھ اور پتا نہیں کون کون۔ عمران جونیئر نے انڈیا میں اپنے حالات کے بارے میں مختصراً جو کچھ بتایا تھا اس سے پتا چلا کہ عمران دانش کی وہ شادی انتہائی ناگزیر حالات میں ہوئی تھی اور عمران نے سات آٹھ سال میں اس ازدواجی زندگی کے بمشکل دو تین ماہ ہی گزارے ہوں گے۔ وہ ایک کرو یا مرو والی سچویشن تھی۔ افشاں نامی اس مسلم دوشیزہ سے عمران فوری نکاح نہ کرتا تو افشاں کی جان لے لی جاتی۔ اگر یہ کہا جائے تو بالکل بھی غلط نہ ہو گا کہ یہ شادی بھی عمران دانش کی انہی قربانیوں کا ایک تسلسل تھی جو وہ انسانیت کے لیے بلاتردد دیتا تھا۔ جہاں تک عمران دانش کے جذبات کا تعلق ہے مجھے بڑی اچھی طرح علم تھا کہ اس نے زندگی میں بس ایک ہی محبت کی۔ یہ شبانہ نامی لڑکی اس کی نہ ہو سکی اور زندہ بھی نہ رہ سکی۔ اس کے بعد عمران کبھی کسی کو چاہ نہیں سکا۔ ہاں اپنے مسخرے پن میں وہ بے شمار لڑکیوں کو اپنی سوہنی سی ہیر قرار دیتا رہا۔ اگر اس میں کوئی تھوڑا سا استثنا تھا تو وہ شاہین کے حوالے سے تھا۔ شاہین کے ساتھ اس کا لگاؤ گہرا اور پائیدار تھا لیکن محبت تو شاید یہ بھی نہیں تھی۔

فون کی بیل نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ رننگ مشین سے اتر کر میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف پولیس کا ایک مخبر سعادت علی تھا۔ یہ گلبرگ تین کی ایک کوٹھی میں ملازم تھا اور چلتا پرزہ تھا۔ میں نے سات آٹھ روز پہلے اسے یہ ''تلاش'' والا کام سونپا تھا۔ اس نے کہا۔ ''سر جی! ایک اچھی اطلاع ہے۔ لگتا ہے کہ مطلوبہ گھر کا کھوج مل گیا ہے۔''

''پوری بات کرو۔'' میں نے تحکم سے کہا۔

''آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے علاقے کے آٹھ دس پراپرٹی ڈیلرز سے رابطہ کیا۔ یہ طریقہ کارگر رہا۔ کل شام ایک ڈیلر نے بتایا کہ شاہین نام کی ایک خاتون مین بلیوارڈ میں رہائش رکھتی ہے۔ ابھی میں نے مطلوبہ جگہ پہنچ کر جو معلومات حاصل کی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ وہی شاہین صاحبہ ہیں۔''

''اندازے سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے

خشک لہجے میں پوچھا۔

''میں انہیں دیکھ نہیں پایا۔ ایک مقامی کا کہنا ہے کہ وہ شاید کچھ عرصے سے کہیں گئی ہوئی ہیں مگر فیملی کے باقی لوگ نظر آتے ہیں۔

انفارمر سعادت سے بات ختم کرکے میں کاؤچ پر نیم دراز ہوگیا۔ اب اس معاملے میں مجھے بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی۔ کئی سوال ذہن میں اُبھر رہے تھے۔ شاہین کہاں ہوگی؟ کیا اس نے شادی کرلی ہوگی؟ کیا اس کے بچے ہوں گے؟ اتنے عرصے بعد مجھے اور عمران دانش کے ہم شکل بیٹے کو دیکھ کر اس کے جذبات کیا ہوں گے؟

''یہ افلاطون جونیئر'' باپ ہی کی طرح پہاڑی ندی کے بہاؤ جیسا تھا۔ ہر ایک کو اپنی روانی میں بہالے جاتا تھا۔ ثبوت یہی تھا کہ اب میں بھی شاہین کو دیکھنا چاہ رہا تھا۔

☆☆☆

عمران میری کلٹس گاڑی میں تھا اور ہم گلبرگ جانے کے لیے نکلے تھے۔ گھر سے نکلنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ دائیں جانب دیکھ کر چہکا۔ ''دیکھو چاچو! پچھلے اپی سوڈ کی جھلکیاں۔''

میں نے سر گھما کر دیکھا۔ حسنات صاحب کا گھر نظر آرہا تھا۔ ان کی معصوم صورت بیٹی صوفیہ کو باکسر ''کمانڈو'' کے چنگل سے بچاتے بچاتے ہم پر انکشاف ہوا تھا کہ صوفیہ کا اصل دشمن تو اس کا امیر منگیتر واجد ہی ہے اور پھر ایک سنگین اتفاق کے تحت واجد، کمانڈو کے ہاتھوں ہی ہلاک ہوگیا تھا۔ پورا ایک برسٹ اس کے سینے میں لگا تھا۔ اب ان واقعات کو دو ماہ گزر چکے تھے۔ کمانڈو کو عمران نے قبائلی علاقے میں اوجھل کردیا تھا۔ پولیس ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ گئی تھی۔

عمران نے اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے چاچو یار...... مم...... میرا مطلب ہے چاچو جانی! محبت وہاں ہی کیوں ہوتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہیے۔''

''کیا مطلب؟''

''پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ جس طرح کمانڈو کے دل میں صوفیہ کا روگ موجود ہے، اسی طرح صوفیہ کے دل میں بھی کمانڈو کے لیے کہیں نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔ حالانکہ عرف عام میں کمانڈو کو لیاری کا بدمعاش کہا جاتا ہے۔''

میرا موڈ کچھ خوشگوار تھا۔ میں نے کہا۔ ''ہاں بھتیجے! بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ یہ محبت نامراد وہیں ہوتی ہے جہاں نہیں ہونی چاہیے۔ اب دیکھو نا کہاں سپر اسٹار مہوش حیات اور کہاں تم؟ وہ تو تمہیں جوتا بھی نہ دکھائے، اور......''

''ہائے...... ہائے۔ نہار منہ کیا یاد کرا دیا چاچو۔ معدے میں فوراً آنسوؤں کا نمکین پانی جمع ہونا شروع ہوگیا ہے۔ اب جلدی سے حلوہ پوری کا ناشتا نہ کروں گا تو معدہ آنسوؤں سے بھر جائے گا...... ہائے میرا معدہ۔''

اس نے ایک گلی میں گاڑی رکوائی۔ حلوہ پوری اور چنے کھائے۔ دکاندار ہم سے پیسے نہیں لے رہا تھا مگر عمران نے زبردستی دیے (مجھ سے لے کر) پھر ہم آگے روانہ ہوگئے۔ اب ہماری گفتگو کا رخ شاہین کی طرف مڑ گیا۔ شاہین کے ذکر سے ایک سنسنی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اسی دوران میں نجانے کیوں مجھے وہم سا ہوا کہ ایک گاڑی ہمارا پیچھا کررہی ہے مگر تھوڑا آگے جاکر وہ گاڑی اوجھل ہوگئی۔ یہاں رش بھی زیادہ تھا۔ عین ممکن تھا کہ کسی نے واقعی ہمارا پیچھا کیا ہو۔ بہرحال میں نے عمران سے اس شک کا ذکر نہیں کیا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد ہم ایک کشادہ کوٹھی کے مین گیٹ پر کھڑے تھے۔ عمران گاڑی کے اندر تھا۔ اس نے پی کیپ پہن رکھی تھی اور نیلے سن گلاسز بھی چڑھا لیے تھے۔ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ یہ اتوار کا ایک روشن اور خوشگوار دن تھا۔ دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ کال بیل کے جواب میں چھریرے بدن کی ایک نوجوان ملازمہ باہر آئی۔ میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ''شاہین صاحبہ گھر پر ہیں؟''

ملازمہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''کہاں گئی ہیں؟''

''آ...... آپ کون ہیں؟''

''میرا نام تابش ہے۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔ میرے پاس ان کا فون نمبر نہیں ورنہ کال کرکے آتا۔''

''وہ تو جی...... پاکستان میں نہیں ہیں۔ کوئی آٹھ دس مہینے ہوگئے۔ امریکا گئی ہوئی ہیں۔''

''اوہ۔'' میں نے ہونٹ سکیڑے۔

اتنے میں ایک سرو قد، سرخ و سپید لڑکی پورچ میں نظر آئی۔ ''کون ہے رانو۔'' اس نے بلند آواز میں پوچھا۔

''یہ کوئی صاحب ہیں۔ بڑی باجی سے ملنا چاہتے ہیں۔''

سرو قد لڑکی ماربل کے فرش پر ٹک ٹک چلتی گیٹ کی طرف آئی۔ اس کی عمر بیس بائیس رہی ہوگی۔ فیشن ایبل کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ شلوار ٹخنوں سے کافی اونچی تھی۔ سر پر مختصر اوڑھنی، بائیں ہاتھ میں قیمتی موبائل تھا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ مجھے لگا، یہ شاہین کی بیٹی ہے مگر نہیں۔ پندرہ سولہ برس پہلے تک تو شاہین غیر شادی شدہ تھی، اور یہ

بات میں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ لڑکی بھی مجھے دھیان سے دیکھ رہی تھی۔ ایک دم اس کے چہرے پر شناسائی کے آثار ابھرے۔ وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”کہیں تم...... میرا مطلب ہے...... آپ تابش صاحب...... تو نہیں؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ خوبرو لڑکی کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ اس نے مجھے سرتاپا دیکھا۔ میں نے شفیق لہجے میں کہا۔ ”اور تم...... میرے خیال میں...... شاہین کی بہن ہو۔“

اس نے ذرا توقف سے جواب دیا۔ ”جی ہاں...... چھوٹی بہن...... ماہین۔“

یہی وقت تھا جب لڑکی کی نگاہ میرے عقب میں گئی۔ عمران بھی گاڑی سے نکل کر گیٹ پر آن کھڑا ہوا تھا۔ عمران کو دیکھ کر ماہین نامی اس لڑکی کے چہرے پر ہیجانی تاثرات ابھرے۔ جو بھی عمران دانش کو جانتا تھا۔ عمران جونیئر کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا تھا۔ کچھ یہی کیفیت ماہین کی بھی ہوئی۔

”یہ...... یہ کون؟“ وہ خود کو سوال پوچھنے سے نہ روک سکی۔

”تمہارا کیا اندازہ ہے ماہین؟“ میں نے کہا۔

”یہ...... یہ ان کے...... بیٹے؟“

”ہاں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”یہ تو...... سیم ٹو سیم......“ وہ ہکلائی۔

صورتِ حال مناسب دیکھ کر عمران بھی آگے آ گیا۔ ”السلام علیکم جی۔“ اس نے اپنی خوب صورت بتیسی کی نمائش کی۔

وہ بس منہ میں منمنا کر رہ گئی۔ پھر ذرا سنبھل کر بولی۔ ”آ...... جائیے...... اندر آ جائیے۔“

”شکریہ۔“ میں نے کہا اور ہم دونوں اس کے عقب میں چلتے کوٹھی کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ کوریڈور میں جو دو تین تصویریں نظر آئیں وہ بروس لی اور جیکی چن وغیرہ کی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں کچھ ٹرافیاں اور انعامی کپ دکھائی دیے۔ بعدازاں ماہین نے بتایا کہ اس کا ایک کزن یہیں رہتا ہے اور اسے مارشل آرٹ سے بہت دلچسپی ہے۔

”تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ماہین۔“ میں نے اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے تم شاہین سے دس پندرہ سال چھوٹی ہو۔“

”جی ہاں۔“ اس نے شائستہ انداز میں جواب دیا۔ ”میرے اور آپی شاہین کے درمیان ایک بہن سدرہ ہے...... اور ایک بھائی تھا جو چھوٹی عمر میں فوت ہو گیا۔“ پھر وہ عمران کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”آپ تو ہو بہو عمران دانش صاحب کی کاپی ہیں۔ ہمیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ دانش صاحب نے کہیں شادی بھی کی تھی۔“

”جی، میری والدہ انڈیا کی رہنے والی ہیں اور یہ شادی جن حالات میں ہوئی تھی، وہ غیر معمولی تھے۔ میں نے اس بارے میں چاچو جی کو بتایا ہے......“

”میں نے عمران دانش صاحب کو بس ایک دو دفعہ ہی دیکھا تھا۔ اس وقت میں مشکل سے چھ سات سال کی ہوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کی شکل ہی نہیں آواز اور بول چال بھی عمران صاحب سے بہت ملتی ہے۔“

وہ شرمانے کی اداکاری کرنے لگا۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس شاہین کا اتا پتا نہیں تھا۔ نہ ہی خود کبھی شاہین نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ اب یہ جو کچھ بھی ہوا ہے عمران دانش کے اس فرزندِ ارجمند کی کوشش اور محنت سے ہوا ہے۔ اس نے کسی پرانے انٹرویو کی مدد سے یہ ایڈریس ڈھونڈا اور ہم یہاں آ پہنچے۔“

عمران نے لقمہ دیا۔ ”مجھے ازحد اشتیاق ہے شاہین صاحبہ سے ملنے اور دیکھنے کا۔ کافی عرصے سے ان کی خیالی تصویر میرے ذہن میں بنی ہوئی ہے۔ ان کی شادی......؟“ عمران نے دانستہ فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ماہین نے ایک لمبی سانس لی اور ذرا افسردہ لہجے میں بولی۔ ”نہیں جی۔ آپی نے شادی نہیں کی۔ سرکس والی مصروفیت تو انہوں نے عمران صاحب کی زندگی میں ہی چھوڑ دی تھی۔ پھر انہوں نے جمناسٹک کے ایک انٹرنیشنل کلب میں بطور ٹرینر ملازمت کر لی تھی۔ اب بھی ایک طرح سے وہ اسی کلب سے وابستہ ہیں۔ بلکہ ان دنوں امریکا میں ان کی موجودگی بھی اسی کلب کی وجہ سے ہے۔ اس کے علاوہ وہ یہاں لاہور میں ایک رفاہی ادارہ بھی چلاتی ہیں۔“

دل سے ایک ٹیس سی اٹھی۔ شاہین کا دلکش سراپا نگاہوں میں گھوم گیا۔ میرے خدشوں کے عین مطابق اس نے اپنی جوانی عمران کے نام کے ساتھ گزار دی تھی۔

عمران نے کہا۔ ”وڈیو لنک کے ذریعے بات ہو سکتی ہے آنٹی شاہین سے؟“

وہ اپنے شہد رنگ بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑس کر بولی۔ ”ہو سکتی ہے جی...... مگر اس وقت تو وہاں رات ہو گی۔ دو بجے کا ٹائم ہو گا۔ ویسے وہ جلدی اٹھ جاتی ہیں۔ اگر آپ تین چار گھنٹے ہمارے ساتھ رک جائیں تو میں آپ کی بات

گرا دیتی ہوں۔'' ماہین کے بولنے کا انداز دلکش تھا۔ گفتگو کے دوران میں وہ بار، بار اپنے بالوں کو کانوں کے پیچھے اڑستی تھی۔

اس کی گفتگو سے پتا چلا کہ منجھلی بہن افشاں کی شادی ہو چکی ہے۔ اب اس کوٹھی میں ماہین، اپنی آپی شاہین اور سگی خالہ کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ خالہ کو نچلا پورشن پسند نہیں لہٰذا وہ بالائی پورشن میں ہیں اور کافی بیمار ہونے کے باوجود بوقتِ ضرورت سیڑھیاں چڑھ اتر لیتی ہیں۔ ان کی قوتِ سماعت نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے اور وہ قریباً سارا وقت بستر پر ہی گزارتی ہیں (شاہین کی والدہ وفات پا چکی تھیں)

مجموعی طور پر مجھے یہ پیاری سی لڑکی بہت نفیس اور بااخلاق لگی۔ وہ جسمانی طور پر بہت متوازن اور چست بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ شاہین کی بہن تھی۔ اس نے اصرار کیا کہ ہم شام تک یہاں رہیں۔ شام کی چائے کے بعد وہ بڑی آپی شاہین سے ہماری بات بھی کرا دے گی۔

اتنی بڑی کوٹھی تقریباً سنسانی پڑی تھی۔ ملازمہ رانو اور ماہین کے سوا یہاں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ ماہین نے ہمارے لیے ایک پُرتکلف لنچ کا اہتمام کیا۔ کھانے کے کمرے میں بھی مارشل آرٹ سے متعلق دو تین جہازی سائز کی تصاویر نظر آئیں۔ اپنے کزن کے بارے میں ماہین نے بتایا کہ وہ کالج گیا ہوا ہے۔ کھانے کے دوران میں بھی ماہین سے سوال جواب ہوتے رہے۔ وہ جرنلزم کر رہی تھی۔ عمران نے پوچھا۔

''آنٹی شاہین کی وجہ سے آپ کو جمناسٹک وغیرہ میں دلچسپی پیدا نہیں ہوئی؟''

وہ نزاکت سے مسکرائی۔ ''نہیں، مگر ان کی وجہ سے کچھ اور چیزوں میں بہت دلچسپی پیدا ہو چکی ہے۔''

''مثلاً کیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''چلیں، پھر کبھی آپ کو بتاؤں گی۔'' وہ ادا سے بولی۔

کھانے کے بعد ہم ایک ہال نما کمرے سے گزر کر ایک چھوٹے کمرے میں آ گئے۔ یہاں دو بیڈز تھے۔ ایل ای ڈی وغیرہ بھی موجود تھی۔ وہ بولی۔ ''اگر آپ کو پسند ہو تو تھوڑا آرام کر لیں۔''

عمران کی زبان میں کھجلی ہوئی۔ ''ضرور جی، صبح کا ناشتا، دوپہر کا قیلولہ اور رات کا عشائیہ مجھے بہت پسند ہے۔ میری والدہ کہا کرتی ہیں کہ گرمیوں میں، میں اتنا لمبا قیلولہ کرتا تھا کہ دو تین بار مجھے بے ہوش سمجھ کر اسپتال پہنچا دیا گیا۔ اسی بنا پر کچھ دوست مجھے پان پسند کے وزن پر قیلولہ پسند کہنے لگے تھے۔''

وہ بولی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ قیلولے کی طرح آپ کو فالتو الفاظ کا استعمال بھی بہت پسند ہے۔''

''میں سمجھا نہیں جی؟''

''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ناشتا ہمیشہ صبح کا ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح قیلولے کے ساتھ ''دوپہر کا'' اور عشائیہ کے ساتھ ''رات کا'' لگانا ضروری نہیں۔''

''واہ، آپ تو مجھے احمد ندیم قاسمی کی فیملی سے لگی ہیں۔'' وہ مسکرایا۔

''شکریہ!'' اس نے ماتھے پر ہاتھ لے جا کر شاعرانہ انداز میں کہا۔

''تسلیمات!'' عمران نے بھی فوراً وہی انداز اختیار کیا۔ ''میرا تو دل چاہتا ہے کہ آپ سے اصلاح لی جائے۔ حالانکہ میں شاعری واعری نہیں کرتا۔''

''تو پھر اصلاح کس چیز کی لیں گے؟''

''یہی تو اصلاح لوں گا۔'' وہ فٹ سے بولا۔ ''ویسے، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ جلد ہی مجھے شاعری کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔'' اس کی نگاہ ماہین کے چہرے پر تھی اور لہجہ معنی خیز تھا۔

وہ بال سمیٹتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ہم آراستہ کمرے میں بیڈز پر نیم دراز ہو گئے۔

''چاچو! ویسے بڑی مست چیز ہے۔'' وہ سرگوشی میں بولا۔ ''چاروں شانے عاشق ہونے کو دل چاہ رہا ہے...... مگر پھر وہی مہوش والا پنگا سامنے آ جاتا ہے۔ وہ تو خودکشی فرما لے گی۔ اس کا مرنا اور میرا جینا دونوں حرام ہو جائیں گے۔''

اچانک ماہین دوبارہ نظر آئی۔ اب وہ شلوار قمیص کے بجائے شرٹ اور شارٹس میں تھی۔ سر سے اوڑھنی بھی غائب تھی۔ بال وہ پہلے ہی پونی ٹیل کی شکل میں باندھ چکی تھی۔ سیل فون مستقل اس کے ہاتھ میں تھا۔ ''آپ کا نیٹ آ رہا ہے؟'' اس نے شیریں آواز میں عمران سے پوچھا۔

عمران نے اپنا موبائل دیکھا۔ ''نہیں، مس ماہین۔''

''ذرا دکھائیے۔'' اس نے کہا۔ عمران نے موبائل اسے تھما دیا۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''انکل! آپ کا بھی نہیں آ رہا؟'' میں نے بھی نفی میں سر ہلایا۔ وہ میرا موبائل بھی چیک کرنے لگی۔ پھر اسی طرح دونوں موبائل پکڑے پکڑے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ''عمران صاحب!

ذرا دیکھیے یہ کیا سائن آرہا ہے آپ کے موبائل پر؟'' اس نے اسکرین پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

عمران اٹھ کر کمرے سے نکلا اور اس کے پاس پہنچا۔ تب ماہین نے لپک کر دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ اب میں کمرے کے اندر اور عمران باہر ہال کمرے میں ماہین کے پاس تھا۔ وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔ کوٹھی میں مکمل سناٹا تھا۔ ''آپ نے دروازہ کیوں بند کر دیا؟''

''تمہارے چچا کو ''لاک اپ'' کیا ہے، تاکہ تمہارے ساتھ اطمینان سے دو باتیں کرسکوں۔'' وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کا لہجہ ہی نہیں، لباس اور طور اطوار بھی بالکل مختلف نظر آرہے تھے۔ چہرے پر عجیب سی سرخی تھی۔ میں کمرے کی گرل دار کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

''میں کچھ سمجھ نہیں پارہا؟'' عمران نے حیرانی ظاہر کی۔

وہ صوفے پر بیٹھ کر آتشیں انداز میں گویا ہوئی۔ ''سمجھ تو تمہارا باپ بھی کچھ نہ پایا تھا اور نہ دوسرے اس کو سمجھ پائے تھے...... اور بڑی آپی بے چاری تو بالکل بھی نہیں۔ اس بے وفا کی خاطر اپنی زندگی روتی رہی...... خود کو برباد کرتی رہی۔ وہ اس کی ساری لائف کھا گیا...... اور اب...... اب تم آگئے ہو رہی سہی کسر نکالنے کے لیے...... کیوں آگئے ہو تم یہاں...... کیوں آگئے ہو وہی منحوس صورت لے کر؟''

''یہ آپ کس طرح کی باتیں کرنے لگی ہیں...... مم...... میرا مطلب ہے پندرہ سولہ برس پہلے جو کچھ بڑوں کے درمیان تھا، اس کا ہمیں کچھ پتا نہیں۔ ہم کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ......''

''میں سب کچھ کہہ سکتی ہوں، کیونکہ مجھے سب پتا ہے۔ وہ ہرجائی میری آپی کو برسوں تک دھوکے دیتا رہا۔ اس کو سپنے دکھاتا رہا اور وہ بے چاری دیکھتی رہی...... اور روتی رہی۔ اس لاچار کو تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہاری طرح اس عمران دانش کی اور کتنی اولادیں ہیں...... اور کتنی شادیاں ہیں۔ جائز اور ناجائز کیا کیا کر رکھا ہے اس نے؟''

چند لمحے کے لیے عمران کا چہرہ تمتما گیا۔ وہ بولا۔ ''دیکھو ماہین! بڑوں تک نہ پہنچو...... یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''اور جو کچھ وہ تمہارا باپ میری آپی کے ساتھ کرتا رہا اور دوسری عورتوں کے ساتھ کرتا رہا، وہ ٹھیک تھا۔ وہ بہت بڑا فلرٹ تھا۔ میں نفرت کرتی ہوں اس شخص سے۔ اور تم اس کے بیٹے ہو۔ یقیناً تم اس سے دو ہاتھ آگے ہی ہوگے...... آپی شاہین نے برسوں کوشش کر کے خود کو سنبھالا ہے۔ ہزار جتن کر کے وہ اپنی لائف کو کسی حد تک نارمل کر پائی ہیں۔ اب میں تم لوگوں کو ہرگز اجازت نہیں دوں گی کہ ان کو ڈسٹرب کرو۔ اگر تمہارے اندر عقل نام کی چیز ہوتی تو تم یہاں آتے ہی نہیں۔''

عمران نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاپا کے بارے میں یقیناً کچھ غلط فہمیاں ہیں آپ کے اندر۔''

''غلط فہمیاں میرے اندر نہیں، ان بے وقوفوں کے اندر ہیں جو اسے اب تک ہیرو سمجھتے ہیں۔ اتفاقاً کوئی واقعہ ہوگیا ہوگا اس کو بڑھاوا دینے والا۔ وہ ہیرو نہیں ولن تھا۔ پرلے درجے کا گھٹیا انسان تھا۔ جھوٹا، بے وفا، مطلب پرست اور دغاباز۔ اس نے اپنے اوپر شرافت اور ظرافت کا خول چڑھا رکھا تھا۔''

''دیکھو مس ماہین! تم بغیر سوچے سمجھے بولتی جارہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں کر رہی ہو۔'' عمران نے احتجاج کیا۔

وہ ایک دم شعلہ فشاں ہوگئی۔ اس نے عمران کو دھکا دیا۔ ''تو کیا کرلو گے تم؟ ہاتھ اٹھاؤ گے مجھ پر...... مارو گے مجھے؟ تو مارو...... مارو۔'' وہ جیسے عمران کے اوپر ہی چڑھ گئی۔ اس نے عمران کا گریبان جکڑ لیا۔ عمران نے گریبان چھڑانے کی کوشش کی تو اس نے عمران کے پیٹ میں گھٹنا دے مارا۔

اسی اثنا میں جواں سال ملازمہ رانو بھی لپکتی ہوئی آگئی۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ اس نے بلاتردد عمران کو عقب سے جکڑ لیا اور زمین پر گرانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ وہ عمران کی پشت پر گھٹنے بھی رسید کرنے لگی۔ عمران نے خود کو گرنے سے بمشکل بچایا۔

ماہین چلائی۔ ''تم پیچھے ہٹ جاؤ رانو۔ اس ہیجڑے کے لیے میں اکیلی کافی ہوں۔ چھوڑ دو اسے۔''

رانو پیچھے ہٹ گئی۔ ماہین نے اچانک عمران کو اڑنگا لگایا اور وہ ہال کمرے کے فرش پر دور تک لڑھک گیا۔ اب میں نے دیکھا کہ ماہین کے پاؤں میں سینڈل کی جگہ جوگر بوٹ نظر آرہے تھے۔ (جیسا کہ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے اپنے کزن کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ یہاں اس کا کوئی کزن نہیں رہتا تھا اور نہ ہی کسی کزن کا مارشل آرٹس سے تعلق تھا۔ دراصل وہ خود ہی اس فیلڈ میں تھی۔ کئی مقابلے جیت چکی تھی۔ ایک بار آذربائیجان بھی ہو آئی تھی)

وہ کسی مادہ عقاب کی طرح عمران پر جھپٹ پڑی۔ پتا

نہیں کب سے اس کے اندر نفرت کی آگ سلگ رہی تھی جو یکایک الاؤ بن گئی تھی۔ اس نے حیران کن پھرتی سے دو زوردار گھونسے عمران کے منہ پر جڑے۔ عمران لڑکھڑایا مگر پھر اس شدید حملے سے سنبھل گیا۔ وہ اب ایک منجھے ہوئے فائٹر کی طرح باقاعدہ اپنے پنجوں پر اچھل رہی تھی اور مٹھیاں مضبوطی سے بند کر رکھی تھیں۔ میں نے عمران کا چہرہ دیکھا۔ یوں لگا کہ اب وہ طیش اور حیرت کی لہر سے نکل آیا ہے اور اس صورتِ حال کو کسی حد تک انجوائے کرنے لگا ہے۔ وہ پھنکاری۔ ''تمہارا باپ خود کو بہت بڑا ''لڑاکا'' سمجھتا تھا۔ اس کے بیٹے میں بھی کچھ نہ کچھ دم خم تو ہوگا۔ آؤ...... آگے آؤ۔''

عمران نے کوئی ردِّعمل ظاہر نہیں کیا مگر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ وہ ایک دم عمران پر پل پڑی۔ بائیں ٹانگ کی انتہائی زوردار کک عمران کے سینے پر پڑی اور سیکنڈ کے چوتھے حصے میں دوسری کک بھی آئی۔ عمران نے جھک کر یہ دوسرا وار بچایا اور ''فٹ ورک'' دکھا کر کمرے کے دوسرے کونے میں پہنچا۔ ماہین نے اسے ایک لمحے کی مہلت نہیں دی اور پھر جھپٹی۔ اس مرتبہ اس کا گھٹنا عمران کی دونوں ٹانگوں کے بیچ لگا اور اس ضرب کی شدت عمران کے چہرے پر ظاہر ہوئی۔ وہ دہرا ہو گیا۔

وہ گرجی۔ ''تمہیں اصلاح چاہیے تھی نا، لو، میں کرتی ہوں اصلاح۔''

اس نے عمران کو کونے میں گھیر کر گھونسوں اور ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ وہ صرف دفاع کر رہا تھا۔ ایک دو بار اس نے جوابی وار بھی کرنا چاہا مگر زیادہ کارگر نہیں ہوا۔ ماہین کے سبک جسم میں جیسے بجلیاں تڑپ رہی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ چلّا رہی تھی، کچھ الفاظ سمجھ میں آ رہے تھے، کچھ نہیں۔ حیران کن تیزی سے اس نے عمران کو ایک فرشی داؤ لگایا اور اپنا گھٹنا اس کی گردن پر رکھ دیا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ وہ عمران کی گردن توڑ ڈالے گی۔

عمران پکارا۔ ''چاچو...... چاچو۔''

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ عمران کی مدد کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اور اگر ہوتا بھی تو یہ کام کافی مشکل تھا۔ دروازہ باہر سے بولٹ تھا اور میں اندر۔ وہ بڑی ہوشیاری سے میرا اسیل فون بھی اپنے قبضے میں لے چکی تھی۔

''ہائے مر گیا۔ منکا ٹوٹ گیا۔'' عمران ذبح ہونے والے جانور کی طرح چلّایا۔

ماہین نے گھٹنا اٹھایا اور جوگر کی کئی کراری ضربیں عمران کے منہ پر لگائیں۔ عمران کے ہونٹوں سے جاری ہونے والا خون ماربل کے براؤن فرش پر گل کاریاں کر رہا تھا۔ اس کی شرٹ پھٹ گئی تھی۔ جو نیلا چشمہ لگا کر وہ بڑی شان سے یہاں آیا تھا وہ بھی اس دھلائی میں چکنا چور ہو گیا تھا۔

ماہین نے اسے ایک ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹا اور بند دروازے کے پاس لے آئی۔ دفعتاً میں واقعی حیرت زدہ رہ گیا۔ ماہین نے سلور کلر کا ایک لیڈی پسٹل نکال لیا تھا۔

''کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ دہاڑی۔

عمران لڑکھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ ماہین کے اشارے پر شوخ و شنگ ملازمہ رانو نے میرے کمرے والا دروازہ کھولا۔ ماہین نے عمران کو پشت کی طرف سے زوردار دھکا دیا اور میرے پاس کمرے میں پہنچا دیا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ پھر سے بند کر دیا گیا۔

ملازمہ رانو اب دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے کھڑی تھی اور عمران کو استہزائیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''تسلیمات۔'' اس نے ہاتھ ماتھے پر لے جا کر عمران کی نقل اتاری۔ عمران نے آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

شام کے چھ بج چکے تھے۔ ہمیں اس سنسان کوٹھی کے کمرے میں بند ہوئے تقریباً تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ عمران نے قالین پر بیٹھ کر دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اور آنکھیں موند رکھی تھیں۔ چہرے پر دو تین نیلگوں گومڑ تھے اور وہ ''ہائے ہائے'' کر رہا تھا مگر یہ تکلیف والی ہائے ہائے نہیں تھی، اس میں ایک طرح کا لطف تھا۔

''چاچو یار! قسم سے بہت بھاری ہاتھ ہیں اس کے۔ مگر سچ پھولوں جیسا ہے۔ سُرور آ گیا۔''

''کچھ مزید سرور چاہیے تو پھر بلوا لو اس کو۔''

''جی تو چاہتا ہے کہ بلاؤں بلکہ شعر کی شکل میں بلاؤں۔ کوئی ایسا مصرع کہوں کہ وہ کھنچی چلی آئے۔ طبیعت بہت رواں ہو رہی ہے۔''

''مگر سوچ لو۔ ابھی تم نے کوئی شعر کہا بھی نہیں اور اتنی تگڑی اصلاح ہوئی ہے۔''

''ویسے چاچو! تم بھی تو بے وفا نکلے ہو نا۔ یتیم بھتیجا رولا ڈالتا رہا اور تم اس کی مدد کو نہ آئے۔''

''مدد کو تو تب آتا جب بھتیجا واقعی رولا (شور) ڈالتا۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہارے باپ کا لنگوٹیا رہا ہوں۔ اتنا الو کا پٹھا نہیں ہوں میں...... سب سمجھتا ہوں۔ تم نے جان بوجھ کر مار کھائی ہے۔''

وہ چند لمحے چپ رہنے کے بعد بھڑک کر بولا۔ ''اور تم بھی تو جان بوجھ کر اندر بیٹھے رہے ہوتا۔ جب اس نے میری گردن پر گھٹنا رکھا تھا، اس وقت ہی میری مدد کو آجاتے۔ اس پلائی وڈ کے دروازے کو توڑنا تمہارے لیے کون سا مشکل کام تھا۔''

''تم تماشا دکھا رہے تھے تو میں نے سوچا، چلو دیکھ لینا چاہیے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''تو اگر وہ سچ مچ ٹریگر دبا کر مجھے جنت نشین کر دیتی تو؟''

''نقلی پستول سے کوئی جنت نشین نہیں ہوتا۔''

''ہائیں، تو وہ نقلی پستول تھا؟'' عمران نے حیرت سے آنکھیں واکیں۔

''بکواس بند کرو۔ اتنے نابینا نہیں ہو تم۔ تمہیں بھی پانچ دس سیکنڈ میں پتا چل گیا تھا کہ ڈمی پستول ہے۔''

''چاچو! یہ الزام لگا رہے ہو تم۔ میں تو پچاس فیصد تیار بھی ہو گیا تھا۔''

''کس کام کے لیے؟''

''کہ اگر وہ مہ جبیں پستول دکھا کر میری آبرو لوٹنا چاہے گی تو میں زیادہ مزاحمت نہیں کروں گا۔''

میں نے اسے ہلکی سی ٹھوکر رسید کی۔ وہ پھر ہائے وائے کرنے لگا۔ ''ویسے چاچو یار...... مم میرا مطلب ہے چاچو جانی! ان چوٹوں کا مزہ بہت آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کہیں سے نمک ملے اور میں ان چوٹوں پر چھڑک کر اس مزے میں اضافہ کروں...... اور چاچو جی تم اکثر بڑی دور کی کوڑی لاتے ہو، یہ تو اندازہ لگاؤ کہ اس نے زیادہ چوٹیں میرے منہ پر ہی کیوں ماری ہیں؟ حالانکہ اور بھی مناسب جگہیں موجود تھیں۔''

میں نے کہا۔ ''مناسب جگہوں پر بھی تو مارا ہے۔ باقی جہاں تک چہرے کی بات ہے، مجھے لگتا ہے کہ تمہاری صورت سے اسے خاص ''محبت'' ہے...... اور گزارش یہ ہے کہ اب تم یہ بونگیاں مارنا چھوڑو۔ یہاں سے نکلنے کا سوچو۔ یہ الٹی کھوپڑی کی لڑکی ہے۔ کوئی اور تماشا نہ لگا دے۔''

ابھی میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ وہ پھر آدھمکی۔ اس مرتبہ ملازمہ رانو اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اب وہ پھر پہلے والے مشرقی لباس میں نظر آرہی تھی۔ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ تاہم خوب صورت چہرے پر غضب آمیز سنجیدگی اب بھی موجود تھی۔ مجھے اس کی عمر 22 سے بھی کچھ کم ہی لگتی تھی۔ اس نے ایک کرسی گھسیٹ کر آہنی گرل والی کھڑکی کے سامنے رکھی اور اس پر براجمان ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگی، جیسے ہمارے دم خم کا جائزہ لے رہی ہو۔ میرا اس کی جانب دیکھنا شاید اسے بُرا لگا۔ ایک دم چمک کر بولی۔ ''چاچا! اگر تمہارے دل میں کوئی ارمان ہے تو وہ بھی نکال لو۔ سنا ہے اپنے وقت میں تم بڑے دھانسو قسم کے فائٹر تھے۔''

''یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''تو پھر اس طرح گھورنا بند کرو۔'' اس نے خشک لہجے میں ''وارننگ'' دی اور اپنے موبائل پر کچھ چیک کرنے میں مصروف ہو گئی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے موبائل آف کیا اور ہماری طرف دیکھ کر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ ''مجھے پتا ہے، اب تم دونوں یہاں سے جانا چاہو گے۔ مجھے بھی تمہاری میزبانی کا کوئی شوق نہیں ہے۔ تاہم اس کے لیے ایک حتمی شرط ہوگی۔''

''کیا شرط؟'' میں نے پوچھا۔

''معذرت چاہتی ہوں۔ تھوڑا سا سخت فقرہ ہے لیکن کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تم دونوں دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھاؤ گے۔ میں ہرگز نہیں چاہتی کہ آپی شاہین کی لائف جو بڑی مشکل سے کچھ نارمل ہوئی ہے پھر ڈسٹرب ہو جائے۔''

''سخت شرط ہے۔'' عمران نے ٹھنڈی آہ بھری۔

''ماننا پڑے گی۔ ورنہ...... میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ ہر حد تک جا سکتی ہوں۔ جان دے سکتی ہوں اور لے بھی سکتی ہوں۔'' اس نے لہجے کو زوردار بناتے ہوئے کہا۔

میں اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے ماہین! اگر تمہارے نزدیک شاہین سے ہمارا ملنا اتنا ہی نقصان دہ ہے تو پھر ہم یہ نقصان کرنا نہیں چاہیں گے۔''

''تم دونوں کو اسٹامپ پیپر پر سائن، انگوٹھے کر کے دینا ہوں گے۔ میں نے اسٹامپ پیپر منگوایا ہے۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم چاہو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پھر ایک چھوٹی سی شرط ہماری بھی مان لو۔''

''بولیں۔'' وہ ٹھسے سے بولی۔

''عمران، شاہین کو دیکھنے کا بے حد مشتاق ہے۔ میں بھی اتنے عرصے بعد اس کی صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم

وڈیولنک پر اس کو بات چیت کرتے دکھادو۔''
''کسی صورت نہیں...... ہرگز نہیں۔'' اس نے زور سے فرش پر پاؤں مارا۔ ''میں نے کہا ہے نا۔ میں تم دونوں کو اپنی آپی سے دس ہزار میل دور رکھنا چاہتی ہوں۔''
''تم سمجھی نہیں ہو بیٹی۔'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''بات چیت ہم نہیں کریں گے، تم ہی کرنا۔ میں اور عمران بس اسے دیکھ لیں گے۔''
اس کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ میرا ''بیٹی'' کہنا اسے ناگوار گزرا ہے۔ بہرحال میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ اپنے خوب صورت ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر کچھ دیر سوچتی ہی پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''او کے...... مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔''

☆☆☆

اس نے ہال کمرے کے اندر ہی تھوڑی سی چہل قدمی کی پھر ملازمہ کو آواز دی۔ ''رانو لیپ ٹاپ لے کر آؤ۔''
دو منٹ بعد چلبلی رانو، سلور رنگ کا لیپ ٹاپ لیے اندر داخل ہوئی اور اسے ماہین کے سامنے شیشے کی تپائی پر رکھ دیا۔ ماہین نے تپائی کو اس طرح کھسکایا کہ وہ اس کھڑکی کے سامنے آ گئی جس کے پیچھے ہم بند تھے۔ اس نے اسکائپ کے ذریعے وڈیو کال کی۔ میری دھڑکنیں بڑھ چکی تھیں۔ عمران بھی اشتیاق سے دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اسکرین پر ایک شبیہہ ابھری اور ساتھ ہی آواز آئی۔ ''ہیلو ماہین۔''
میں دیکھتا رہ گیا۔ یہ شاہین ہی تھی۔ تیکھے نقوش، چھوٹی سی ناک اور صراحی دار گردن۔ اس کی پیشانی اب تھوڑی سی چوڑی نظر آنے لگی تھی اور وزن بھی تھوڑا سا بڑھا ہوا تھا۔ لیکن مجموعی طور پر گزرے ماہ و سال نے اس پر بہت تھوڑا اثر چھوڑا تھا۔ وہ ہائی نیک سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ ماہین نے لیپ ٹاپ کا رخ ایسا رکھا تھا کہ کھڑکی میں سے ہم تو شاہین کو دیکھ سکتے تھے مگر وہ نہیں۔
''آپ کیسی ہیں آپی؟'' ماہین نے کھنکتی آواز میں پوچھا۔
''بالکل ٹھیک۔ آج بہت جلدی کال کر دی تم نے۔ خیریت تو ہے نا۔ میرا مطلب ہے خالہ جان......؟''
''بالکل خیریت سے ہیں۔ بس آج کل سوز یادہ رہی ہیں۔ میڈیسن تبدیل ہوئی ہے نا۔''
''کالج گئی تھیں آج؟'' شاہین نے پوچھا۔ ماہین نے اثبات میں جواب دیا۔ دونوں بہنیں باتیں کرنے لگیں۔ شاہین کی ہمیشہ چہکتی ہوئی آواز قدرے بھاری ہو

چکی تھی اور اس میں ایک طرح کا ٹھہراؤ بھی آ گیا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے عمران دانش اور شاہین کی وہ پیار بھری لڑائیاں آ گئیں جو ہر وقت جاری و ساری رہتی تھیں۔ وہ اسے زچ کرتا تھا تو وہ چٹاخ پٹاخ بولتی تھی اور پھر بہت جلد من بھی جاتی تھی...... مگر پھر ایک دن...... اسے منانے والا خود روٹھ گیا تھا اور کسی سے من نہیں سکا تھا۔ میں اور عمران جونیئر محویت سے شاہین کو دیکھتے رہے، اس کی باتیں سنتے رہے۔ پھر ماہین نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
''او کے۔ تمہاری ڈیمانڈ پوری ہو گئی۔'' ماہین کی آواز نے مجھے ماضی کے دھندلکوں میں سے نکالا۔ ''میں اسٹامپ پیپر لے کر آ رہی ہوں۔'' اس نے کہا اور اونچی ایڑی پر بڑی شان سے ٹک ٹک چلتی ہال کمرے سے اوجھل ہو گئی۔ ملازمہ رانو اس کے عقب میں گئی۔
ہم دونوں گرل دار کھڑکی کے سامنے بیٹھے تھے۔
''اب کیا گمشدہ الو کی طرح دیدے گھما رہے ہو؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔
''یہی سوچ رہا ہوں کہ اس آفتِ جاں، خوبرو قتالہ کا شاگرد بن جاؤں...... اور ساری عمر اس سے کک باکسنگ اور جوڈو کراٹے کے داؤ پیچ سیکھنے میں گزار دوں۔''
''اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہارے تھوبڑے کے گومڑوں میں ایک اور گومڑ کا اضافہ کر دوں۔ یہ مسخرے پن کا موقع نہیں۔ سنجیدگی سے سوچو۔''
''کیا سوچوں؟''
میں نے گہری سانس لے کر کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''ماضی کے کردار، ماضی میں ہی چھپے رہیں تو زیادہ اچھا ہے۔ تم نے شاہین کو دیکھا ہے نا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ رنج و الم کے ایک طویل موسم سے گزری ہے اور مشکلوں سے خود کو سنبھال پائی ہے۔ دوسری طرف زندگی اور امنگ ترنگ سے بھری ہوئی یہ لڑکی ماہین ہے۔ اپنے ہی جوش اور بہاؤ میں بہتی چلی جا رہی ہے۔ زندگی کی تلخ ترین حقیقتوں اور سنگینیوں سے ناواقف ہے۔ اپنی ذات پر ایک معصوم لیکن غیر متزلزل اعتماد ہے اسے۔ کیوں نہ ان لوگوں کو ہم ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ ایک پُرخطر ماضی کے ساتھ ہم ان کی زندگیوں میں دخل نہ دیں۔''
غیر متوقع طور پر میں نے عمران کے چہرے پر بھی سنجیدگی کی جھلک دیکھی۔ یہی وقت تھا جب نوخیز ماہین ہاتھ میں ایک اسٹامپ پیپر لیے بڑے انداز سے چلتی ہال کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق وہ کوئی

اقرارنامہ وغیرہ سائن کرانا چاہ رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ہم دونوں کے موبائل فون تھے جو وہ یقیناً ہمیں واپس کرنا چاہ رہی تھی...... مگر جو کچھ ہونے والا تھا، وہ ہم میں سے کسی کو پتا نہیں تھا...... شاید وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔

اچانک ہال کمرے کا بیرونی دروازہ دھماکے سے کھلا اور تین چار افراد بھرا مار کر اندر گھس آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لمبے پھل کا چمک دار چاقو صاف نظر آرہا تھا۔ رانو چلا کر رہ گئی۔ ماہین بھی بُری طرح ٹھٹکی۔ ''کون ہو تم؟'' ماہین نے بلند آواز میں کہا۔

جواب دینے کے بجائے پینٹ شرٹ والے ایک فربہ شخص نے ماہین کو پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے گھوم کر ایک طوفانی ٹھوکر اس کے منہ پر ماری۔ اس کے پاؤں میں سینڈل تھا۔ دانت ٹوٹنے کی آواز میں نے واضح طور پر سنی۔ فربہ شخص کراہ کر نیچے جھکا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے کے اندر ہم دونوں بھی نیچے جھک گئے تاکہ کھڑکی میں سے ہمیں دیکھا نہ جا سکے۔

اگلے کچھ سیکنڈ تک آوازوں سے اندازہ ہوا کہ ماہین بھرپور مزاحمت کررہی ہے لیکن پھر اس کی دردناک کراہ میرے کانوں میں گونجی۔ میں نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک دراز قد شخص نے عقب سے اس کے سر پر پستول کے دستے سے ضرب لگائی تھی اور وہ گھٹنوں کے بل فرش کی طرف جھکتی چلی جارہی تھی۔ اس نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام ہوا تھا۔ دوسری طرف ملازمہ رانو کو بھی ایک حملہ آور نے دبوچا ہوا تھا اور اپنا لمبا چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا تھا تاکہ وہ آواز نہ نکال سکے۔ ''یہ کیا سین پارٹ ہوگیا؟'' عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم دونوں کمرے کے ایک کونے میں سمٹے ہوئے تھے تاکہ حملہ آوروں میں سے کسی کی نگاہ ہم پر نہ پڑ سکے۔

آوازوں سے اندازہ ہوا کہ کسی نے ماہین کے منہ پر طمانچے مارے ہیں۔ پھر ایک پھنکارتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''حرام زادی، بڑی گرمی ہے تیرے اندر...... سب ٹھیک کردیں گے۔''

''کون ہو تم؟'' وہ پُردرد انداز میں کراہی۔

''تمہارے خصم۔'' پھر وہ ذرا توقف سے بولا۔ ''کہاں ہیں وہ دونوں؟''

''کون؟ کس کا پوچھ رہے ہو؟''

ایک اور طمانچہ ماہین کو مارا گیا۔ ''وہی لونڈا نیلی عینک والا اور اس کا انکل؟''

''مم...... مجھے کچھ پتا نہیں۔'' ماہین کراہی۔

میں نے ایک بار پھر کھڑکی کے پردے کی اوٹ سے ہال کمرے میں جھانکا۔ دراز قد حملہ آور نے ماہین کو صوفے پر اوندھا گرایا ہوا تھا اور اس کا بازو بری طرح مروڑ رہا تھا۔ ماہین کے خون آلود چہرے پر کرب کے آثار تھے۔ ملازمہ رانو بھی سہمی چڑیا کی طرح ایک شکرے کی گرفت میں تھی۔ ''اوپر کی منزل پر دیکھو۔'' دراز قد نے تحکم سے ایک شخص کو کہا۔

وہ پستول بدست سیڑھیاں پھلانگتا ہوا بالائی منزل پر چلا گیا جس فربہ اندام شخص کے منہ پر ماہین کی طوفانی ککّ لگی تھی وہ فرش پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور مسلسل خون تھوک رہا تھا۔ (بعدازاں پتا چلا کہ اس کے تین دانت ٹوٹ گئے ہیں)

''اوپر صرف ایک بوڑھی سوئی پڑی ہے۔'' اوپر جانے والے نے واپس آکر اطلاع دی۔

اب یقیناً یہ لوگ نیچے والے کمروں کو اچھی طرح دیکھنے والے تھے۔ مجھے دراز قد شخص کی شکل کچھ جانی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ شک بھی پوری طرح ذہن میں ابھر آیا تھا جو راستے میں پیدا ہوا تھا۔ مجھے لگا تھا کہ شاید ہمارا تعاقب کیا گیا ہے۔ ہمارے اردگرد قدموں کی آوازیں آرہی تھیں۔ دراز قد شخص گاہے گاہے ماہین کا بازو مروڑ کر اسے تکلیف دیتا تھا اور وہ کراہنے لگتی تھی۔

میں نے اور عمران نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ ہوگیا۔ اب مزید انتظار خطرناک تھا۔ بے شک ماہین نے ہمیں باہر سے بند کر رکھا تھا مگر اب باہر آنا ضروری تھا۔ میں نے چھ سات قدم پیچھے ہٹ کر کندھے کی ایک نہایت شدید ضرب دروازے کو لگائی۔ دروازہ تڑخ گیا مگر پورا کھلا نہیں۔ اگلے ہی لمحے عمران بھی توپ کے گولے کی طرح دروازے سے ٹکرایا اور ہم دونوں باہر ہال کمرے میں تھے۔ میں اپنا ٹارگٹ پہلے ہی منتخب کرچکا تھا۔ میں نے پستول بردار پر جست لگائی اور اسے چکنے فرش پر رگیدتا دور لے گیا۔ اسے گولی چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ عمران دراز قد پر جھپٹا جو ماہین کو دبوچے ہوئے تھا۔ عمران کے سر کی چوٹ کھا کر دراز قد لڑکھڑاتا ہوا اپنے فربہ اندام ساتھی پر جاگرا۔ چاقو بردار نے ملازمہ رانو کو چھوڑ کر عمران کی گردن پر وار کرنا چاہا مگر وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔ پھر اس نے چاقو بردار کو سنبھلنے کا

موقع ہی نہیں دیا۔

اگلے ایک منٹ میں ہال کمرے کے اندر دھواں دھار ''معرکہ'' ہوا۔ تینوں افراد فرش پر لمبے لیٹے نظر آئے۔ دراز قد شخص ابھی تک مزاحمت کر رہا تھا۔ عمران نے اسے اوندھا گرا کر اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ اس کے لیے اس نے اپنی بیلٹ استعمال کی تھی۔ ماہین، رانو کے ساتھ ایک کونے میں سمٹی ہوئی تھی۔ وہ ذرا حیرت سے عمران کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے سوچ رہی ہو کہ جس شخص کو اس نے تین گھنٹے پہلے بُری طرح رگیدا تھا، وہ ایسا کمزور تو نہیں تھا۔

ہال کمرے کی روشنی میں، میں نے دھیان سے حملہ آوروں کو دیکھا۔ اب تک میرے ذہن میں یہی تھا کہ شاید یہ میرے اور عمران دانش کے کوئی پرانے ''دوست'' ہیں جو عمران جونیئر کو پہچان کر ہمارے پیچھے پڑ گئے ہیں مگر جب میں نے دراز قد کی شکل پر غور کیا تو ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ پرانے نہیں نئے دشمن ہیں۔ اس بندے کی شکل صوفیہ کے مرحوم و مقتول منگیتر واجد سے کافی ملتی تھی۔ اگلے چند منٹوں میں انکشاف ہوا کہ وہ واجد کا چھوٹا بھائی ہے اور بدلے کی آگ سینے میں بھڑکائے ہوئے ہے۔ وہ نشے میں لگتا تھا۔ گالیاں بک رہا تھا اور خاص طور پر مجھے مسلسل دھمکا رہا تھا۔

''مجھے پتا ہے، میرے بھائی کے قتل میں تمہارا ہاتھ ہے۔ تم نے ہی اس کے قاتل کو چھپایا ہوا ہے۔ تمہاری وردی کو پھاڑ کر تمہارا کفن نہ بنا دوں تو میرا نام بدل دینا۔ ہاں، یہ خون چھپنے نہیں دوں گا میں۔''

اس کی بدزبانی روکنے کے لیے عمران نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا اور پھر رانو سے جھاڑن کا کپڑا لے کر اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ پھر وہ ماہین کے سر کا زخم دیکھنے کے لیے اس کی طرف لپک گیا۔ حملہ آور کا پستول اب میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اپنے موبائل سے مقامی تھانے کے ایس ایچ او زبیر کو فون کیا اور اسے بتایا کہ چار ڈکیت گلبرگ مین بلیوارڈ کے ایک گھر میں گھس آئے ہیں۔ اب وہ گن پوائنٹ پر ہیں، فوراً پہنچو۔''

☆☆☆

کوٹھی کے باہر اور کوریڈورز میں لگے ہوئے تین سی سی ٹی وی کیمروں نے سب کچھ واضح کر دیا تھا۔ واجد کے دراز قد بھائی کا نام مشاہد احمد تھا، بے راہ رو امیرزادہ تھا۔ تین چار کیس اس پر پہلے بھی تھے۔ اس کے اور ساتھیوں کے خلاف تگڑی ایف آئی آر درج ہو گئی۔ ایف آئی آر کو مضبوط کرنے میں ماہین کے دلیرانہ بیان نے بھی کافی مدد کی۔ مجھ پر جوابی پرچہ کرانے کی کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

چار پانچ روز بعد میں اور عمران، دس مرلے کے اسی گھر میں موجود تھے جو کبھی عمران دانش کا مسکن رہا تھا۔ ساتھ والے کمرے میں عمران جونیئر کے سات آٹھ دوست کیرم بورڈ وغیرہ کھیلنے میں مصروف تھے۔ عمران کے خوبرو چہرے پر دو تین جگہ میڈیکل ٹیپ چپکی ہوئی تھی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ''چاچو! یہ تو پچھلے اپی سوڈ والا معاملہ ہی نکل آیا، میرا مطلب ہے کہ صوفیہ کے مقتول منگیتر کا بھائی۔''

''یہ اپی سوڈ نہیں، زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے۔''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اسی لہجے میں کہنے لگا۔ ''ویسے چاچو جانی، جب بھی اس دن کے واقعات کو یاد کرتا ہوں اور ماہین کا چاند چہرہ نگاہوں کے سامنے آتا ہے، میری پینٹ مزید ڈھیلی ہونے لگتی ہے۔''

''پینٹ! مزید ڈھیلی؟'' میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

''اوہو چاچو جانی! لگتا ہے کہ عمر کے ساتھ تمہاری یادداشت کو یورک اینڈ ہو گیا ہے...... میں نے اپنی بیلٹ سے اس باسٹرڈ مشاہد کے ہاتھ اس کی پشت پر باندھے تھے نا۔ وہ اکلوتی بیلٹ تھی میرے پاس۔''

''تمہاری یہ معنی خیز باتیں کسی دن تمہیں کسی سے بُری طرح پٹوائیں گی۔ اپنی پینٹ کو ٹھیک جگہ پر رکھو اور اپنا یہ چلبلا پن کم کر کے کچھ سنجیدگی لاؤ اپنے اندر...... اب دیکھو، میں نے تم سے یہی بات کہی تھی نا کہ شاہین والے معاملے کو نہ چھیڑا جائے۔ اب کیا ہوا ہے؟ ان کی فیملی اس مشاہد والے لپیٹے میں آ گئی ہے۔ آ گئی ہے نا؟''

''واقعی کتنا اچھا ہوا ہے۔'' وہ خوش ہو کر بولا۔ ''مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے۔ آپ جناب نے تو پوری کوشش کی تھی کہ میں جانِ جاناں ماہین کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہہ دوں۔ ساری زندگی اس کی یاد میں رو رو کر اور ''تڑف تڑف'' کر گزار دوں لیکن اب ایسا نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں ہر صورت ماہین اور آنٹی شاہین وغیرہ کی خبر رکھنا ہو گی بلکہ...... اگر مجھے خطرہ محسوس ہوا تو میں تو سائے کی طرح ماہین کے ساتھ چمٹا رہوں گا۔''

میں نے اسٹیل کا گلاس اٹھا کر اسے مارا۔ وہ جھکائی دے گیا اور گلاس دور تک لڑھکتا چلا گیا۔

❖❖❖

الائو... مرحوم کاشف زبیر کی آخری سلسلے وار تحریر ہے... جو انہوں نے..... قارئین کے لیے تحریر کرنا شروع کی تھی... لیکن دستِ قضا نے ان کو اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ چند سنسنی خیز اقساط لکھنے کے بعد اسے اختتام تک پہنچاتے... کسی بھی مصنف کی تحریر کو اسی کے رنگ و آہنگ میں لکھنا کڑا امتحان ہوتا ہے... الائو کو آگے بڑھانے کا فریضہ اب ڈاکٹر عبدالرب بھٹی انجام دیں گے... الائو ایکشن، تھرل اور سسپنس سے بھرپور داستان ہے... ایک مسیحا کو لوگوں کی مسیحائی سے دور کر کے درندگی کے گھنائونے کھیل میں ایسا الجھایا کہ وہ زندگی کی ہر رنگینی کو بُھلا بیٹھا... اب اس کا مقصد صرف اور صرف ان دشمنوں کی کھوج تھی جو سامنے ہوتے ہوئے بھی نگاہوں سے اوجھل تھے...

انسان نما درندوں کی داستان جو جیتے
جاگتے ہم نفسوں کو بھی بازار کی جنس بنا دیتے ہیں

دروازے پر دو نقاب پوش نمودار ہوئے، ان دونوں کے ہاتھوں میں سائیلنسر لگے پستول تھے۔ ان کی چابک دستی، عجلت آمیزی اور جارحانہ انداز یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ انہیں صرف ایک ہی ''ٹاسک'' ملا ہوا ہے، یعنی ''مارو یا مرجاؤ'' اور وہی ہوا۔

تب ہی یک بیک ان کے لمبی نال والے خوفناک پستولوں نے خاموش مگر آتشیں سرگوشیاں اگلیں۔ نتیجے میں ایک لرزتی ہوئی چیخ زوہریہ کے حلق سے اور دوسری میرے منہ سے نکلی تھی۔

ہم دونوں ہی گرے، رومی نے البتہ غیر معمولی پھرتی کا مظاہرہ کیا اور تیزی سے پلٹی اور نجانے کون سی تکنیک استعمال کرتے ہوئے قریب دھری ایک تپائی کو لات رسید کر دی، جو گولی کی طرح اڑتی ہوئی ان دونوں نقاب پوش حملہ آوروں سے ٹکرائی، نتیجے میں پستول ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئے، رومی کے لیے اتنا موقع ہی کافی تھا۔

اس کی اگلی پھرتی کا اختتام گرے ہوئے پستولوں میں سے ایک کو جھپٹنے پر ہوا، جو دوسرے کی بہ نسبت اس کے بالکل قریب آن گرا تھا۔ گویا شیرنی کو پھاڑ کھانے کا موقع مل گیا۔

سائیلنسر لگا پستول ہاتھ میں آتے ہی اس نے سب سے پہلے اس نقاب پوش کو نشانہ بنایا جو دوسرا پستول اٹھانے کے لیے لپکا تھا۔ خاموش پستول کی سرگوشی ابھری اور وہ گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پہلے والے نے پلٹ کر راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش چاہی تھی کہ رومی کی عروج پر پہنچی ہوئی پھرتیوں نے ایک اور شاخسانہ دکھایا، اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے پستول کی لمبی نال نے دوسری سرسراتی سرگوشی اگلی اور وہ بھی کھلے دروازے کے پاس ہی گر کر تڑپنے لگا۔

رومی ہماری جانب متوجہ ہوئی تھی، میں جو اپنے بائیں بازو پر گولی کھانے کے بعد زوہریہ کے ساتھ ہی گرا تھا، تو مجھ میں نجانے اتنا حوصلہ کہاں سے آ گیا تھا کہ زخمی حالت میں ہی رومی کی یہ ساری کارگزاری ایک ٹک تکے جارہا تھا۔

میری خوش قسمتی تھی یا پھر ان اچانک در آنے والے نقاب پوشوں کی عجلت کہ گولی جسم کے کسی نازک مقام پر نہیں لگی تھی، البتہ زوہریہ کے شاید کہیں ایسی جگہ ضرور لگی تھی، جس کے سبب وہ اب فرش پر پہلو کے بل پڑی اکھڑے اکھڑے سانس لے رہی تھی اور کراہتی بھی جاتی تھی۔

رومی مجھے ایک نگاہ دیکھنے کے بعد اسی کی طرف لپکی تھی اور میں بھی اس طرف دیکھنے لگا۔

زوہریہ کے پیٹ میں یا پہلو کے قریب زخم تھا اور وہاں سے خون بہے جارہا تھا۔

''سیف! تم ٹھیک ہونا۔'' رومی نے ہانپتی ہوئی آواز میں مجھ سے دریافت کیا۔

''میں ٹھیک ہوں مگر یہ بے چاری کیا مفت میں ماری گئی؟'' میں نے ہلکے سے کراہتے ہوئے کہا۔ زخم قدرے ٹھنڈا پڑتے ہی مجھے بھی اپنے بازو میں درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''تم اپنے زخم پر ہاتھ دبائے رکھو، میں کچھ کرتی ہوں۔'' وہ پتا نہیں جوش سے یا پھر ذرا دیر پہلے ہونے والی کشاکشی کے سبب ابھی تک ہانپ رہی تھی۔

میں نے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ ایک دم اٹھی اور اپنے بیگ کی جانب بڑھی تھی، جس نے نہ جانے کیا کیا بھرا رہتا تھا مگر وہ نازک وقتوں میں کام آتا تھا۔

میں نے کانپتی نظروں سے پھر زوہریہ کی ہیت کذائی کو دیکھا۔ وہ بالکل ہی نڈھال اور بے سدھ ہوئی جارہی تھی۔

''لو، تم جب تک اپنے زخم پر یہ رکھو......'' ذرا ہی دیر میں وہ قریب آ کر مجھے ایک گاز پیس اور پیرافین کی اسٹیکر نما پٹی تھما کے بولی۔ پھر وہ زوہریہ کی طرف متوجہ ہو گئی، مگر اس سے پہلے وہ کمرے کا دروازہ بند کر چکی تھی۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے بائیں بازو میں کسی نے گرم سلاخ لگا دی ہو۔ شدید درد اور جلن کا احساس ہونے لگا تھا۔

یوں میں نے وہ سب زخم پر ''اپلائی'' کر دیا۔ شکر تھا کہ گولی ہڈی کو نقصان پہنچائے بغیر بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی تھی، پھر میں رومی اور زوہریہ کی جانب متوجہ ہوا۔

وہ پہلو کے بل تھی، رومی نے اسے آہستگی سے سیدھا کیا، اس کے پیٹ میں ہی گولی لگی تھی اور رومی اس کی وہاں سے قمیص کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر اس کے زخم کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے جسم سے بہنے والے خون نے فرش اور قالین پر تالاب سا بنا دیا تھا۔

مجھے اس کی جانب سے سخت تشویش ہونے لگی، وہ بے چاری ایک تو ینگ اور خوب صورت لڑکی تھی، پھر ہماری مدد میں بھی شامل رہی تھی اور خود کو اس نے ایک بہادر لڑکی ثابت کیا تھا۔

سب سے اہم بات یہ کہ وہ ہمیں ابومعد کے بارے

میں کچھ بتانا چاہتی تھی، لیکن بدقسمتی سے اسے موقع نہ مل سکا تھا۔

میں دل ہی دل میں بے اختیار خدا سے اس کی زندگی کی دعا مانگنے لگا۔

رومی پوری تندہی اور انہماک کے ساتھ اس کی زندگی بچانے کے لیے کوشاں تھی اور میں پُرتشویش نظروں سے اسے تک رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ کسی ایمبولینس کو فون کر دو۔'' میں نے مشورہ دیا۔ کیونکہ میں دیکھ رہا تھا کہ رومی کے چہرے کی تشویش میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ زوہریہ کی حالت نازک تھی۔

''وہ تو کرنا ہی پڑے گا، میں پہلے اسے فرسٹ ایڈ دے دوں۔'' اس نے جواب میں کہا پھر میری طرف دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم کچھ مدد کر سکتے ہو؟ ذرا اس کے زخم کا جائزہ لے لو۔''

میں نے اپنے بازو کے زخم پر ہاتھ رکھا اور اس کی جانب کھسک آیا۔ زوہریہ کے پیٹ میں قدرے دائیں پہلو پر گولی کا زخم تھا، گولی اندر پیوست تھی، آر پار نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک پلس پوائنٹ تھا، کیونکہ آر پار کا مقصد کسی اندرونی ''مین آرگن'' کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچنے کا خطرہ تھا۔ تاہم یہ خدشہ اپنی جگہ موجود تھا کہ گولی نے جگر یا معدے اور آنتوں کو۔۔نقصان پہنچایا ہو۔ تب بھی میرے حساب سے خطرے والی بات کم ہی تھی بشرطیکہ کہ اسے برقت طبی امداد مل جاتی۔

میں نے رومی سے کہہ دیا۔ اس نے فوراً فون پر اپنے ڈپارٹمنٹ کے ہیلتھ سینٹر کو فون کھڑکا دیا اور ان سے خصوصی مدد کی درخواست کر ڈالی، کیونکہ ظاہر ہے وہ یہی کہتے کہ پہلے مقامی پولیس سے رابطہ کیا جائے، وغیرہ۔ مگر بعض اسپیشل اور ''آن ڈیوٹی'' کیسز میں انٹرپول ایسے اقدام اٹھا لینے میں کوئی عار نہیں سمجھتی تھی جس میں کچھ باتیں ''راز'' میں رکھنا ضروری ہوتا۔

پولیس انٹرپول کی ایک ایمبولینس آگئی۔ ہوٹل کی انتظامیہ بھی یہی چاہتی تھی کہ معاملہ رازداری سے نمٹ جائے اور ان کی بھی بدنامی یا پولیس کی لمبی چوڑی تفتیش سے جان چھوٹی رہے۔

المختصر زوہریہ اور مجھے انٹرپول کے ایک مقامی ہیلتھ سینٹر پہنچا دیا گیا۔ میری تو اتنی حالت خراب نہ تھی البتہ زوہریہ کے سلسلے میں وہاں ایمرجنسی کی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔

اسے فی الفور E.O.T (ایمرجنسی آپریشن تھیٹر) منتقل کر دیا گیا تھا۔ جبکہ میری ڈریسنگ وغیرہ کر کے مجھے عام کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔

وہاں ایک انٹرپول کا اسمارٹ اور چاق چوبند آفیسر میرا بیان لینے اپنے ایک ماتحت خاتون کے ساتھ پہنچ گیا۔ اس کے ہمراہ رومی بھی تھی۔

مجھ سے روایتی قسم کے بیانات لیے گئے۔ رومی نے بھی اسے اپنے ''کاز'' کے بارے میں پہلے سے بتا دیا تھا۔ افسر کا نام کیپٹن آئزک بیل تھا، اس کا تعلق اٹلی سے تھا، جبکہ اس کی ساتھی لڑکی سیری لنکن تھی، اس کا نام پریٹی تھا، یوں بھی وہ 'پریٹی' ہی تھی۔ اس کے سندر سے ہاتھوں میں دو ڈایوسز تھیں، ایک چھوٹی اور دوسری بڑی۔ ایک تو شاید کوئی ڈیجیٹل نوٹ بک تھی اور دوسری بیانات اور ویڈیو بنانے والی کوئی ایسی ہی شے۔

''یہ کیس مقامی پولیس کے علم میں لانا پڑے گا۔'' تھوڑی دیر بعد آفیسر آئزک نے کہا۔ وہ ایک پینتیس سالہ خوبرو اور لمبا چوڑا شخص تھا .... اس کا جسم کسرتی تھا جس پر اس نے ہلکے نیلے رنگ کی شرٹ اور نیچے گہرے نیلے رنگ کی ڈریس پینٹ پہن رکھی تھی۔ بیلٹ سے الابلا چیزیں جھولتی نظر آتی تھیں، حیرت کی بات میرے لیے یہ تھی کہ ان میں اسلحہ نام کی کوئی چیز نہ تھی، یہی حال اس کی ساتھی ماتحت لڑکی پریٹی کا بھی تھا۔

''کیا یہ ضروری ہے، آفیسر؟'' رومی نے مستفسرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بہت ضروری......'' اس نے کاندھے اور بھویں دونوں ہی اچکا کر کہا، بس ایڑیاں اچکانے کی کسر رہ گئی تھی۔ وہ آگے بولا۔ ''اب بھی ہمیں مقامی پولیس کو اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا کہ انہیں اتنی دیر سے کیوں مطلع کیا گیا بلکہ جائے وقوعہ کی تفتیش سے بھی انہیں تسلی نہ ہوگی جب تک وہ خود نہ کرتے، اس کے لیے بھی وہ ہم پر مین میخ نکالیں گے۔''

''تو انہیں بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے، آخر خطرناک اور بین الاقوامی مجرموں کے سلسلے میں بھی رازداری قانون کے وسیع تر مفادات کے دائرۂ کار میں ہی آتی ہوگی۔''

اس بار میں نے لقمہ دیا تو آفیسر اور اس کی ماتحت لڑکی مجھے یوں گھورنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''میاں! پہلے تم

اپنی دم سنبھالو، ہمیں قانون پڑھانے کی ضرورت نہیں تمہیں۔"

مجھے شاید ہونق سا ہوتے دیکھ کر رومی نے سنبھالا دیا اوران سے مخاطب ہو کے کہا۔ "میرا خیال ہے کوئی تو گنجائش ہوتی ہوگی اس گمبھیر صورتِ حالات میں؟"

اس نے بھی گویا میری بات کی توثیق ہی کی تھی جس پر آفیسر بولا۔ "اس کے لیے بھی ہمیں مقامی پولیس کی کومپی ٹینٹ اتھارٹیز سے اجازت اور کچھ خصوصی اختیارات لینا ہوں گے۔"

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، انٹرپول بعض اہم اور بین الاقوامی معاملات میں پہلے ہی سے خصوصی اختیارات رکھتی ہے۔" میں بھی باز نہ آیا۔ اس بار آفیسر نے مجھے ایسی نظروں سے گھورا تھا جیسے وہ مجھے یہاں سے فوری طور پر بے دخل کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

"نہیں مسٹر! یہ قانون ہے، کوئی گڈے گڑیوں کا کھیل نہیں۔"

مجھے اس کے بولنے کا انداز جانے کیوں ایشیائی لگا، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے زیادہ عرصہ ادھر ہی گزارا ہو۔ میں خاموشی سے اس کی سنتا رہا۔

"مجھے پھر ایک سینئر انٹرپول افسر کی حیثیت سے ہائر اتھارٹی سے رجوع کرنا پڑے گا۔" بالآخر رومی نے بھی دخل اندازی کی۔

"آخر مقامی پولیس کے علم میں لانے میں قباحت ہی کیا ہے؟" اس بار پریٹی نے پہلی بار اس بحث میں لب کشائی کرتے ہوئے رومی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ "کیا خبر اس طرح ہمیں آسانیاں مل جائیں۔"

"آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔" رومی اس بار قدرے جھلا کر بولی۔ "یہاں کی پولیس کا ایک اہم افسر ان عالمی ریکٹ سے ملا ہوا ہے۔ یہی نہیں اس کی منہ بولی بھتیجی کو اس کے بارے میں یہ راز ٹھوس شواہد کے ساتھ مل چکا ہے۔ وہ ہوش میں آکر سب بتا دے گی۔"

"بلکہ ہمیں تو پورا یقین ہے کہ یہ حملہ بھی اسی پولیس آفیسر نے ہم پر اسی مقصد کے لیے کروایا ہو۔" میں نے بھی اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"مقصد کیا ہوسکتا ہے بھلا ان کا؟" پریٹی نے اپنی خوب صورت آنکھوں کو جو مجھے اس وقت اس کے بے وقوفانہ سوال پر انتہائی بدنما لگیں، گول گھماتے ہوئے کہا۔

میں جلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ان کا مقصد بہت ہی اعلیٰ تھا، یعنی...... ہم تینوں کو خاموش پستول سے مروانے کے بعد شاید ہمارے جنازوں کو پھول پتیوں سے نچھاور کرانے اور باعزت دفنانے اور سارے ثبوت اور شواہد مٹ جانے کی خوشی میں اپنی کامیابی پر بھنگڑا ڈالنے کا ہو۔"

"آپ شاید ہمیں جگتیں مار رہے ہیں۔" وہ خفگی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں جوتے بھی مار سکتا ہوں۔" یہ میں نے دل میں کہا اور بولا۔

"نہیں محترمہ! میں صرف یہ سمجھانا چاہ رہا ہوں جس راز کو چھپانے کی خاطر رومی اور میں نے اپنی جانیں داؤ پر لگائیں اور زوہریہ... اس وقت زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے، اسے زائل کرنے کے لیے ہی ہم پر یہ جان لیوا حملہ کیا گیا ہے اور اب آپ لوگ اسے زائل کر کے ان عالمی مجرموں کے گرد کسا ہوا شکنجہ ڈھیلا کرنے کے لیے پر تولے ہوئے ہیں۔"

"توبہ ہے، اتنی لمبی تمہید باندھتے ہو تم تو اتنی سی بات کی......" رومی مجھے ٹوکے بغیر نہ رہ سکی تھی اور ہولے سے اردو میں بڑبڑائی۔

"آپ کچھ کہہ رہی تھیں؟" آفیسر آئزک نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ مجھے ان دونوں پر سخت غصہ آرہا تھا، بجائے ہماری بات پر توجہ دینے کے بے پرکی پر دھیان دے رہے تھے۔

"جی! یہ مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ کن کوڑھ مغزوں سے دماغ لڑا رہے ہیں ہم بھی...... جو اتنی سی بات نہیں سمجھ پا رہے۔" بالآخر مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔

"مائنڈ یور لینگویج مسٹر......!" اس کی ساتھی پریٹی نے ماتحتی کا حق ادا کیا۔

"جی نہیں، میں اپنی پیاری لینگویج اردو بولنے سے کوئی مائنڈ نہیں کرتا۔" میں بھی الٹے معنی ادا کرتے ہوئے اسے زچ کرنے لگا۔

"پلیز، سیف! تم تو چپ ہوجاؤ۔"

رومی نے صورتِ حال بگڑتے دیکھی تو اسے سنبھالا دینے کی خاطر دوبارہ اردو میں مجھ سے بولی۔ پھر آفیسر آئزک سے مخاطب ہو کے کہا۔

"دیکھیں، آفیسر! آپ بات کو سمجھنے کی کوشش کریں، یا پھر اس کیس سے متعلق اپنی ہائر اتھارٹیز سے مشورہ کر لیں۔ کہیں آپ کی ضد سے بعد میں ایسا نہ ہو کہ آپ دونوں کو ہی پریشانی اٹھانا پڑ جائے۔ یہ معاملہ بہت نازک اور حساس

نوعیت کا ہے۔ میں خود انٹرپول آفیسر ہوں اور سب اچھی طرح جانتی ہوں۔"

رومی کی بات پر آفیسر تو نہیں البتہ اس کی ساتھی پریتی کے خوب صورت چہرے پر میں نے پہلی بار ذرا پریشان کن تاثرات نوٹ کیے، وہ شاید رنگ روٹ تھی اور اسے اپنی نوکری کی فکر ہوئی۔ لہٰذا وہ اپنے آفیسر کے کان میں جھک کر کچھ کہنے لگی۔ میری اور رومی کی بھنچی بھنچی نظریں انہی پر جمی ہوئی تھیں۔

"ہانس او کے......" بالآخر آئزک کے منہ سے نکلا۔

"شکر ہے۔" میں نے بھی کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے میری طرف گھورا۔

"یہی کہ آپ کو ہماری بات سمجھ آ گئی۔" میں نے امید بھری نظروں سے دیکھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ پھر اکھڑپن سے بولا۔

"تو گویا آپ نے اپنی نااہلی کا اعتراف کر لیا۔" میں نے بھی فوراً کہہ ڈالا۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" آئزک چڑ کر بولا۔

"ابھی تو آپ نے خود کہا کہ آپ ہماری بات نہیں سمجھ رہے۔"

"آپ...... میرے ساتھ آئیں......" آئزک بُری طرح تپا ہوا تھا۔ اس نے رومی کو اپنے ساتھ آنے کا کہا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ رومی نے مجھے نگاہوں ہی نگاہوں میں کچھ سُجھانے یا سمجھانے کی کوشش چاہی تھی مگر میں چھت کو گھورنے لگا، پھر وہ اس کے عقب میں چل دی۔

وہ دونوں نکلے تو پریتی بھی مجھے منہ بسورتے ہوئے دیکھتی اپنا سامان سمیٹنے...... لگی تو میں نے عقب سے اسے پکار لیا۔

"ہے مسی!"

اُس نے پلٹ کر میری جانب کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں چونک ہی گیا۔ تھوڑی دیر پہلے اپنے آفیسر کے سامنے اس کے چہرے کی الجھنیں اور خفگیاں عروج پر تھیں لیکن اب اس کی جگہ ایک دل نواز سی مسکراہٹ نے لے لی تھی۔ اسی انداز و لہجے میں بولی۔

"جی ڈاکٹر صاحب! فرمایئے؟"

"فرمانا کیا ہے بس ایسے ہی آپ کی تعریف میں چند جملوں کا اپنے منہ سے اخراج چاہتا ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں، میں اپنی تعریفوں پر کم ہی خوش ہوتی ہوں۔" اس کے مترنم سے لہجے میں ایک عجیب سی طنزیہ خوشگواریت کا احساس تھا۔

"نہیں، یہ آپ کا حق ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ میں آپ کا مشکور ہوں، تہِ دل سے......"

"وہ کس لیے؟" اس نے اپنی کشادہ اور تیکھی کمانوں والی آنکھیں اچکائیں۔

"آپ کے آفیسر ہماری بات نہیں سمجھ رہے تھے لیکن آپ نے ان کے کان میں جانے کیا کہا کہ وہ ہم سے تعاون کے لیے تیار ہو گئے۔" میں نے کہا۔

میری بات سننے کے دوران وہ اپنا سامان سمیٹ کر سیدھی ہوئی اور میرے بیڈ کے قریب آ گئی۔ پھر بولی۔

"آپ کی بات اس لیے ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ انہیں اس عالمی ریکٹ کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔" اس کے انکشاف پر میں چونک پڑا۔

"تو گویا آپ کے علم میں یہ تھا؟"

"بالکل!"

"لیکن......" میں بے چین ہو گیا۔

"ایزی۔" پریتی ہولے سے بولی۔ اس کا انداز مجھے بڑا معنی خیز محسوس ہوا تھا۔ وہ آگے بولی۔ "ہمیں بھی خالد کے ذریعے ہی یہ بات علم میں آئی تھی۔ افسوس کہ وہ ہلاک کر دیے گئے۔"

میری آنکھیں پھیل گئیں پھر میں نے جلدی جلدی اسے خالد اور اپنے تعلقات کے بارے میں بتا دیا۔

"اوہ...... تو تم وہی ڈاکٹر سیف ہو؟"

"یقیناً۔" میں نے سر کو جلدی سے اثبات میں جنبش دی اور اس سے بولا۔

"پلیز، آپ ہی ہماری مدد کریں۔ آپ کا یہ آفیسر آئزک مجھے بالکل گھامڑ لگتا ہے۔ ایک اور استدعا آپ سے کروں گا کہ خدا کے لیے...... زوہریہ کی سیکیورٹی سخت کروا دیں۔ ہمیں ایک مقامی پولیس آفیسر ابومعد پر شبہ ہے کہ وہ ان عالمی خونی سوداگروں کے ریکٹ سے ملا ہوا ہے۔ یہی نہیں زوہریہ اسی سے متعلق ہمیں کوئی اہم اطلاع بھی دینے والی تھی۔ پلیز! آپ جلد سے جلد ہماری اس سے ملاقات کروا دیں، ایسا نہ ہو کہ ان خطرناک مجرموں کو نکل بھاگنے کا کوئی موقع ہاتھ آ جائے، کیونکہ ہم پاکستان میں کافی حد تک اس کے نیٹ ورک کی بیخ کنی کرنے کے بعد یہاں بھی انہیں انجام تک پہنچانے ہی والے تھے۔"

پریتی میری باتیں بڑے غور و دھیان سے سن رہی تھی۔ وہ بھی مجھے رومی ہی کی طرح ایک باعزم اور ہمت والی

انٹرپول آفیسر محسوس ہوئی تھی۔ اس کی کشادہ آنکھوں میں صرف خوب صورتی ہی نہیں تھی بلکہ ان میں جوش بھی تھا۔

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی اور مجھ سے تشفی آمیز لہجے میں بولی۔ ”تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں سب دیکھ لیتی ہوں۔“ وہ جانے لگی۔ میں نے پھر اسے پکارا۔

”ٹھہرو، پلیز مس پریتی! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ رومی اور مجھے زوہریہ کے کمرے میں رہنے کی اجازت مل سکے۔“

”میں دیکھتی ہوں۔“ اس نے کہا اور جلدی سے نکل گئی۔ میرا دل و دماغ ایک بار پھر نجانے کیوں بے چینی کا شکار ہوگیا۔ حالات ہی ایسے تھے کہ کسی پر بھروسا کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے سوچا کہ بیڈ سے اتر کر کمرے سے نکل جاؤں لیکن میں ایسا نہ کرسکا۔ میرے بازو کا درد اب کافی بہتر تھا۔

تھوڑی دیر بیتی تھی کہ رومی اندر داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر مسرت رقصاں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولی۔

”یہ تم نے ہمارے جانے کے بعد اس خوب صورت سی حسینہ کو کیا گھول کر پلا دیا تھا؟“

”فی الحال تو یہ مجھے دوائیوں میں نجانے کیا گھول گھول کر پلا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”مذاق مت کرو، بتاؤ مجھے تم نے پریتی کو کیا پٹی پڑھائی تھی کہ وہ وہاں آکر تمہارا ہی نام جپنے لگی اور میری بھی لگی تعریفیں کرنے......“

میں مسکرا دیا اور ابھی جواب دینے ہی لگا تھا کہ پریتی نمودار ہوئی اور ہمیں ساتھ چلنے کا کہا۔

رومی نے مجھے سہارا دے کر بیڈ سے اتارا حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی لیکن شاید وہ وقت بچانا چاہتی تھی۔

ہم جس کمرے میں آئے، اسے دیکھتے ہی میرا دل مسرت سے بھر گیا۔

ایک بیڈ پر زوہریہ محوِ استراحت تھی۔ پتا نہیں وہ بے ہوشی میں تھی یا نیند میں تاہم ایک ”ڈاکٹر“ کی نظر سے وہ مجھے کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ یعنی خطرے سے باہر تھی اس کی حالت۔

پریتی ہم سے مخاطب ہو کے دھیرے سے بولی۔ ”تم دونوں اِدھر ہی بیٹھے رہو۔ تمہاری ساتھی کی حالت اب خطرے سے باہر ہے، یہ کسی وقت بھی ہوش میں آجائے گی تو تم اس سے وہ ضروری اور اہم بات پوچھ لینا، لیکن خود سے اسے مت جگانے کی کوشش کرنا، رائٹ؟“

ہم دونوں نے فدویانہ انداز میں اپنے سروں کو ہولے سے اثباتی جنبش دی۔ وہ چلی گئی۔ میں اور رومی ایک مسرت آمیز سی حیرت سے اسے تکتے رہ گئے۔

”کیا واقعی تقدیر اس طرح بھی مہربان ہو کے سارے کام آسان کر ڈالتی ہے؟“ میں ہولے سے جیسے خود کلامیہ انداز میں بڑبڑایا۔

”یقیناً۔ اس میں بھلا کیا شک ہے۔“ رومی نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

”کاش! یہ جلدی ہوش میں آجائے۔“ میں بے چینی سے بولا۔

”دھیرج! بھول گئے، پریتی زنٹا نے کیا ہدایت دی تھی ہمیں؟“ رومی مسکرا کے شرارتاً اس کا نام ایک معروف انڈین اداکارہ سے ملاتے ہوئے بولی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا زوہریہ کے بیڈ کے پاس پہنچا اور اس کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔

اس کا حسین چہرہ اس وقت ...... خوابِ غفلت میں مستغرق تھا۔ رنگت پیلی ہو رہی تھی۔ پھر میں نے اس کے سینے کے مدوجزر کا جائزہ لیا، وہ بھی مجھے بہتر ہی لگا۔

ڈرپ اسٹینڈ سے ایک سو سی سی کا وائل اور ہزار ایم ایل کی ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ شکر تھا کہ اب اسے آکسیجن کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی وقت مجھے عقب سے رومی کی آواز سنائی دی۔

”ادھر آکر بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ پریتی پر تم نے ایسا کیا جادو کیا کہ وہ......“

”شی ی ی......“ میں نے وہیں سے اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ اس کی سوئی ابھی تک وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ میں پلٹا اور واپس قریب دھری کرسی پر رومی کے قریب بیٹھ گیا۔

”بتاؤ نا......“ وہ بولی۔

”مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ تم میری بیوی ہو۔“ میں نے گھور کر اس سے کہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے اپنے نرم ہونٹوں میں مسکراہٹ کو دبانے کے انداز میں کہا۔

”تو اور کیا۔ بیویوں والے تجسس میں پڑ جاتی ہو تم، یوں جیسے شوہر نامدار نے کوئی گل کھلا دیا ہو۔“

''اے مسٹر! ہوشیار باشد، یہاں نہ کوئی بیوی ہے اور نہ ہی شوہر...... دماغ تو نہیں چل گیا ہے موصوف کا۔'' وہ بولی۔

''دیکھا، دیکھا...... وہی بیویوں والا لڑائی کا انداز...'' میں نے پھر اسے چھیڑا۔

''اچھا بتاؤ نا...... پلیز، مذاق چھوڑو۔''

''بھئی کیا بتاؤں، میں ہوں ہی اتنا ہینڈسم اور پُرکشش کہ عورتیں اور لڑکیاں فوراً میری باتوں میں آجاتی ہیں۔'' میں نے ذرا گردن اکڑا کر کہا۔

''اور بوڑھیاں......؟'' وہ ایک بھوں اچکا کر طنزاً بولی۔

''نہیں، تم جیسی نہیں آتیں میری باتوں میں......'' میں نے چوٹ کے بدلے چوٹ دی تو اس نے زچ ہو کر اپنے ایک ہاتھ سے میرا کان پکڑ لیا۔

''ارے...... رے باپ رے...... تم تو واقعی بیوی......''

''بس کرو اب یہ بیویوں والا راگ الاپنا......'' رومی غصے سے بولی۔ ''بتاؤ مجھے...... پریتی کیسے تمہاری باتوں میں آگئی؟''

''ارے بھئی تم بھی اچھی بھلی لڑائی بھڑائی میں ماہر ہونے کے باوجود گھامڑ ہی رہیں۔'' میں نے کہا۔ اس نے میرا کان چھوڑ دیا۔

''بھئی دیکھو، ذرا عقل بھی لڑا لیا کرو، انسان اپنی عقل سلیم اور سیلف آبزرویشن سے کئی معمے سلجھانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔'' میرا انداز مدبرانہ ہو گیا۔ وہ ہونٹ بھینچے سننے پر مجبور رہی اور میرا بیان جاری رہا۔

''بات ہماری حق اور ٹھوس حقائق پر مبنی تھی، اسی انداز میں اسے میں نے سمجھا دیا۔ لیکن آئزک کی سمجھ میں نہ آئی، اس لیے کہ اسے پہلے سے اس بلڈی ریکٹ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا مگر پریتی......''

''اچھا...... اچھا اب سمجھی......'' رومی فوراً تفہیمی انداز میں بولی۔ ''یہ کہو نا کہ اسے پہلے سے ان کے بارے میں رپورٹ تھی۔''

''ہاں! لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ ایک ہی ڈپارٹمنٹ کے دو میں سے ایک کے تو علم میں ہے مگر آئزک جو کہ ان کا فرسٹ یا سیکنڈ کمانڈ آفیسر ہے، اسے کچھ بھی نہیں معلوم؟'' میں نے آخر میں اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

''ہوگا اُسے بھی علم......'' رومی بولی۔ ''لیکن وہ اسے اہمیت نہیں دینا چاہتا ہوگا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں بدک کر بولا۔ ''وہ انٹرپول جیسے ایک اہم عالمی قانونی ادارے کا آفیسر ہے اور......''

''ہوتے ہیں بعض ایسے سر پھرے آفیسر۔'' رومی نے میری بات کاٹی۔ ''اب تم اس...... بحث کو چھوڑو۔ پریتی ہم سے سنجیدہ ہے نا، بس یہی کافی ہے۔'' پھر اچانک اس کی نگاہ بیڈ پر پڑی اور اس کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''ارے...... شاید زوہریہ کو ہوش آرہا ہے۔''

میں نے چونک کر بیڈ کی جانب دیکھا۔ زوہریہ سر کو بہت دھیرے دھیرے دائیں بائیں ہلا رہی تھی۔ پریتی نے صحیح کہا تھا کہ یہ تھوڑی دیر بعد ہی ہوش میں آجائے گی۔

میں یک دم کرسی سے اٹھا اور اس کی جانب بڑھا۔ وہ آنکھیں کھول بند کر رہی تھی۔

''زز...... زوہریہ!'' میں نے اس پر جھک کر آہستگی سے اسے آواز دی۔ میری آواز سن کر اس کا دائیں بائیں ہلتا سر ایک جگہ پر رک گیا۔

''تم اب کیسی ہو؟'' میں نے... کہا۔ میری نظریں اس کے نیم مردہ سے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے آواز کی سمت پر ہی سر ایک جگہ تکیے پر ٹکا دیا، وہ اب آنکھیں کھول اور بند کر رہی تھی، پھر جیسے یہ وقفہ بڑھا تو وہ اپنی نگاہیں میرے چہرے پر ٹکانے کی کوشش کرنے لگی۔

ایسی حالت میں اس کے پپوٹے کپکپانے لگے۔ ہونٹوں پر لرزا تھا۔ وہ نیم وا بھی ہوئے، یوں جیسے بولنے کی کوشش کرنا چاہتی ہو۔ اس کی یہ بے بسی دیکھ کر میرے اندر دکھ اور کرب کی لہر ابھری۔ میں نے پھر ہولے سے اسے پکارا تو رومی نے بہت دھیرے سے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''تھوڑا وقفہ کرو......'' وہ بھی شاید اس کی ہیئت کذائی کو محسوس کر رہی تھی۔

''سس...... سیف......!'' بالآخر زوہریہ کے کپکپاتے ہونٹوں سے میرا نام برآمد ہوا۔

''ہاں...... ہاں، یہ میں ہوں سیف!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اور...... یہ رومی بھی، ہم دونوں تمہارے بہت پاس ہی موجود ہیں۔''

''رر...... رومی!'' زوہریہ کے لب پھر تھرکے۔ وہ بھی قریب ہو گئی۔ زوہریہ اپنی نیم وا آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگی۔

''تت...... تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟'' اس بار

رومی نے پوچھا۔
''تم...... میں...... ٹھیک...... لل...... لیکن......''
زوہریہ کہتے کہتے رکی۔
''ہاں...... ہاں! بولو...... کیا...... لیکن؟'' میں نے اسے اُکسایا۔
''وہ...... وہ...... انکل معد...... رر...... میش...... ال...... البحر......''
بہ مشکل یہ بتاتے ہوئے اس نے پھر اپنی آنکھیں موند لیں اور...... سر ایک جانب ڈال دیا۔
''اسے کیا ہوا؟ کک...... کہیں خدانخواستہ......'' رومی ڈر گئی۔
''خاموش، یہ نیم غنودہ ہے، بے ہوش ہوگئی ہے یا نیند میں چلی گئی ہے۔ شاید یہ اینستھیسیا کے اثر سے پوری طرح نہیں نکلی ہے۔'' میں نے کہا۔
میری بات پر رومی کو ذرا تسلی ہوئی۔ میں پھر بھی زوہریہ کی کیفیات کو ایک ڈاکٹر کی نظر سے دیکھتا رہا۔ اس کا تنفس درست کام کر رہا تھا۔ چہرے پر کمزوری کے آثار تھے۔ تاہم وہ بہتری کی جانب تھی۔ میں اور رومی دوبارہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔
ہم دونوں ہی بے چین تھے۔ ہم سننا چاہتے تھے کہ زوہریہ ہمیں ابومعد یا رمیش سے متعلق وہ کون سی اہم بات بتانا چاہتی تھی، جس کے سبب ہم پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا تھا۔
''اس نے تین نام لیے تھے۔'' رومی ہولے سے بڑبڑائی۔
''ہاں! ایک...... انکل معد...... دوم...... رمیش اور...... سوم...... البحر......'' میں نے بھی جواب میں اسی بڑبڑاہٹ سے کہا۔
''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' رومی بولی۔
''یہی کہ تینوں اسم معرفہ ہیں۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا۔
''میں اردو گرائمر کا نہیں پوچھ رہی ہوں۔'' رومی بھنّائی۔
''تب پھر تم ضرور پوچھ رہی ہو گی کہ یہ تینوں نام شناسا ہیں کہ نہیں۔'' میں نے کہا۔
''ظاہر ہے شناسا ہی ہیں۔'' وہ بولی۔ ''لیکن وہ کیا بتانا......'' دفعتاً ہی رومی کو محسوس ہوگیا کہ میں اسے تپا رہا ہوں، وہ ایک دم آنکھیں نکال کر بولی۔
''تمہیں ایسے حالات میں بھی مذاق سوجھتا ہے؟''
''میں نے کب مذاق کیا؟'' میں انجان بن گیا۔
''ظاہر ہے بھئی، زوہریہ ہمارے سامنے موجود ہے، تھوڑی دیر میں وہ دوبارہ ہوش میں آجائے گی تو ہمیں بتا دے گی، بلاوجہ اپنی دماغ کی چولیں ہلانے کا کیا فائدہ؟''
''تم ایک نمبر کے بدمعاش ہو۔'' رومی زچ ہو کے بولی۔
وہ چپ ہوگئی۔ یہ اپنے اپنے سوچنے کی بات ضرور تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ...... انکل معد، رمیش اور البحر...... اس سے کیا مطلب نکل سکتا ہے؟
''البحر وہی ساحلی علاقہ تو نہیں...... جہاں ہم کچھ دن پہلے بھی......''
''قدم رنجہ فرما چکے ہیں۔'' میں نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ وہ چپ رہتے رہتے اچانک بولی تھی۔
''تو اس سے کیا ظاہر ہوا؟'' اس کا لہجہ سوالیہ تھا۔
''یہی کہ انکل معد اور ڈاکٹر رمیش، البحر کے ساحلی علاقے میں پکنک منانے کے لیے گئے ہوئے ہیں۔'' میں مدھم لہجے میں کہا۔
''میں تمہیں مار بیٹھوں گی۔'' رومی بُری طرح چڑ گئی۔
''بور کر رہے ہو تم...... آخر تبادلۂ خیال کرنے میں کیا حرج ہے؟''
''تبادلۂ خیال اس صورت میں ہوتا ہے جب اس کی ضرورت ہو۔'' میں نے اسی اطمینان سے کہا۔ ''ابھی چند سیکنڈ میں زوہریہ دوبارہ ہوش میں آجائے گی، وہ ساری بات واضح کر دے گی۔''
''میں بھول جاتی ہوں کہ تم ایک ڈاکٹر ہو اور میں ایک انٹرپول جاسوس...... بہت زمین آسمان کا فرق ہے تمہاری اور میری سوچ میں......'' اس نے غبار نکالا۔
''درست فرمایا۔'' میں بھی باز نہیں آیا۔ ''ایک ڈاکٹر خیالی پلاؤ بنانے میں دماغ نہیں کھپاتا، بشرطیکہ کہ حقیقت اس کے سامنے ہو......'' کہتے ہوئے میں نے زوہریہ کے بیڈ کی جانب اشارہ کر دیا اور آگے بولا۔ ''جبکہ ایک جاسوس......''
''اچھا...... بس...... بس!'' رومی نے مجھے خاموش کروا دیا۔
ذرا ہی دیر بعد...... دروازہ کھلا۔ ہم دونوں چونکے۔ ایک عورت اور ایک مرد مخصوص یونیفارم میں اندر داخل ہوئے۔ عورت نرس تھی اور مرد ڈاکٹر لگتا تھا۔
نرس نے ہاتھ میں ٹرے تھام رکھی تھی اور ڈاکٹر کے گلے سے اسٹیتھس اسکوپ جھول رہا تھا۔

رومی انہیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی مگر میں بیٹھا ان دونوں کی طرف غور سے تکتا رہا۔
ان دونوں نے بھی ایک بہ نظر غائر ہم پر ڈالی تھی اور پھر زوہریہ کے بیڈ کی طرف بڑھ گئے۔ رومی بھی ان کے ساتھ بڑھی تھی جبکہ میں ہنوز اپنی کرسی پر بیٹھا ان دونوں کو گھورتا رہا۔
''ڈاکٹر صاحب! یہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہوش میں آئی تھی۔'' رومی نے بے چینی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا ڈاکٹر اور نرس نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ان کا انداز مجھے چونکا گیا تھا، وجہ یہی تھی کہ پہلے ان دونوں نے رومی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی مگر جب رومی نے یہ کہا تو ان دونوں کے چہروں پر عجیب تاثرات ابھرے تھے۔ کیوں؟
اس ''کیوں'' نے مجھے بے چین کر دیا اور بالآخر میں نے بھی اپنی جگہ چھوڑ دی اور ان کی جانب بڑھا۔
''کچھ بات کی تھی اِس نے تم سے......؟'' ڈاکٹر نے رومی سے کچھ اس انداز میں سوال کیا جو مجھے ایک ڈاکٹر ہی کی حیثیت میں بالکل ہی غیر متعلقہ لگا تھا۔
''ہاں! بس یہی چند اک جملے......'' رومی بولی۔ میں خاموش رہا اور ڈاکٹر کے لہجے سے کچھ ''اخذ'' کرنے کی کوشش کرتا رہا۔
''کون سے جملے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ نرس کی یک ٹک نگاہیں بھی رومی پر جم گئی تھیں۔ وہ دونوں جیسے مریض کو دیکھنا ہی بھول گئے تھے اور اب رومی پر متوجہ تھے۔ میرے اندر کھٹک ہونے لگی۔
''فقط...... یہی کہ......''میں کہاں ہوں۔'' رومی کے بجائے میں نے جواب میں کہا اور دانستہ جھوٹ بولا۔
''ہم......'' ڈاکٹر کے منہ سے نکلا۔
''آپ دونوں اپنی جگہ پر تشریف رکھیں......'' نرس نے ہم دونوں سے کہا۔ رومی تو جھٹ اپنی جگہ پر جا کے براجمان ہوگئی لیکن میں وہیں کھڑا رہا۔
''آپ......؟'' ڈاکٹر نے میری جانب سوالیہ کم اور ناگوار نظروں سے دیکھا، یوں جیسے حکم عدولی پر اسے مجھ پر غصہ آ رہا ہو۔
''جی میں......!'' میں نے کہا۔ ''میں بھی ایک ڈاکٹر ہوں۔'' میرے لہجے میں کھنڈی ہوئی سنجیدگی عود کر آئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر یا نرس کی ناراضگی یا ناگواری کی مطلق پروانہ کی تھی۔

میں جو بُو محسوس کر رہا تھا، وہ دوائیوں سے زیادہ کسی اور شے کی تھی۔ یہ ایک غیر مرئی بو تھی، جو صرف اندر کے احساسات کا شاخسانہ تھی۔
''اچھی بات ہے۔'' ڈاکٹر نے کہہ کر ہونٹ بھینچے۔
اسی دوران نرس ٹرے لیے کچھ اس انداز میں میرے قریب آئی اور پھر مجھے ذرا ایک طرف ہونے کا اشارہ دیتی ہوئی زوہریہ کے سرہانے کے قریب ہوئی کہ میں اس کی اور نہ ڈاکٹر کی کوئی ''حرکت'' ملاحظہ کرسکوں۔ ڈاکٹر نے صاحبِ فراش زوہریہ کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔
میں بھی ایک ڈھیٹ ہی تھا، ان کی حرکات وسکنات دیکھنے جانچنے کے لیے ایک طرف سے سرک کر دوبارہ زوہریہ کے بیڈ کے دوسری جانب آن کھڑا ہوا۔
ہم سے ذرا دور دروازے کے قریب رکھی کرسی پر رومی خاموش بیٹھی ہماری جانب ہی تکے جا رہی تھی۔
ڈاکٹر اور نرس کو میری یہ ''حرکت'' پھر ناگوار گزری تھی مگر ان میں مجھے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوسکی۔ تاہم میں نے دیکھا وہ کچھ تذبذب کا شکار ہونے لگے تھے، نرس نے بھی کن انکھیوں سے ڈاکٹر کی جانب دیکھا تھا، جیسے کہہ رہی ہو۔ ''اب کیا کریں؟'' اس کا ڈاکٹر کے چہرے پر نگاہ ڈالنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا۔
ڈاکٹر نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ وہ بہ ظاہر پروفیشنل انداز میں زوہریہ کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ پھر اس نے نرس سے کچھ کہا اور خود چند قدم پیچھے ہوا۔ نرس دونوں ہاتھوں میں ٹرے لیے سرہانے کے اور قریب آئی، ٹرے رکھی، پھر اس میں سے کوئی انجکشن نکال کر سرنج میں بھرنے لگی۔
میری بہ غور نظریں وائل اور اس کے لیبل پر جمی ہوئی تھیں۔ انجکشن کے نام سے میں واقف تھا اور اس کے محلول کی رنگت سے بھی، مگر جس نام کا وائل تھا، اس نام سے وائل، محلول مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ شاید ان کے گمان میں بھی نہ ہو گا کہ میں اس قدر گہرائی تک بھی جا سکتا ہوں۔
''جسٹ اے منٹ......پلیز!''
نرس جب زوہریہ کی ڈرپ میں وہ انجکشن ایڈ کرنے لگی تو میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ ڈاکٹر سمیت نرس نے چونک کر میری جانب دیکھا تھا۔
''یہ انجکشن کچھ اور ہے اور اس کے محلول کی رنگت کچھ اور......''
''آپ پلیز! ہمیں کام کرنے دیں اور اپنی جگہ پر

جا کے بیٹھ جائیں۔'' ڈاکٹر کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔ نرس مجھے پریشان زدہ نظر آنے لگی۔ حالات دیکھ کر رومی بھی اٹھ کر ہمارے قریب آگئی۔

''ڈاکٹر! میں اپنا کام ہی کر رہا ہوں لیکن تم کچھ اور کرنا چاہ رہے ہو۔'' میں نے اس بار اسے گھورتے ہوئے یکسر بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اب میں آپ سے کہوں گا کہ برائے کرم اپنی نرس سمیت زوہریہ کے بیڈ سے دور ہو جائیں...... میں اس انجکشن اور آپ دونوں سمیت انکوائری کروانا چاہتا ہوں۔''

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک نرس نے اپنی یونیفارم کا شارٹ اسکرٹ اوپر کیا تو اس کی گوری چٹی سبک رانوں سے چپکی ہوئی بلیک کلر کی اسٹاکنگ میں مجھے پستول اڑسا ہوا نظر آگیا، اس کی لمبی نال سے اندازہ ہوا وہ سائلنسر لگا تھا، جبکہ اس کا ساتھی ڈاکٹر اپنے سفید کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی لگا تھا کہ رومی جو تب تک محتاط ہو چکی تھی، یک دم اس نے عقب سے ڈاکٹر کو اس کی نرس پر دھکا دیا۔

میرا کام ہو چکا تھا، باقی کام میں رومی کے نمٹانے کے لیے چھوڑنا چاہتا تھا، مگر وقت اور اس کی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے بھی اپنی سی کوشش چاہی اور...... جھک کر ٹرے اٹھا کے اور اس کے لوازمات سمیت وہ...... نرس کی جانب بڑے زور سے اچھال دی، کیونکہ ڈاکٹر سے اس وقت رومی نبرد آزما تھی اور نرس لڑکھڑانے کے بعد سنبھالا لینے کی کوشش میں تھی کہ میری پھینکی ہوئی ''اُڑن طشتری'' نے اس کے سر کی تواضع کر ڈالی، نتیجے میں وہ چیخی اور پھر بھی اس نے پستول نکالنے کی دوبارہ کوشش چاہی تھی کہ تب تک میں بھی اس کے سر پر پہنچ گیا۔

اس کا ہاتھ جیسے ہی اوپر اٹھے اسکرٹ کے اندر اسٹاکنگ پر پڑا، میں اس کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا، مگر اس نتیجے میں میرا پاؤں بھی اٹکا اور میں سیدھا اس کے قدموں پر جا پڑا۔ وہ ابھی پستول نکال رہی تھی کہ میں نے نیچے جھکے جھکے ہی اس کے پستول پر ہاتھ جما دیا جو ہنوز اس کی اسٹاکنگ میں پھنسا ہوا تھا کہ میں نے زور سے جھٹکا دیا، پستول ہاتھ میں کیا آنا تھا البتہ اس کی اسٹاکنگ اوپر تک پھٹتی چلی گئی اور اسکرٹ بھی پہلے سے زیادہ اونچا ہو گیا۔

نرس نے کپکپاتی کراہ خارج کرتے ہوئے اپنی ایک ٹانگ کا گھٹنا میرے سر پر مارا، میرا سر پہلے ہی کسی اور وجہ سے گھوما ہوا تھا کہ اس جسمانی چوٹ نے...... مزید گھما دیا، جسے میں نے اپنی جارحانہ طاقت کے جوش تلے کنورٹ کیا اور غراتے ہوئے اکڑوں ہو کر اس کے پیٹ پر سر کی ٹکر رسید کر ڈالی۔ وہ چیخ کر کئی قدم پرے جا پڑی۔ پستول ''ٹھن...... ٹھن'' کرتا فرش پر گرا۔

میں اسی وقت اسے اُچکنے کو لپکا تھا کہ رومی کی کراہتی ہوئی چیخ میرے کانوں سے ٹکرائی اور ساتھ ہی اس کا سبک ''ٹھمکا'' میرے سر پر لگا۔

میں اب مزید اپنے سر کے گھومنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ فرش پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے ہی میں گھوما اور پٹ سے گرا۔

رومی تب تک سنبھل چکی تھی، شاید مجھ سے ٹکرانے پر اسے سنبھلنے کا سہارا مل گیا تھا۔ وہ دوبارہ جنگلی بلی کی طرح غراتی ہوئی ڈاکٹر پر جھپٹی تھی۔

اسی دوران میری نیم غنودہ سی آنکھوں نے ایک منظر دیکھا، نرس نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا تھا اور پستول کی جانب لپکی...... بقا کی اس جنگ نے مجھے بھی کچھ جگایا اور میں نے وہیں سے اچھال ماری۔

پستول پر بیک وقت ہم دونوں ہی گرے تھے، مگر وہ ہاتھ کسی کے نہ آیا۔ مجھے ایک موقع ملا اور میں نے اپنے دائیں بازو کی کہنی نرس کی ٹھوڑی پر رسید کر دی۔ وہ زور سے کراہی اور پیچھے کو الٹ گئی۔ میں نے جھپٹ کر پستول اٹھا لیا۔

''خبردار!'' میرے منہ سے نکلا۔ نرس میرے نشانے پر تھی۔

''خبردار!'' یہ ڈاکٹر کے منہ سے برآمد ہوا تھا۔ رومی اس کے نشانے پر تھی۔

اب صورتِ حال کچھ عجیب سی تھی۔ میرے ساتھ رومی کھڑی تھی مگر وہ اس جلاد مسیحا ڈاکٹر کے نشانے پر تھی، جبکہ نرس اس مردود ڈاکٹر کے قریب نہتی کھڑی تھی اور اپنے ہی پستول کے نشانے پر تھی۔

''کیا کہتے ہو؟'' اس مردود ڈاکٹر نے جو بلاشبہ اپنی نرس کے ساتھ صاحبِ فراش زوہریہ کو ختم کرنے آیا تھا، مکارانہ مسکراہٹ سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہی کہوں گا کہ تم دونوں اپنی زندگیوں کی خیر چاہتے ہو تو کمرے سے نکل جاؤ۔'' میں نے اس اُلجھی ہوئی سچویشن سے بے نیاز ہو کر کہا۔

''ہرگز نہیں...... ہم سر سے کفن باندھے ہوئے ہیں اور اپنا کام کر کے ہی جائیں گے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر نے نہایت پھرتی کے ساتھ اپنی پستول کا رخ دائیں بازو پر لیٹی

ہوئی زوہریہ کی جانب کردیا۔

رومی کے حلق سے خوف کے مارے سسکی نکل گئی، اُدھر نرس نے بیک وقت جست بھری۔ میں پل کے پل دونوں کی چالاکی سمجھ چکا تھا۔

نرس کے چھلانگنے کا مطلب ہی میری توجہ ڈاکٹر کی جانب سے ہٹا کر اپنی جانب کروانا مقصود تھا تاکہ ڈاکٹر کو زوہریہ پر گولی چلانے کا موقع مل جاتا، لیکن میں نے نرس پر فائر کرنے کے بجائے ڈاکٹر پر گولی چلادی۔

میرا نشانہ اتنا کچا نہیں ہوسکتا تھا کہ میں اس کے پستول والے ہاتھ پر گولی چلانے کا رسک لیتا کیونکہ نشانہ خطا جانے کی صورت میں وہ زوہریہ پر فائر کرچکا ہوتا، اسی لیے میں نے ڈاکٹر کے سینے کا نشانہ لیا تھا، جو بے خطا نہیں گیا۔ وہ چیخ مار کے گرا۔ گولی چلانے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی۔

اُدھر نرس نے جو دیکھا کہ ان کی چال الٹ گئی ہے، وہ جنون میں آگئی اور وہیں سے زخمی بلی کی طرح غراتی ہوئی، زوہریہ کے بیڈ کی جانب لپکی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا گلا دبا کر مار ڈالے۔

لگتا ایسا ہی تھا جیسے ان دونوں کو ہر قیمت پر زوہریہ کو قتل کرنے کے آرڈر ملے ہوئے تھے۔ جبھی اس نے میرے پستول کی بھی پروانہ کی تھی۔

"گولی مت چلانا۔" رومی چیخی اور وہ بھی گویا بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس کی جانب لپکی۔ میں اپنے پستول کی نال سے نکلتے دھوئیں کو دیکھنے لگا۔ رومی، نرس پر پل پڑی تھی اور اسے ادھ موا کرڈالا۔

پھر میں نے اس کے کہنے پر بیل بجادی۔ وہاں شور مچ گیا۔ وہی آفیسر آئزک اور چند دیگر اسٹاف سمیت دو ایک پولیس کی وردی میں بھی ماتحت اندر در آئے۔ پریٹی بھی ان کے ہمراہ تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ آفیسر آئزک کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

القصہ...... اگلے ...... ایک گھنٹے بعد صورتِ حال واضح ہوچکی تھی۔ یہ دو افراد جو ڈاکٹر اور ایک نرس کے ہی بہروپ میں یہاں زوہریہ کو زہر کا انجکشن لگا کے ختم کرنے آئے تھے، وہ دشمنوں کے ہی بھیجے ہوئے تھے، جو یہاں ایک ڈیوٹی ڈاکٹر اور ایک نرس کو قابو کرکے انہیں بے ہوشی کے عالم میں رسن بستہ کرنے کے بعد...... زوہریہ کے وی آئی پی روم میں آگئے تھے۔

یوں صورتِ حالات کی سنگینی نے اس ہٹ دھرم اور خرانٹ انٹرپول آفیسر آئزک کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کرڈالا تھا۔

اس کے بعد میرے ایما پر زوہریہ کو کسی اور کمرے میں منتقل کردیا اور...... ہمیں بھی اب مستقل اس کے کمرے میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ اس میں بھی اگرچہ پریٹی کا ہی دخل تھا، لیکن ہماری بھی تھوڑی دیر پہلے والی پیش آمدہ کارروائی نے انہیں یہ باور کرادیا تھا کہ یہ لوگ کتنے "اہل" تھے۔ آفیسر آئزک تو ہم سے نظریں تک ملانے سے اب رہ گیا تھا۔

تب تک زوہریہ بھی پوری طرح ہوش میں آچکی تھی اور اسے بھی ساری بات بتادی گئی۔ وہ خوف زدہ بھی تھی اور پریشان بھی۔

اس نے ہم سے گزارش کرڈالی کہ جلد از جلد اس کے پپا (یعقوب ترمذی) کو اس کی حالت کے بارے میں انفارم کردیا جائے۔

میں نے اس سلسلے میں زوہریہ کی پوری تسلی کروادی اور اس سے کہا کہ وہ ابومعد اور رمیش کے بارے میں کچھ بتانا چاہتی تھی۔

"میں نے اسی لیے یہ کہا تھا کہ...... میرے پپا کو پہلے میرے بارے میں انفارم کردیں۔" وہ بولی۔ "اس لیے کہ آپ دونوں کو میری وجہ سے یہاں باؤنڈ ہونا پڑ جائے گا اور...... وہ دونوں اس ملک سے فرار ہوجائیں گے، آہ...... شاید میری قربانی رائگاں چلی گئی۔ وہ اب تک جاچکے ہوں گے۔" وہ کفِ افسوس ملنے لگی۔ رومی اور میں ہونقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

"آخر بتاؤ تو سہی معاملہ کیا ہے؟" رومی نے بالآخر جھلّا کے کہا۔ میں نے اسے گھورا۔ گویا "ریلیکس" رہنے کی اسے تنبیہ کررہا ہوں۔

"یہاں ابومعد ہی درپردہ ان خونی سوداگروں سرجن امرناگ اور ڈاکٹر رمیش کو سپورٹ کررہا تھا۔" بالآخر زوہریہ نے بتانا شروع کیا اور میں اور رومی بہ غور اس کی بات سنتے رہے۔ وہ آگے بولتی رہی۔

"تم دونوں کو میری اور ابومعد کے درمیان ہونے والی اُس روز کی ٹیلی فونک گفتگو یاد ہے نا...... جب میں تمہارے ہوٹل آئی تھی۔"

رومی اور میں نے اس کی بات پر بیک وقت یوں اپنے سروں کو اثباتی جنبش دی جیسے کوئی ٹیچر ہم سے پوچھ رہا ہو کہ ہمیں سبق یاد ہے نا؟

''اسی دن سے مجھے بھی ان پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں کوشش کرتی کہ اس معاملے میں زیادہ سے زیادہ ان کے قریب رہوں، اب پتا نہیں یہ اسی وجہ سے ہوا یا پھر کوئی اور بات رہی ہو، میں نے اتفاق سے ان کی گفتگو کا وہ حصہ سن لیا جو وہ ڈاکٹر میش سے اپنے سیل فون پر کر رہے تھے۔

''وہ اسے خبردار کرتے ہوئے بتا رہے تھے کہ رمیش اور امرناگ کو کچھ دنوں کے لیے انڈر گراؤنڈ چلے جانا چاہیے اور اس کے لیے بہترین طریقہ یہی ہے کہ وہ جلد سے جلد سمندری راستے انڈیا کی طرف نکل جائیں۔ امرناگ تو جہنم واصل ہو چکا ہے۔ البتہ ڈاکٹر میش اگروال کے بارے میں یہ خبر میرے علم میں آگیا کہ وہ...... البحر کے ساحلی راستے کے ذریعے ابومعد کی مدد سے فرار ہونے کی کوشش میں ہے۔ آخری وقت میں ابومعد کو پتا چل گیا کہ میں نے اس کی ساری گفتگو سن لی ہے اور وہ...... باقی تو تمہیں معلوم ہی ہے، لیکن افسوس......'' وہ اتنا بتا کر رکی اور متاسفانہ لہجے میں دوبارہ بولی۔

''شاید ڈاکٹر میش اب تک فرار...... ہو چکا ہوگا۔''

وہ خاموش ہوگئی۔ میں اور رومی سوچ میں پڑ گئے۔ میں مایوس نہ تھا، زوہریہ کو بے شک اطلاع کرنے میں تاخیر ہوئی تھی مگر میں ڈاکٹر میش کے تعاقب میں اسی وقت البحر جانا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر میش کو تو میں کسی قیمت پر بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس بدذات نے میرے ساتھ بہت پہلے ہی سے کینہ اور بغض پال رکھا تھا۔ اسی انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے رمیش نے مجھے ذہنی اذیتوں میں مبتلا کرنے کا وہ بھیانک اور سفاکانہ منصوبہ بنایا تھا جس کی پاداش میں میرا بھائی عادل اس کی بھینٹ چڑھا۔

میں بھلا وہ منظر کیسے بھول سکتا ہوں جب اس مردود و ملعون رمیش نے چودھویں فلور پر مجھے وہ جار نما ڈبے تھامے میری طرف بڑی نفرت اور زہریلے انداز سے دیکھا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ مجھے وہیں مزید اذیت دینے کے لیے یہ بتا بھی ڈالتا کہ جو ڈبے اس نے تھامے ہوئے ہیں، اس میں میرے معصوم بھائی کے اعضا ہیں۔

''لیکن ہمیں...... اس دھوکے باز ابومعد کے خلاف تو قانونی ایکشن لینا ہی چاہیے۔'' رومی نے اپنی کہی۔

''ابھی اس وقت زیادہ ضروری البحر جانا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ابومعد کو قانونی گرفت میں لینے کا پروسس اتنا آسان نہیں ہے۔ ہمیں فوراً سے پیشتر نکلنا چاہیے۔''

☆☆☆

یعقوب ترمذی کو فون کر کے بلا لیا گیا تھا، زوہریہ کی سیکیورٹی کے انتظامات بھی سخت کر دیے گئے تھے۔

پریتی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی جان پر بھی کھیل جائے گی اور زوہریہ پر آنچ تک نہ آنے دے گی، یہی کچھ ہم نے زوہریہ کے باپ کو بھی باور کرا دیا تھا کہ اس کی بیٹی کی جان کس قدر خطرے میں ہے اور ابومعد اس وقت اس کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے۔ یعقوب ترمذی نے اس کے خلاف خود ہی قانونی کارروائی کا تہیہ کر رکھا تھا۔ پریتی کی مدد شامل تھی۔

لہٰذا زوہریہ کے بیان دینے کے بعد اب چونکہ حالات کچھ اور نہج اختیار کر چکے تھے اسی لیے مقامی پولیس کو بھی اس کی تفصیلی ''بریفنگ'' کے بعد خبر کر دی گئی تھی۔

یوں مقامی اور انٹرپول پولیس کی ایک دس رکنی مشترکہ ٹیم آفیسر آئزک سمیت ہمارے ساتھ تین گاڑیوں میں روانہ ہوگئی۔

رومی ان کے ہمراہ تھی جبکہ مجھے ساتھ نہیں لے جایا گیا تھا اور میں اس بات پر اندر ہی اندر کڑھتا رہا کہ رومی نے مجھے ساتھ لے جانے کے لیے کوشش کیوں نہ کی تھی، خیر، وہ بھی مجبور تھی۔ میں نے اس بات کو زیادہ دل پر نہیں لیا۔

میں اب آزاد تھا اور بالآخر میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ عود کر آئی۔ زوہریہ کا بیان میری سماعتوں میں ہنوز گردش کر رہا تھا۔

دل میں خیالات آنے لگے کہ رمیش فرار ہو چکا ہے۔ ابومعد کے سلسلے میں یہ خوش کن خبر سننے کو ضرور ملی کہ اسے زوہریہ کے بیان کے بعد فوراً ہی حراست میں لے لیا گیا تھا۔

یہ سارے معاملات ایک طرف ہونے کے بعد میں نے اپنی مہم کا آغاز کیا اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو کے سیدھا اپنے ہوٹل پہنچا اور کمرے میں جا کر جلدی جلدی ریڈی میڈ میک اَپ کرنے لگا، ہوٹل میں داخل ہونے اور میک اَپ کرنے کے بعد باہر نکلنے تک مجھے کم و بیش گھنٹا ہی لگا تھا۔ اس کے بعد میں دوبارہ ٹیکسی کر کے سیدھا مارگریٹ کی رہائش گاہ جا پہنچا۔

یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ میں نے مطلوبہ رہائش گاہ سے چند قدم دور ہی ٹیکسی رکوالی تھی اور پھر ڈرائیور کو کرایہ دے کر چلتا کر دیا۔

اس کے بعد چند ثانیے میں گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا

پھر آگے بڑھ گیا۔

رہائش گاہ پر سناٹا طاری تھا۔ فضا ہلکی سرد تھی، سنہری دھوپ چمک رہی تھی اور آسمان صاف تھا۔

میں نے دروازے کے قریب پہنچ کر کال بیل پر انگلی رکھ دی۔

اس لمحے میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اور اعصاب کشیدہ تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میرا یہاں بھی کشاکشی والے حالات سے سابقہ پڑ چکا تھا۔ اب یہاں کے کیا حالات ہو سکتے تھے، وہ نہیں جانتا تھا۔ امید تو تھی کہ اب سکوت ہوگا اور تسلی یہ تھی کہ میں میک اَپ میں تھا۔

اس طرح یہاں آنے کا ایک مقصد میرا یہ بھی تھا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا مارگریٹ کہاں تھی؟ امرناگ مر چکا تھا...... اب وہ کیا کر رہی تھی۔ یہی جستجو مجھے یہاں لے آئی تھی۔

بہرکیف...... اس کے بعد میرا البحر روانہ ہونے کا ارادہ تھا۔ ہائی ونڈ نہیں، بلکہ اس کے نام نہاد انکل روڈی کے کاٹیج کی طرف۔

دو بار کال بیل بجانے کے بعد ایک ادھیڑ عمر ملازمہ نے دروازہ کھولا۔ یہ پہلی والی ملازمہ نہیں تھی، ہوتی بھی تو اس نے کون سا مجھے پہچان لینا تھا۔

میں نے نہایت ادب سے اسے گڈ آفٹر نون کہا اور مارگریٹ کے بارے میں دریافت کیا۔

ملازمہ ''سکھائی پڑھائی'' ہوئی لگتی تھی۔ وہ بہ غور میرا نیچے سے اوپر تک جائزہ لینے کے بعد بولی۔ ''آپ کون؟''

''میں ان کا ایک واقف کار ہوں، جون نام ہے میرا۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے مگر میں نے بھی اصرار نہیں کیا اور اسی طرح اخلاق سے بولا۔

''او کے، میں پھر کبھی آجاؤں گا، ویسے میں چاؤز کے سلسلے میں...... اچھا چلیں چھوڑیں۔'' میں نے دانستہ مارگریٹ کے شوہر کا نام لیا اور اسے گڈ بائے کہتے ہوئے واپس پلٹا۔ حسبِ توقع اس بڑھیا نے عقب سے بے ساختہ پکارا۔

''ایک منٹ ٹھہریئے۔''

میرے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ کھنچ گئی۔ میرا نفسیاتی حربہ کامیاب رہا تھا۔

''جی محترمہ! آپ نے مجھے پکارا؟'' میں ایک دم معصوم بن گیا۔

''آپ مسٹر چاؤز کے بارے میں......'' وہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

''جی ہاں انہی کے بارے میں کچھ بات کرنا تھی......'' میں نے بھی فوراً کہا۔

''آپ ایک منٹ انتظار کریں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' میں نے اسی خوش خلقی سے جواباً کہا۔ ملازمہ شٹر لگا کر اندر لوٹ گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ لوٹی اور مجھے اندر آنے کو کہا۔ وہ مجھے اسی نشست گاہ میں بٹھا کر کسی کمرے کی طرف چلی گئی، جہاں پہلے بھی میں اور رومی آچکے تھے اور ہوم الون بچّے کی کارگزاری کا نتیجہ بھگتا تھا۔

اگرچہ اندر سے میں اب بھی اس ''بچّے'' سے خائف تھا۔ وہ کم بخت بلا کا ذہین تھا۔ مجھے یہی ڈر تھا کہ کہیں وہ مجھے پہچان نہ لے اور ایک بار پھر دھماچوکڑی نہ مچ جائے۔

بہرحال میں اندر سے محتاط تھا۔ ذرا ہی دیر بعد میں نے مارگریٹ کو نمودار ہوتے دیکھا۔ جونی ساتھ نہیں تھا، میں نے شکر بھی کیا مگر پھر ایک اندیشناک خیال آیا کہ کہیں وہ کم بخت میکولی کی اولاد اپنے خطرناک کھلونا نما ہتھیاروں سمیت کسی کھڑکی کے ساتھ چپکا مجھے دیکھ نہ رہا ہو۔

اسے دیکھتے ہی میں احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ ہی نہیں بلکہ حلیہ بھی دیکھ کر میرا دل کسی افسوسناک احساس تلے یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ مارگریٹ اس وقت سرتاپا غم کی تصویر بنی ہوئی تھی، یوں جیسے کوئی ماتم کناں ناری بال کھولے روتی رہی ہو۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرہ متورم سا دکھائی دیتا تھا۔

''آپ میرے شوہر کے بارے میں کیا جاننا چاہتے ہیں مسٹر جون؟'' اس نے جیسے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ غالباً اس ادھیڑ عمر ملازمہ نے اسے میرا 'جعلی' نام بتادیا تھا۔

''صرف اسی قدر کہ ان کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' (یاد رہے کہ میں نے اپنی آواز اور لب و لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

''مگر آپ کون ہیں؟ پہلے کبھی آپ کو نہیں دیکھا۔'' مارگریٹ اس بار جیسے تڑخ کر بولی۔ وہ نجانے کیوں ایک دم ہی غصے میں نظر آنے لگی تھی۔

''آپ بالکل بجا فرما رہی ہیں۔'' میں نے اخلاق کا دامن تھامے رکھا، جانتا تھا میں کہ ان مغربی گوریوں پر اخلاق کا جادو کس قدر اثر رکھتا ہے۔

''آپ سے میں کبھی نہیں ملا حالانکہ خواہش رکھتا تھا، اب تو اور بھی آپ سے ملنا ضروری ہو گیا تھا، اس لیے کہ آپ کے شوہر مسٹر چاؤز کی طرف سے ایک فارم فل کیا گیا تھا، انہیں آرگن ٹرانسپلانٹ کی ضرورت تھی، لیکن پھر نجانے کیا ہوا کہ متعلقہ اسپتال نے اس پروسس کو ادھورا چھوڑ دیا اور کوئی وجہ بھی نہیں بتائی، بس، اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا آپ ہمارے چیریٹی ادارے سے مطمئن نہیں ہیں؟''

میں نے بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے اس کی ''غرض و غایت'' کے مطابق جال پھینکا تھا۔ اس کی اثر پذیری یوں واقع ہوئی کہ مارگریٹ جس کا حسین چہرہ تھوڑی دیر پہلے کرختگی اور شکوک کی تصویر بنا ہوا تھا اس پر اب پہلے جیسی ہی غمناکی کی کیفیت طاری ہو گئی بلکہ اس میں اضافہ ہی محسوس ہوا۔

اس کا شوہر چاؤز جگر کے عارضے یا اس کی پیوندکاری کے سلسلے میں مذکورہ اسپتال میں ایڈمٹ تھا۔ جس کی خاطر مارگریٹ، سرجن امرناگ جیسے خونی کی ''رکھیل'' بننے پر مجبور ہوتی رہی...... مگر میں نے دیکھا کہ اب میری بات سننے کے بعد اس کے چہرے پر شکوک و شبہات اور تلخی کی جگہ پھر اسی غمناکی نے لے لی تھی جس نے مجھے اندر سے چونکا دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، اچانک ہی جونی نمودار ہوا۔

میں اسے دیکھ کر بدکا اور پھر محتاط ہو گیا لیکن میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ بھی ماں کی طرح اترا ہوا اور غمگین نظر آ رہا تھا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا اور رونی سی آواز میں بولا۔

''انکل! اب میرے پاپا کو کسی آرگن کی ضرورت نہیں رہی ہے...... گریٹ گاڈ نے انہیں ہر تکلیف سے نجات دلا دی ہے اور انہیں اپنے پاس بلا لیا ہے۔''

اس معصوم بچے کی آواز اور بات نے میرا اندر تک کاٹ ڈالا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہونے کے بعد اسی طرح کھڑے کھڑے گردن موڑ کر اپنی ماں کی جانب دیکھ کر بولا۔

''اور...... انکل! اس میں سارا قصور میری ماما اور انکل روڈی کا ہے۔'' میں اس کی آخری بات پر چونکا۔ جونی کے چہرے پر نفرت اور ناراضگی کے آثار تھے۔

''شٹ اپ، جونی! جاؤ اپنے کمرے میں......'' مارگریٹ نے بیٹے کو ڈپٹا مگر وہ نہیں گیا اور میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

اسے شاید آج اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔ وہ مجھ سے شکایتی لہجے میں بولا۔ ''ہمیں آپ ہی کی طرح ایک ہمدرد ملا تھا جو ہماری مدد کرنا چاہتا تھا مگر ہم نے اسے سمجھنے میں غلطی کی اور......''

''جونی! میں کہتی ہوں جاؤ اپنے کمرے میں......'' مارگریٹ ہسٹریائی انداز میں چیخی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اپنے بیٹے کو شعلہ بار نگاہوں سے گھور رہی تھی، غم و غصے سے اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔ جونی اٹھا اور ماں کی طرف دیکھتے ہوئے روہانسی آواز میں بولا۔

''ماما! انکل روڈی! آئی ہیٹ یو...... آئی ہیٹ یو......'' کہتا ہوا رویا اور کمرے سے نکل گیا۔

''آپ پلیز، جا سکتے ہیں، مسٹر جون!'' جونی کے کمرے سے جاتے ہی مارگریٹ نے مجھ سے سرد لہجے میں کہا۔

میں خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور مارگریٹ سے متاسفانہ لہجے میں بولا۔ ''مجھے افسوس ہوا یہ سب سن کر، میں چلا جاتا ہوں لیکن ابھی آپ کے بیٹے جونی نے جو کچھ کہا، اس سے مجھے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ لوگوں کی کسی کے ساتھ دشمنی تھی اور اسی وجہ سے آپ کے شوہر کا قتل ہوا۔''

مجھے تو حقیقت کا علم تھا مگر میں ابھی اس پر ظاہر ہونا نہیں چاہتا تھا اسی لیے جونی نے جو کچھ کہا تھا بظاہر میں اسی حوالے سے بات کرنے لگا۔

''جو بھی کچھ ہے، یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے، آپ پلیز یہاں سے چلے جائیں۔'' مارگریٹ بولی۔ مجھے اس کی ہٹ دھرمی اور بےوقوفی پر طیش آ گیا مگر میں اسے کسی اور طریقے سے گھیرنا چاہتا تھا۔

''لیکن میڈم! یہ ہمارے ادارے کی ساکھ کا مسئلہ ہے۔ ہم اس معاملے کو پولیس تک لے جائیں گے اب......''

میں نے دیکھا میری اس بات نے اس کے غمناک چہرے کی تلخی ہوا کر ڈالی۔ اس کی جگہ پریشانی نے لے لی۔

مجھے اندازہ تھا کہ اب بھی وہ خونی سوداگروں سے خوف زدہ تھی، لیکن میرے لیے الجھن یہ تھی کہ آخر کیوں؟ کیا اسے ابھی تک یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ یہاں ان کے نیٹ ورک کا قلع قمع کیا جا چکا ہے۔ کیا اب بھی وہ ان سے کسی حوالے سے رابطے میں تھی؟ یا پھر سرجن امرناگ نے انتقامی کارروائی کرتے ہوئے اس کے شوہر چاؤز کو ہلاک کر ڈالا تھا، تو پھر اس کے دل و دماغ میں انتقام کی آگ بھڑکانے کی ضرورت تھی، جیسا کہ اس کے نوعمر بیٹے جونی کے دل میں

بھڑکی ہوئی تھی۔

وہ میری منت پر اتر آئی۔ ”دیکھو، پلیز، ہم پر پہلے ہی غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ میں...... میں اب نہیں چاہتی کہ جونی بھی اس کی زد میں آئے۔ پولیس میں جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔“

”تو گویا آپ ان لوگوں کو جانتی ہیں؟“ میں نے کہا۔

”میرے جاننے سے کیا ہوتا ہے۔“ وہ روکھے پھیکے سے لہجے میں بولی۔ ”کیا تم نے اخبارات میں ان کے بارے میں نہیں پڑھا؟ جنہوں نے یہاں کے ایک اسپتال میں یہ گورکھ دھندا شروع کر رکھا تھا۔“

”پڑھا تھا، مگر میں آپ کی زبانی جاننا چاہتا ہوں کہ اگر آپ ان لوگوں میں سے کسی ایک کو بھی جانتی ہیں تو پولیس کو انفارم کیوں نہیں کرتیں؟“

”پولیس ان کی بیخ کنی کر رہی ہے۔ اب آپ مجھے بھی اس میں گھسیٹنا چاہتے ہیں، کیا آپ نہیں جانتے کہ اس سے میرے اور جونی کے لیے کتنی مشکلات کھڑی ہو جائیں گی؟“

”اندازہ ہے مجھے اِس بات کا......“ میں نے اس کی حوصلہ افزائی کی پھر پوچھا۔

”جونی نے ابھی آپ کے کسی مددگار کا ذکر کیا تھا، وہ کون تھا؟“ میں نے دانستہ اس سے یہ سوال کیا تھا، ظاہر ہے وہ میں ہی تھا۔

”میں پچھتا رہی ہوں اس آدمی کو غلط سمجھ کر...... جونی کو بھی یہی دکھ ہے مگر روڈی نے ہی یہ سارا معاملہ خراب کیا تھا، بعد میں مجھے اس پر شبہ ہوا کہ وہ بھی ان کے ساتھ ملا ہوا تھا۔“

یہ میرے لیے ایک خوفناک انکشاف تھا۔

”اوہ...... تو پھر آپ نے اس کے خلاف پولیس کو کیوں نہیں انفارم کیا؟“

”اس کی حقیقت کھلتے ہی میں اس سے بھی خوف زدہ ہوگئی تھی۔“

”آپ کو کیسے اس پر شک ہوا؟“ میں نے بھویں سکیڑ کر اس سے سوال کیا۔ وہ جیسے ایک دم ہوش میں آ گئی اور اسے احساس ہوا کہ وہ کئی غیر متعلقہ باتیں کر گئی ہے، ایک دم مجھ سے ملتجیانہ لہجے میں بولی۔

”پلیز، مسٹر جون! ہمیں معاف کر دیں اور جینے دیں ہمیں، پولیس کے پاس نہ جائیں، ورنہ وہ ہم دکھی ماں بیٹے کا جینا دوبھر کر دے گی۔“

”آپ یہ بتائیں، کیا آپ نے اس ہمدرد کو تلاش کرنے کی کوشش کی؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”اب وہ بے چارہ جانے کہاں ہو۔“ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔ ”اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ کاش! میں اس کمینے روڈی کی باتوں میں آ کر انہیں دھوکا نہ دیتی، انہیں دھکارتی نہیں۔“

”اگر وہ آپ کے سامنے آ جائے تو آپ کا کیا رویہ... ہوگا؟“ میں نے اچانک کہا۔

”واٹ......؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

”جی، میں ذرا واش روم تک جا سکتا ہوں؟“ میں نے اس سے کہا۔ اس نے یک ٹک میری جانب تکتے ہوئے گومگو سے انداز میں ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب میں واش روم سے اپنا ریڈی میڈ میک اَپ صاف کر کے اس کے سامنے آیا تو مجھے دیکھتے ہی اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اب وہاں جونی بھی دوبارہ آ گیا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا، پھر خوشی سے چلّاتے ہوئے میری جانب بڑھا اور مجھ سے شیک ہینڈ کیا۔

میں نے پیار سے مسکرا کر اس کے بالوں کو سہلایا اور اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ مارگریٹ بھی ہنوز پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے تکتی ہوئی صوفے پر گر سی گئی۔

اس کے بعد میں نے تفصیل سے اپنے اور رومی کے بارے میں بتاتے ہوئے اب تک کے حالات سے بھی ان دونوں ماں بیٹے کو آگاہ کر دیا۔

میری اس صراحت کا یہ فائدہ ہوا کہ مارگریٹ کو کافی حوصلہ ہوا۔ جونی بھی مطمئن اور خوش نظر آنے لگا بلکہ اس کے چہرے پر ایک جوش کے آثار بھی نظر آ رہے تھے۔

”انکل سیف! میں بھی آپ کی ساتھی مس رومی کے ساتھ مل کر ان کرمنلو کو سزا دوں گا۔ میں بھی آپ دونوں سے کم نہیں ہوں۔“

میں نے مسکرا کر اس کا گال سہلایا اور بولا۔ ”ضرور...... ہمیں معلوم ہے کہ تم ایک بہادر لڑکے ہو۔ اس کا نظارہ ہم پہلے ہی یہاں پر دیکھ چکے ہیں۔“ میری بات پر مارگریٹ مسکرا دی جبکہ جونی جھینپے ہوئے انداز میں ہنس دیا۔

کے کاٹیج کے سامنے روک دی۔ میں نے ایک بار پھر ریڈی میڈ میک اَپ کرلیا تھا۔ یہاں پہنچ کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

کار سے اتر کر ہم کاٹیج کے احاطے والے پھاٹک کی جانب بڑھنے لگے۔ جونی ہمارے عقب میں تھا۔ اردگرد سناٹا چھایا ہوا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر مارگریٹ نے یہ کہتے ہوئے کال بیل پر اپنی انگلی رکھ دی۔ ''وہ اندر ہی ہے شاید......''

دوسری بار بیل بجانے پر دروازہ کھلا، سامنے سے لڑکھڑاتی سی عجیب الخلقت مخنی شے برآمد ہوئی۔ پائپ حسب سابق اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ اس نے مارگریٹ پر پہلی نگاہ ڈالی اور مسکرادیا۔ مجھے جانے کیوں اس کی مسکراہٹ کمینی سی لگی۔

''مجھے یقین تھا تم یہاں ضرور آؤ گی، مگر تمہارے ساتھ کون ہے؟'' اس نے میری جانب اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''یہ مسٹر جون ہیں۔'' مارگریٹ نے میری ہدایت کے مطابق میرا نقلی نام بتایا۔ سب کچھ وہی ڈراما تھا جو میں مارگریٹ سے بھی کھیل چکا تھا۔

''مگر اسے کیوں اپنے ساتھ لائی ہو؟'' روڈی اُلجھ سا گیا اور اپنی چندی چندی آنکھوں سے میرا جائزہ لیتا رہا۔

''اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے، روڈی؟ ہم بیٹھ کر بات کرسکتے ہیں۔'' مارگریٹ نے کہا۔

''او...... کم آن......'' روڈی بولا اور ہمیں اندر آنے کے لیے راستہ دیا لیکن جونی سے بولا۔

''اندر کوئی شرارت نہیں کرنی، سمجھ گئے؟'' جونی نے ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

ہم اندر آگئے۔ اس نے ہمیں نشست گاہ میں بٹھا دیا۔

''ہاں! پہلے ان صاحب کا تفصیلی تعارف کرواؤ۔'' روڈی نے ایک صوفہ سنبھالتے ہی ہمیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے مارگریٹ سے کہا۔ اس کا اشارہ میری طرف ہی تھا۔

''یہ جون ہیں، چاؤز کے آرگن ڈونر بینک کے ایک ادارے سے ان کا تعلق ہے۔'' مارگریٹ میرے بارے میں اسے وہی کچھ بتانے لگی جس کی میں نے اسے ہدایت کر رکھی تھی۔

''لیکن میرے پاس اس کا کیا کام؟'' روڈی مجھے گھاس ڈالنے کے موڈ میں نہ تھا۔ مارگریٹ کو اپنے دروازے پر دیکھ کر اس کی خوشی ایک ''اجنبی'' کو ساتھ دیکھ کر ہوا ہوگئی تھی۔

میں بہرحال مارگریٹ کو ہی موقع دیے ہوئے تھا کہ وہ اس سے بات کرتی رہے۔ تاہم میں نے دیکھا کہ اب روڈی کا لہجہ مارگریٹ کے ساتھ روکھا ہوگیا تھا۔

''میں نے بتایا نا کہ آرگن ڈونر بینک کے ایک ادارے سے ان کا تعلق ہے اور ان پر کچھ ذمے داریاں عائد ہیں، چونکہ یہ......'' مارگریٹ کی بات ادھوری رہ گئی۔ روڈی نے درمیان سے اس کی بات اُچک لی۔

''میں تو سمجھا تھا کہ تم صرف مجھ سے ملنے آئی ہو، لیکن یہ مسٹر جون......'' وہ ایک ذرا رکا پھر اسی رُکھائی سے اپنا خوبانی جیسا سر نفی میں ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں، میرے پاس وقت نہیں ہے، تم لوگ جاسکتے ہو۔'' یہ کہہ کر وہ پائپ سے کش لگانے لگا۔ مارگریٹ نے ایک نگاہ مجھ پر ڈالی پھر اس سے بولی۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں تم سے ملنے کے لیے نہیں آئی؟ اب میں تو اسے اتفاق ہی کہوں گی کہ جب میں اور جونی یہاں آنے کا پروگرام بنا رہے تھے تو یہ صاحب بھی اسی وقت ملے، میں خود پہلی بار ان سے مل رہی ہوں۔''

مارگریٹ کی یہ چالاکی کام کرگئی۔ روڈی اس کی بات سننے پر مجبور ہوگیا اور میری طرف دیکھ کر سرد لہجے میں بولا۔

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، جو پوچھنا ہے پوچھو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

مجھے اُس کے بولنے کا انداز انتہائی بُرا لگا مگر مصلحتاً ضبط سے کام لے کر خوش خلقی سے بولا۔ ''تھینک یو مسٹر روڈی! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ ہمارا ادارہ مسٹر چاؤز کو لیور (جگر) کی ٹرانسپلانٹیشن کے سلسلے میں مدد کرنے کا فیصلہ کرچکا تھا اور اس کے لیے ساری کاغذی کارروائی تیار تھی۔ ہماری اور متعلقہ اسپتال کی میڈیکل ٹیم اس پروسس کو فائنل کرچکی تھی لیکن اب اچانک ان کے انتقال کی خبر نے ہمیں مجبور کیا ہے کہ اس کی انکوائری کی جائے۔''

میں نے اپنی بات ختم کرکے اس کے خوبانی جیسے سر والے چھچھوندری چہرے کو بھانپتی نظروں سے دیکھا مگر چہرہ اس کم بخت کا اس قدر مخنی تھا کہ تاثرات کو میں نہ بھانپ سکا، البتہ اس کا لمحہ بھر کے لیے چپ کر جانا مجھے کھٹکا ضرور، پھر یکدم وہ رُکھائی سے بولا۔

''تو پھر شوق سے کیجیے انکوائری، میرا بھلا اس میں کیا

کام ہے؟"

"اس لیے کہ آپ کی اپنے دوست جاؤز کی متعلقہ اسپتال میں ایڈمیشن سے لے کر ان کی میڈیکل اینڈ بیک سپورٹ اور مددگار کے طور پر سرپرستی تک کے کاغذات میں آپ ہی کے دستخط شامل ہیں۔" یہ بات میں مارگریٹ سے پوچھ چکا تھا۔ اس پر روڈی نے مارگریٹ کو اپنی چندی چندی آنکھوں سے کچھ اس طور گھور کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ یہ بات اسے (مجھے) بتانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

"جاؤز کی طبیعت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی، اب وہ علاج سے پہلے ہی مر گیا تو اس میں انکوائری کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" روڈی نے پینترا بدلا۔

"یہ غلط ہے، ڈیلی میڈیکل شیٹ میں ان کی طبیعت کا گراف معمول پر تھا۔ ہمیں شبہ ہے کہ ان کا اسپتال میں قتل ہوا ہے۔" میں نے اصل پتا پھینکا۔ حسب توقع روڈی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات ابھرے۔ میں اپنے تئیں اسے پھانس رہا تھا۔ میں نے ایک اور چوٹ کی۔

"اسپتال میں چھاپے کے بعد اس عالمی ریکٹ کے کچھ ایسے لوگوں کو گرفت میں لیا گیا ہے جنہوں نے یہ اُگلا ہے کہ ان خونی سوداگروں کے ساتھ کچھ مقامی لوگوں کا بھی آپس میں گٹھ جوڑ تھا۔"

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ ملا ہوا ہوں؟" روڈی نے چبھتی ہوئی نظروں سے میری جانب دیکھ کر کہا۔

"میں نے آپ کا تو نام نہیں لیا؟"

"تو پھر یہاں آکر مجھ سے یہ باتیں کرنے کا مقصد؟" اس نے مجھے گھورا۔

"یہی بتانے آیا تھا کہ تمہیں بھی مشکوک افراد کی طرح اس تفتیش میں آنا پڑے گا۔ تم خود کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار رکھو۔" میں نے آخری کیل ٹھونکی تو وہ بھی ہتھے سے اُکھڑ گیا۔

"گیٹ آؤٹ۔" وہ ایک دم چیخا۔

"آپ...... آپ مسٹر جون! پلیز اب چلے جائیں یہاں سے۔" میری ہدایت کے عین مطابق مارگریٹ نے مجھ سے کہا۔ روڈی اس کی جانب اُلجھی ہوئی نظروں سے تکنے لگا۔

"میں آپ کی ضد کی وجہ سے یہاں لائی تھی آپ کو...... اب آپ برائے مہربانی چلے جائیں، اس طرح میرے اور روڈی کے تعلقات بھی غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں۔ پلیز۔"

"اوکے...... مجھے جو کہنا تھا، کہہ دیا۔ چلتا ہوں۔" میں جانے کے لیے پلٹا۔ روڈی نے حرکت کی مگر اس سے پہلے ہی مارگریٹ نے روڈی کا راستہ روک لیا اور اس سے کچھ کہنے لگی، پھر جونی کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے دروازے تک چھوڑ آئے۔

یہ چال بھی کامیاب گئی۔ دروازے پر کوئی نہ تھا اور میں وہیں سے گھوم کر ایک دوسرے کمرے میں گھس گیا۔

جونی نے دانستہ دروازے کو کھولا اور زور سے بند کیا۔ اس کی آواز اندر تک گئی تھی۔

اب میں دوسرے کمرے کی ایک ایسی کھڑکی کے رخ پر آکر کھڑا ہو گیا، جہاں سے نشست گاہ کے اندر دیکھا اور سنا جا سکتا۔

وہاں مارگریٹ، روڈی کو بہلانے کی کوشش میں مصروف تھی، جونی نے وہاں آکر انہیں بتا دیا کہ میں جا چکا ہوں۔ پھر اس نے دوسرے کمرے میں جا کر کھیلنے کی فرمائش کر ڈالی، جہاں وہ اکثر آکر کھیلا کرتا تھا۔

جونی کی ماں کی طرح میں نے اُسے بھی کچھ "ہدایات" دے رکھی تھیں۔ اب مارگریٹ کا اصل کام شروع ہونے والا تھا۔

میں نے ادھ کھلے پٹ سے اندر جھانکا۔ مارگریٹ بڑی چالاکی اور اپنی اداؤں کی عشوہ طرازی سے، پریشان حال روڈی کو بہلانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

"تمہیں اسے یہاں لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔" روڈی خفگی سے بولا۔

"اوہو...... روڈی ڈیئر!" مارگریٹ بولی۔ "بتایا تو ہے میں نے کہ یہ کم بخت خود ہی میرے گلے پڑ گیا تھا، اس سے بحث کرتی تو مجھے بھی رگید ڈالتا۔ اچھا ہوا تم اس کے دباؤ میں نہیں آئے اور اسے نکال باہر کیا۔ میری تو اور بات ہی نا، ڈیئر! میں تو اب اس دنیا میں تمہارہ گئی ہوں۔" مارگریٹ کی چالاکی پر میں خود بھی اش اش کر اٹھا تھا مگر لگ رہا تھا کہ روڈی اتنی آسانی سے مطمئن ہونے والا نہیں، بولا۔

"یہ تمہیں اچانک میں کیوں اس قدر اچھا لگنے لگا ہوں؟ جاؤز کے مرنے کے بعد میں نے تمہیں جو آفر کی تھی، وہ تو تم نے مجھ سمیت بڑی نفرت اور رکھائی سے ٹھکرا دی تھی۔ پھر اب یہ مہربانی کیوں؟"

"تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے؟" مارگریٹ لگاوٹ سے بولی۔ "بعض تلخ حقیقتوں کا احساس انسان کو بعد میں ہی ہوتا

ہے۔ کیا تم بھول گئے تھے کہ میں چاؤز کی طویل بیماری اور صاحب فراشی پر کس قدر بیزار ہونے لگی تھی۔ تنہائی کے ناگ مجھے ہر روز ڈسا کرتے تھے۔"

"تب تم نے اس حرام زادے امرناگ سے کیوں یاری گانٹھ لی تھی؟" روڈی نے اسے یاددلایا۔

"اس لیے کہ وہ اس اسپتال کا ایک معتبر اور بااثر آدمی تھا۔" مارگریٹ بھی ہار ماننے والی نہیں تھی۔ "ایک وہی آدمی تھا جو چاؤز کے لیے کچھ کرسکتا تھا۔"

"ہم...... اب تو وہ جہنم واصل ہوگیا۔" روڈی طنزیہ بولا۔

"بھاڑ میں ڈالوان سب کو...... چاؤز بھی نہ رہا۔ میں چاہتی ہوں کہ اب...... تم جیسے مرد کا سہارا مل جائے تو باقی کی زندگی تو کم از کم آرام و سکون سے گزار لوں۔" مارگریٹ یہ کہتے ہوئے روہانسی ہوگئی۔

اس نے شاید اپنی ستارہ سی آنکھوں میں آنسو لانے کی بھی کوشش چاہی تھی مگر وہ امڈ نہ سکے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت وہ صرف میری ہدایات پر ہی روڈی جیسے "مرد" کے ساتھ اظہارِ محبت کررہی تھی۔ ایسے میں اس کے اپنے دل پر کیا بیت رہی ہوگی، اس کا بھی میں اندازہ کرسکتا تھا مگر مجبوری تھی اسی لیے اسے میرے کہنے پر یہ کڑوا گھونٹ پینا پڑ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" روڈی بولا۔ "چاؤز تو مر گیا اور وہ امرناگ بھی مگر ڈاکٹر میش اگروال سمندری راستے سے ممبئی بھاگ گیا ہے۔"

اس انکشاف پر مارگریٹ ہی نہیں میں بھی چونک پڑا۔ اگرچہ اس انکشاف کی ہمیں توقع پہلے ہی سے تھی لیکن تصدیق نہیں ہوئی تھی اور میں اسی غرض سے یہاں آیا تھا۔

مارگریٹ نے فوراً اپنی کیفیت پر قابو پایا اور اسی طرح بے پروا...انداز میں بولی۔ "ایک ہی بات ہے ڈیئر روڈی! وہ یہاں سے چلا گیا، سو چلا گیا۔ ہم دونوں تو اِدھر ہی ہیں نا......"

"تمہیں شاید پوری بات بتانا پڑے گی۔" اچانک روڈی نے کہا۔ میں چونک اٹھا۔ بلی تھیلے سے باہر آنے والی تھی۔

مارگریٹ کو بھی یقیناً جھٹکا لگا ہوگا۔ پھر بھی اس نے کسی جلد بازی یا دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا اور روڈی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اگلے ہی لمحے میرا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔

مارگریٹ جیسی صحت مند اور سرو قد خاتون کو اپنی مرمریں بانہیں روڈی جیسے بونے اور منحنی جسم کے مالک کے گلے میں بانہیں ڈالنے کے لیے .... بہت زیادہ جھکنا پڑا تھا۔ مارگریٹ کا یہ "ہتھیار" اور "حملہ" کارگر ثابت ہوا اور روڈی کو میں نے اس پر ایک دم ریشہ خطمی ہوتے پایا، اس قدر کہ وہ واقعتاً نہیں بلکہ حقیقتاً چاروں شانے چت ہو گیا۔

کیونکہ مارگریٹ جیسی صحت مند خاتون کا وزن روڈی جیسے بونے کی ٹانگیں نہ سہار پائیں اور وہ گر پڑا۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

کھولیں تو دیکھا، دونوں صوفے پر گرے پڑے تھے اور اب جھینپے جھینپے انداز میں سنبھالا لینے لگے۔

"مائی ڈارلنگ، مارگی، کاش! کوئی اور موقع ہوتا تو میں تمہاری اس بے تابانہ محبت کا بھرپور جواب دیتا، لیکن تم جانتی ہو نا، جب ایک انسان پریشان ہو تو اسے اپنا آپ بھی اچھا نہیں لگتا۔ تم اُس وقت میری آفر اور مجھے قبول کرلیتیں تو میں آج اتنی مصیبت میں نہ پڑتا۔" روڈی نے پریشانی کا اظہار کیا۔

"کیسی پریشانی؟ کون سی مصیبت مائی ڈارلنگ؟" مارگریٹ نے اپنی خوب صورت آنکھوں میں مصنوعی حیرت سموتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو، میں تمہیں پوری بات سمجھاتا ہوں اور فار گاڈ سیک! مجھ سے اب کوئی دھوکا نہ کرنا ورنہ دونوں ہی مریں گے۔"

"ی ی...... یہ تم کیسی ڈرانے والی باتیں کررہے ہو آج روڈی ڈیئر؟" مارگریٹ نے بڑی مکاری سے اپنی نشیلی آنکھوں میں خوف سمیٹ لیا۔

وہ دونوں فیملی سائز کے صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ روڈی اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسے شاید جونی کی فکر تھی کہ کہیں وہ آنہ دھمکے اچانک۔

"تم اس کی فکر نہ کرو، وہ حسب سابق کمرے میں بیٹھا ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا ہوگا۔" مارگریٹ نے اس کی پریشانی بھانپ کر تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

ادھر مجھے سخت بے چینی لگی ہوئی تھی کہ آخر یہ بونا تھیلے کے اندر سے کون سی بلی نکالنے والا تھا؟

"مارگی، سنو...... جب میں نے دیکھا کہ یہ مردود امرناگ مسلسل تمہیں کھلونا بنائے تم سے کھیلنے میں مگن ہے۔ تم بھی مجھے سارا احوال دیتی رہتی تھیں، تو میں اس ڈرامے سے

بیزار ہونے لگا، اب جبکہ تم نے بھی حالات کو سمجھ لیا ہے خواہ دیر سے ہی سہی تو مجھے بھی یہ حقیقت بتانے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے کہ...... میں جان چکا تھا کہ امرناگ صرف تمہیں دل بہلانے کے لیے استعمال کر رہا ہے، وہ تمہاری مدد کبھی نہیں کرے گا...... یوں میں بھی یہی چاہتا تھا کہ چاؤز کا قضیہ دوسرے طریقے سے نمٹ جائے، یعنی...... وہ صحت یاب ہونے کے بجائے...... اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو میں نے امرناگ سے خفیہ ساز باز کر لی۔'' وہ اتنا بتا کر ذرا سانس لینے کو رکا۔ اُدھر مارگریٹ سانس روکے یہ سب سن رہی تھی اور اِدھر میں دوسرے کمرے کی کھڑکی سے لگا اپنے دل کی تیز دھڑکنیں روکے اس کے سنسنی خیز انکشاف سن رہا تھا۔ مطلب کے لیے یہ بے حس اور سنگ دل انسان ایک دوسرے کی جانوں سے کھیلنے سے باز نہیں آتے۔

ایک بیمار اور لاچار انسان کو اپنے تئیں وقت سے پہلے ہی مار ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں، وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس نے کون سا بچنا ہے؟ کیا وہ بھول جاتے ہیں کہ زندگی اور موت کا اختیار صرف ایک ہی ہستی کو ہے، جو آسمانوں پر بیٹھی ہے اور کل کائنات و جہاں جو ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، وہ ان کا بھی خالق ہے، چاہے تو قبر سے مردے کو بھی زندہ کر کے نکال باہر کرتا ہے۔

''مگر امرناگ ایک کائیاں اور مکار آدمی تھا، جانتا تھا کہ جب تک چاؤز اس کے اسپتال میں ہے، اس کی حسین و جمیل بیوی اس کے اختیار میں رہے گی۔ میرا ایک مقصد درحقیقت تمہیں اس کے چنگل سے نکالنا تھا اور اسی قدر میرا امرناگ سے تعلق تھا۔'' روڈی نے نہایت بے حسی سے انسانیت کے تمام تقاضے توڑتے ہوئے گم صم بیٹھی مارگریٹ سے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''وہ بھی پرانا پاپی تھا، تاڑ گیا اور مجھ سے بولا... کیا تم مارگریٹ کو ہتھیانا چاہتے ہو؟'' میں نے جواب میں کہا۔

''نہیں، میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایک ہی بات ہے۔''

روڈی اپنی سنگ دلی اور بے حسی کی رُوداد اپنے منہ سے بیان کر کے چپ ہو رہا تو میں نے دیکھا کہ مارگریٹ کا جسم نجانے کن جذبات تلے لرز رہا تھا۔ وہ بولی تو مجھے اس کی آواز اور لہجہ بھی مرتعش محسوس ہوا۔

''روڈی! تم جانتے تھے کہ میں نے اپنا آپ اس کالے سؤر امرناگ کو کیوں سونپا تھا؟ اس لیے کہ میرے نزدیک چاؤز کی زندگی بچانا زیادہ اہم تھا، کیا تمہیں اس سے بھی اندازہ نہ ہو سکا کہ میں...... اپنے شوہر سے کتنی محبت کرتی تھی، جو میرے بچے کا باپ بھی تھا۔ کیا تم مجھے حیا باختہ عورت سمجھے ہوئے تھے، ایک مجبور عورت نہیں؟ یعنی تم بھی اس کالے سؤر کی طرح مجھے بھنبھوڑنا چاہتے تھے۔'' کہتے کہتے مارگریٹ کا لہجہ گلوگیر ہو گیا اور ساتھ ہی شعلوں کی تپش نے اس کی آواز و انداز کو جھلسا دیا۔

''یہ کیا بکواس کر رہی ہو تم؟ میں تو...... میں تو......'' روڈی غصے سے پھٹ پڑا۔

اگلے ہی لمحے میری آنکھوں نے اچانک ہی ایک چونکا دینے والا اور غیر یقینی سا منظر دیکھا۔ مارگریٹ کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا پستول نظر آ رہا تھا، اسی وقت دھما کا ہوا اور روڈی کے خوبانی جیسے سر کی پیشانی میں سرخ روشندان بن گیا۔ اس کے نخنی چہرے پر حیرت ثبت ہو کر رہ گئی جو شاید اب قبر تک ہی ساتھ رہتی۔

مارگریٹ کی یہ حرکت میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی، میں بدکا اور چاہتا تھا کہ جوش تلے کھڑکی کو ہی پھاند ڈالوں مگر وہ چھوٹی تھی، پھر میں گھوم کر دروازے سے نشست گاہ پہنچا تو وہاں ایک اور دل دہلا دینے والا منظر دیکھا، مارگریٹ نے وہی پستول اپنی کنپٹی سے لگا لیا تھا، میرے پاس سوچنے کا وقت کہاں رہا تھا، سو میں نے وہیں سے جست بھری اور اس پر جا پڑا، گولی چلی، دھما کا ہوا اور کسی کی چیخ نہ سن کر میں مطمئن ہو گیا مگر گرتے ہی سنبھلا۔

مارگریٹ کا پستول گر چکا تھا، وہ اسے اٹھانے کو دوبارہ لپکنے کی کوشش میں تھی کہ میں نے اسے دبوچ لیا۔

''چھوڑ دو مجھے...... میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتی، خودغرضوں اور درندوں کی اس بستی میں جینے کا کیا فائدہ...... مر جانے دو مجھے......'' مارگریٹ میری گرفت میں تڑپنے لگی تو میں نے ایک تھپڑ اس کے نرم و نازک گال پر رسید کر دیا۔ اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''ایک بے وقوفی کے بعد دوسری بے وقوفانہ غلطی......'' میں نے برہم ہو کے کہا۔ ''کیا تمہارے لیے جونی کوئی حیثیت نہیں رکھتا؟ خودغرض تو تم بھی ہو کہ...... ان کڑے حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے خودکشی کر کے جان چھڑا رہی ہو اور جونی کو اسی آگ میں کس کے سہارے دھکیل رہی ہو؟ بتاؤ مجھے......''

مارگریٹ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ دو گولیاں چلنے کے بعد جونی کمرے سے بھاگتا ہوا آیا تو میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیا اور واپس

سالِ نو جنوری 2021ء کا رنگا رنگ و سحر کن مضامین سے سجا دل نشین شمارہ
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
معروف قلم کار براڈ کاسٹر، کمپیئر
سیما رضا ردا
کا دلچسپ و دلکش احوالِ زندگی...... پڑھیے
وہ آئے بزم میں......
افشاں آفریدی اور نایاب جیلانی کے متاثر کن قسط وار ناول ایک نئے موڑ پر
سعدیہ رئیس کا منی ناول میں انمول کا خوب صورت اختتام
عورت کہانی میں پڑھیے فرحین اظفر کے قلم کا ایک دلکش شاہکار
روحیلہ خان کے اچھوتے ناولٹ بوجھ کا اختتامی حصہ
شیریں حیدر کی خصوصی کاوش وہ ہجر جو ہم پر لازم تھا کی صورت
نگہت سیما کے ماہرانہ
انداز بیاں سے مرصع مکمل ناول
میں اور فارہ
معروف اسکالر اختر شجاعت
کی زہد و تقویٰ
پر روح پرور تحریر
شائستہ زریں کی محنت اور لگن کا آئینہ دار سروے کورونا وائرس خدشات و توقعات
اس کے علاوہ
سالِ نو کی مناسبت سے دل پزیر افسانے ...... تحریر نگاروں میں روبینہ یوسف،
قرۃ العین سکندر، تسلیم شیخ و دوسرے شامل ہیں
آپ جیسے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعر و شاعری، خوش ذائقہ، حسن نکھاریے،
معلومات سے پُر تراشے اور گوشۂ ظرافت جیسے خوب صورت سلسلے......

کمرے میں لوٹ جانے کی ہدایت کی۔ وہ پھٹی پھٹی معصومانہ آنکھوں سے کبھی ماں کو دیکھتا تو کبھی میری جانب...... ابھی اس کی نظر روڈی کی لاش پر نہیں پڑی تھی۔ وہ صوفے سے نیچے گرا ہوا تھا اور آڑ میں تھا۔ میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ بچہ یہ منظر دیکھے۔

وہ چلا گیا۔ میں مارگریٹ کو سنبھالا دینے لگا۔ اسے سمجھانے لگا۔ ”یہ زندگی ہے، یہاں خوشیوں اور غموں کا سنگم ساتھ چلتا ہے۔“ غرضیکہ اس سلسلے میں مجھے جتنے بھی مکالمے یاد تھے، وہ میں نے اس سے کہہ دیے تو اسے تسلی ہوئی، وہ خود کو سنبھالا دینے لگی۔ میں اس کے لیے فریج سے پانی کی بوتل نکال لایا۔

وہ کافی حد تک سنبھل گئی اور میرا شکریہ ادا کرنے لگی۔ میں نے اسے ایک بے وقوفانہ حرکت اور حرام موت سے بچا لیا تھا۔ وہ شرمندہ بھی ہوئی۔

”تم نے اس کم بخت روڈی کو کیوں ہلاک کر ڈالا؟“ میں نے شکایت کی۔

”میں خود پر قابو نہ پا سکی تھی۔“ وہ بولی۔

”اب ہمیں یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیے۔ اس کے لیے مجھے فنگر پرنٹس بھی مٹانا ہوں گے۔“ میں نے کہا اس کے بعد میں نے یہ کام بھی جتنی جلد ممکن ہو سکا، نمٹا دیا۔

اگلے نصف گھنٹے بعد ہم کاٹیج سے نکل رہے تھے۔ میرا ارادہ ان دونوں ماں بیٹے کو شہر ان کے گھر روانہ کر کے خود ”ہائی ونڈ“ کا رخ کرنا تھا، مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے بھی ان کے ساتھ ہی واپسی کا قصد کیا۔ روڈی مارا جا چکا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میری یہاں موجودگی کا کسی کو علم ہو، راتوں رات ہی یہاں سے نکل جانا بہتر ہوگا۔

مارگریٹ کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں انہی کے ساتھ چلوں۔

اس کے گھر پہنچنے کے بعد میں نے وہاں آرام کیا، پھر اگلے دن صبح اپنے ہوٹل کا رخ کیا۔

کمرے کی ایک ڈپلی کیٹ چابی میرے پاس بھی رہتی تھی اسی لیے میں...... نے آرام سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ طے شدہ پروگرام کے تحت رومی بھی وہیں آ چکی ہوگی۔ یا پھر میرے لیے کوئی پیغام ہوگا لیکن وہاں ایسا کچھ نہیں تھا۔ غسل اور ناشتا وغیرہ تو میں مارگریٹ کے گھر سے ہی کر کے نکلا تھا اسی لیے میں نے سوچا کہ اسکائپ پر طارق سے ہی دل بہلا لوں، مگر دوسرے ہی لمحے میں چونکا۔

باتھ روم میں مجھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ شاور کی آواز آ رہی تھی۔ میں بے اختیار ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گویا رومی بھی یہاں موجود تھی۔

میں نے باتھ روم کے دروازے کو ناک کیا، ساتھ ہی اسے پکارا بھی۔

”رومی؟“

شاور گرنے کی آواز بند ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی دروازہ تھوڑا کھلا، وہاں سے رومی کا گیلے بالوں والا مہتابی اور بھیگا بھیگا چہرہ ابھرا۔ ایک ذرا جھلک اس کے برہنہ شانے کی بھی دکھائی دی تھی جس پر پانی کے مہین قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

”ارے...... تم کہاں چلے گئے تھے؟“ اس نے بے تابانہ پوچھا۔

”کسی مہم سے گیا تھا، تم ذرا نکل آؤ اور اپنی مہم جوئی بتاؤ۔“ کہتے ہوئے میں اس سے نظریں چراتا پلٹ آیا۔

نشست گاہ میں آ کر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ وہ بھی بڑا سا باتھ ٹاول باندھے چلی آئی۔ گیلے بالوں کو اس نے ایک تولیے سے باندھ رکھا تھا۔ اسے اس حالت میں دیکھ میں نے منہ بنا کر کہا۔

”اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کوئی بھاگے نہیں جا رہے۔ لباس پہن کر آؤ۔“

”تم اتنے شرمانے کیوں لگے مجھ سے......؟“ رومی جیسے میری کیفیت سے مزہ لیتے ہوئے شرارت بھری مسکراہٹ سے بولی اور ساتھ ہی اس نے اپنے بالوں سے تولیا بھی کھینچ لیا اور ایک قیامت خیز خم کے ساتھ گیلے بالوں کو جھاڑنے اور خشک کرنے لگی۔

”میں اٹھ جاؤں؟“ میں نے اسے گھورا۔

”توبہ ہے، ابھی آتی ہوں۔“ رومی جل گئی اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری نظریں اس کے تعاقب میں اٹھتی چلی گئیں۔

فل باتھ ٹاول میں اس کی چال بڑی قیامت خیز محسوس ہوئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈھنگ کے لباس میں آئی تو اس نے ہاتھ میں ٹرے بھی اٹھا رکھی تھی، جس پر میں گرما گرم کافی کے دھواں اڑاتے کپ تھے۔

اس نے ٹرے تپائی پر رکھ دی۔ میں نے ایک مگ اٹھا لیا، دوسرا اس نے اور سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"کیا رہا؟ رمیش...... بھاگ گیا؟" میں نے ایک سِپ لیتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔
"وہ کب کا نکل چکا تھا۔ ہم تو بس یونہی خانہ پری کرنے گئے تھے۔" وہ بھی گرما گرم کافی کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔
"ہمم...... مجھے بھی کچھ یہی آثار نظر آرہے تھے۔" میں بولا۔ "مگر اس پولیس آفیسر ابومعد کا کیا ہوا؟"
"اسے زوہریہ کے بیان کے بعد گرفتار کرلیا گیا ہے۔"
"گڈ، چلو یہ تو کام ہوا۔"
"تم بتاؤ اب...... یہ ساری رات کہاں گل کھلاتے رہے؟ ویسے مجھے یقین تھا کہ نچلے بیٹھنے والے تم بھی نہیں ہو اور کچھ نہیں تو اس گوری حسینہ مارگریٹ کے پیچھے تو ضرور گئے ہوگے۔" وہ پھر شرارت پر اُتر آئی۔
"اس کے پیچھے نہیں گیا تھا، ایک مشن کی غرض سے اس کے ہاں گیا تھا۔" میں نے منہ بنا کر کہا، ویسے مجھے اس کے درست اندازے پر حیرت ہوئی تھی۔
"مرچیں کیوں چبا رہے ہو، میرا مطلب بھی یہی تھا۔"
میں نے اسے تمام تفصیل بتا ڈالی۔ وہ متحیر سی ہوگئی پھر ازرائے تاسف بولی۔
"تو بے چارہ وہ بونا مفت میں اس گوری کے ہاتھوں مارا گیا۔"
"مفت میں تو نہیں، اپنے کرتوت اور کالی نیت کی سزا بھگتی ہے اس نے۔"
"خیر، اب کیا کیا جائے؟ ہمارا تو یہاں مشن ختم ہی سمجھو۔"
"اس مردود کے تعاقب میں جانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔
"بھارت؟"
"ہاں!"
"مگر بھارت میں اس خبیث کو تلاش کہاں کریں گے؟ وہ کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔"
"اس سلسلے میں طارق سے رابطہ کرتے ہیں۔ کافی دن ہوئے اس سے بھی کوئی بات نہیں ہوسکی ہے۔ ہمیں ایک آئی فون کی اشد ضرورت ہے۔ سابقہ مہم میں وہ ضائع ہونے کے بعد ہم خالی ہاتھ ہیں۔ سیل فون ہوتا ہے تو طارق سے بھی فوری رابطے کا ذریعہ موجود رہتا ہے۔ وہ بھی پریشان ہو رہا ہوگا ہماری وجہ سے۔"
تھوڑی دیر بعد کافی ختم کر کے ہم لیپ ٹاپ پر آگئے۔ طارق کے میسیجز کی بھرمار تھی مگر وہ آن لائن نہ تھا البتہ اس کے آخری میسیج پر رومی چونکتے ہوئے بے اختیار بولی۔
"ارے یہ کیا......؟"
"کیا ہوا؟ کوئی بھوت نکل آیا لیپ ٹاپ سے......"
"طارق پاکستان میں نہیں ہے۔" رومی نے جیسے انکشاف کیا۔ میں اس وقت پانی پینے کے لیے اٹھا تھا اور دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔
"کیا مطلب؟"
"یہ دیکھو، ذرا غور سے پڑھو اس کا آخری میسیج......"
اس نے لیپ ٹاپ میری جانب کھسکا دیا۔ میں اسکائپ پر طارق کا آخری ٹیکسٹ میسیج پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔
"نجانے تم دونوں کہاں مصروف ہو؟ کافی دنوں سے رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ اللہ تم دونوں کو اپنی امان میں رکھے اور کامیاب کرے۔ مجھے یہی بتانا تھا آج کہ، میں انڈیا نکل رہا ہوں۔ اسکائپ پر رابطہ رہے گا۔ کوشش کرو تم دونوں فوری رابطے کے لیے کوئی ایک اچھا سا آئی فون لے لو۔ باقی بعد میں......"
"یہ ضرور گوہر شاہ کے پیچھے گیا ہے۔" میں نے کہا۔
"لگتا ہے اب ہمارے سارے دشمن انڈیا میں اکٹھے ہونے والے ہیں۔"
"خونی سوداگروں کے اس ریکٹ کی ابتدا بھی تو وہیں سے ہوئی تھی۔" میں نے کہا۔
"نہیں، تھائی لینڈ، پھر یورپ سے پھر انڈیا اور بعد میں پاکستان......" رومی نے تصحیح کی۔
"ممکن ہے۔" میں نے کندھے اچکائے۔ "چلو، انڈیا چل کر ہی دوستوں اور دشمنوں سے ملاقات کرتے ہیں۔" میں نے آخر میں ایک گہری سانس لے کر کہا۔
"انڈیا کا ویزا کم از کم تمہیں تو اتنی آسانی سے نہیں ملے گا۔" رومی نے کہا۔ پتا نہیں اس نے مجھے چڑانے کے لیے یہ بات کہی تھی یا پھر حقیقت تھی۔ میں نے اسے گھورا۔
"وہ کیوں؟ آخر طارق بھی تو گیا ہے۔"
"وہ جا سکتا ہے، جاتا رہا ہے۔ تمہاری بات اور ہے۔ تم صرف امارات ہی آجا سکتے ہو۔"
"تو کیا تم اکیلی جانا چاہتی ہو انڈیا؟ اس لیے کہ طارق بھی وہاں پہنچنے والا ہے یا پہنچ چکا ہے۔" میں نے تلخی

سے کہا۔
"ایک تو تم بدگمان بہت جلدی ہو جاتے ہو۔" رومی منہ بنا کر بولی۔ "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ ناممکن ہے۔ کوشش تو کریں گے، ظاہر ہے، میں تو تمہیں ذہنی طور پر تیار کرنا چاہتی تھی کہ اگر تمہیں پاکستان لوٹ جانا پڑے، تو کوئی عار مت سمجھنا۔ باقی کا مشن میں اور طارق وہاں سنبھال لیں گے۔"
"ہرگز نہیں۔" میں نے پُرقطعیت کے ساتھ نفی میں سر ہلا کر کہا۔ "جب تک میرا انڈیا کا ویزا نہیں لگے گا، میں امارات سے نکلوں گا ہی نہیں۔"
"تو کیا مجھے بھی تمہارے ساتھ تب تک ادھر ہی جھک مارنا پڑے گی؟" رومی بولی۔
"نہیں، تمہارا کام ہو جائے تو تم بے شک چلی جانا، میں تمہارا احسان کیوں لوں؟" میں نے بھی رکھائی سے کہا۔ اس نے میرا کان پکڑ لیا۔
"ارے...... ررے...... باپ رے...... کان کیوں پکڑ لیتی ہو۔" میں چلّایا۔
"لائن پر آتے ہو یا نہیں؟" رومی غصے سے بولی۔
"تم مارو لائن پہلے......" میں نے شرارت سے اسے آنکھ ماری اور وہ غصے میں ہونے کے باوجود ہنس پڑی۔
"بڑے ذلیل ہو، کمینے......!" رومی نے کان چھوڑ دیا۔
"اُف توبہ! عورت ہو کے کس قدر کچی پکی گالیاں نکالتی ہو۔ خوب تربیت کی ہے تمہاری طارق نے۔" میں نے اسے پھر زچ کیا۔
"نہیں، میں پکا کر بھی گالیاں دیتی ہوں، دوں؟"
"بس، بس...... کام کی طرف دھیان۔" میں نے میدان چھوڑنا چاہا۔
"کل ہی ویزے کی کوشش کرتے ہیں۔"
وہ دن، ہم نے ہوٹل میں گزار کر آرام کیا اور اگلے دن صبح انڈین ایمبیسی کا رخ کیا۔
رومی کو اپنے پروفیشن کے سبب ویزے ملنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی، اگرچہ پروفیشن میرا بھی کچھ کم نہ تھا مگر...... قباحت یہ تھی کہ میری رہائش کا ٹائم پیریڈ پہلے جیسا نہیں رہا تھا، اس میں گیپ آ گیا تھا، اسی وجہ سے آبجیکشن لگ گیا۔ حالانکہ میں نے جاب ویزا اور نہ ہی وزٹ ویزا کے لیے اپلائی کیا تھا، کیونکہ اس میں بہت قباحتیں تھیں، میں نے صرف رومی کے مشورے اور کچھ اپنی عقل کے مطابق...... ہائر اسٹڈی ویزے کے لیے اپلائی کیا تھا، جس کے مطابق دل میں سوراخ کے آپریشن کے لیے انڈیا میں حال ہی میں ایک متعارف ہونے والی نئی ٹیکنالوجی کے کورس کے سلسلے میں جانا ظاہر کیا تھا، جو مسترد کر دیا گیا۔ اس کے لیے مجھے ایک لمبا چوڑا پروسس تھما دیا گیا جو پاکستان جا کر دوڑ دھوپ کے بعد بھی نجانے کتنے عرصے بعد مکمل ہوتا۔
میں مایوس ہو گیا، رومی کی بات ٹھیک ہی نکلی تھی۔
"دل پر مت لو یار!" رومی نے میرا اُترا ہوا چہرہ دیکھا تو مجھے ڈھارس دیتے ہوئے بولی۔
ہم اپنے ہوٹل پہنچے تو لنچ ٹائم ہو چکا تھا۔ میرا کھانے کو کچھ جی نہیں چاہا، رومی کو شاید بھوک لگی ہوئی تھی، اس نے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ڈائننگ ہال کا رخ کرنا چاہا اور میں نے اپنے کمرے کا تو وہ رک کر بولی۔
"کھانا تو کھا لو......"
"مجھے بھوک نہیں ہے، تم کر لو لنچ، بعد میں میرا دل کیا تو روم میں ہی منگوا لوں گا۔"
"اچھا ٹھیک ہے......" وہ بولی۔ "میں ابھی آتی ہوں، تم تب تک طارق سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو۔ اگر رابطہ ہو جائے تو اسے تازہ صورتِ حالات سے آگاہ کر دینا، ہو سکتا ہے وہ کوئی اچھا مشورہ دے سکے اور ہاں...... اسے کہنا میرے آنے کا انتظار کرے۔"
میں نے اثبات میں اپنا سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ کمرے میں آ کر جوتوں سمیت بیڈ پر تھکا تھکا سا گر گیا۔ دماغ میں متعدد خیالات کی یلغار ہونے لگی۔
مجھے رومی اور طارق پر پورا بھروسا تھا لیکن میری اپنی بات اور تھی۔ رمیش کے خلاف میں اس کامیابی کو ابھی ادھوری اور نامکمل ہی سمجھ رہا تھا۔ بے شک ان خونی سوداگروں کے دو نیٹ ورک ہم برباد کر چکے تھے، لیکن میری قسم ابھی باقی تھی اور میرے بھائی کے سفاک قاتل بھی زندہ تھے۔
امرناگ کے بعد گوہر شاہ اور رمیش...... یہ دونوں جب تک زندہ رہتے، میری قسم مجھے بھلا کب چین لینے دیتی؟ میں انہیں موت کی وادی میں بھیجنا چاہتا تھا، اسی طرح اذیتیں دے کر...... جس طرح میرے معصوم بھائی عادل کو لرزا خیز موت سے ہمکنار کیا گیا تھا۔
ذرا تکان اتارنے کے بعد میں نے بیڈ پر ہی لیپ ٹاپ نکال لیا اور اسے آن کرنے لگا۔
طارق آن لائن تھا مگر سیٹ پر موجود نہ تھا، تاہم اس کا مختصر پیغام آیا ہوا تھا، اس نے لکھا تھا کہ وہ "آن" ہے۔ گرین مارک تھا۔ اتنی دیر میں رومی بھی آ گئی، ہم لیپ ٹاپ لیے میز

پر آ گئے اور دو کرسیوں پر براجمان ہو گئے۔

میں جوابی میسیج کر چکا تھا کہ ہم بھی اس کے منتظر ہیں وغیرہ۔

ذرا دیر بعد طارق آ گیا۔ ہم نے ویڈیو کال دے دی جو اس نے فوراً وصول کی اور پھر ہلکی پھلکی علیک سلیک کے بعد رومی دھیرے دھیرے مختصر الفاظ میں اسے اب تک کے حالات سے آگاہ کرتی رہی۔

''سب کچھ بالکل ٹھیک جا رہا ہے۔'' طارق بولا۔ ''لیکن یہ اپنے ڈاکٹر صاحب کا منہ کیوں اترا اترا سا نظر آ رہا ہے؟''

طارق نے ویڈیو کیم میں بھی میرے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے تھے۔ رومی نے اس کے بعد کے حالات سے بھی اسے آگاہ کر دیا تو طارق مجھے مخاطب کر کے بولا۔

''تمہیں اب پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، مائی بڈی!'' وہ ترنگ میں ہوتا تو مجھے اسی طرح بے تکلفانہ انداز میں پکارتا۔

''اس میں بھلا کیا شک ہے کہ تم نے اب تک بڑی بے جگری کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا اور دشمنوں کے دانت کھٹے کیے۔ لہٰذا اب میرا ہی نہیں بلکہ رومی کا بھی یہ سمجھنا کہ تمہارا کام اب ختم ہو چکا اور ہمارا یعنی رومی اور میرا اب شروع ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات سیف؟''

''بالکل نہیں سمجھ رہا۔'' میں نے اپنے اندر کے ابال پر بمشکل قابو پاتے ہوئے جیسے صریحاً بھڑاس نکالی۔

''کیا مطلب؟'' طارق نے چونک کر کہا۔

''جب تک میرے بھائی کے قاتل زندہ ہیں، میرا کام ختم نہیں ہو سکتا۔''

''لیکن مجبوری ہے یار!'' طارق بولا۔ ''میرے اور رومی کے ہوتے ہوئے تم کیوں اس بات کی فکر کرتے ہو کہ وہ زندہ رہیں گے۔''

''میں بھی اسے پچھلے کئی گھنٹوں سے یہی سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔'' رومی نے بھی درمیان میں لقمہ دیا۔ ''رمیش اور گوہر شاہ اب ایک بیج پر آ چکے ہیں۔ وہ اب ہماری گرفت سے نہیں بچ سکتے۔''

''بیج مت کہو گود کہو...... ایک مضبوط اور تحفظ فراہم کرنے والی گود۔'' میں نے طنزاً کہا۔ ''وہ اپنے ملک میں جا چکے ہیں، جہاں ان کے لیے سپورٹ اور سورسز کی کوئی کمی نہیں۔ ہم یہ تسلیم کیوں نہیں کر لیتے کہ وہ دونوں ہمارے ہاتھوں سے نکل چکے ہیں۔ رومی کے سر پر جو قانونی بھوت سوار ہے، اب تو وہ ان کا وہاں بھی کچھ نہ بگاڑ پائے گی۔'' میں نے بھی صاف گوئی کے ساتھ اختلافِ رائے کر ڈالا۔

''یہ بات نہیں ہے، سیف!'' طارق مجھے سمجھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری مجبوری آڑے نہ آئی ہوتی تو تم بھی ہمارے ساتھ ہوتے، ہم تمہیں خود سے کب الگ کر رہے ہیں؟ اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا انڈیا کا ویزا نہیں لگ سکا تو رومی بھی نہ جائے؟ جبکہ میں بھی انڈیا پہنچ چکا ہوں۔ کیا ہم ایک تمہارا ویزا نہ لگنے کے سبب اپنا مشن یہیں پر ہی ادھورا چھوڑ دیں؟''

''ہرگز نہیں، یہ تو میں نے نہیں کہا ہے۔'' میں نے فوراً کہا۔

''تو پھر اور تمہارا کیا مقصد ہے ایسی باتیں کرنے کا؟'' طارق بولا...... ایک بار پھر میرے اور ان کے درمیان تلخ ہونے لگی تھی۔ میں نے کہا۔

''یہی کہ میرے بھی انڈیا جانے کی تم دونوں کو کوئی سبیل کرنا چاہیے تھی۔ کوئی کوشش، کوئی راستہ تو ڈھونڈا ہی جا سکتا تھا۔''

''بچوں والی باتیں کر رہے ہو تم سیف......!'' رومی میرے قریب سے چہک کر بولی۔ طارق بھی ہولے سے مسکرایا تھا اور اسی لہجے میں رومی سے مخاطب ہو کے ازراہِ تفنن بولا۔

''سیف کو! بچہ مت کہو، تمہاری پٹائی نہ کر ڈالے۔''

رومی نے اس کے تبصرے پر منہ بنا لیا۔ طارق شاید فضا کے تکدر کو صاف کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر طارق بولا۔

''دیکھو سیف! ہم تینوں ایک دوسرے کے لیے اہم ہیں اور اب تک ایک ساتھ ہی اس مشن کو لیے آگے بڑھ رہے ہیں، اس میں تمہاری جرأت، تمہارا اب تک کا ساتھ اور ہمت قابلِ داد رہی ہے۔ اس لیے بھی کہ میں رومی تو چلو پروفیشنلز ہیں، لیکن تم نے ایک عام آدمی ہوتے ہوئے بھی بے جگری کے ساتھ خونی سوداگروں کو ناکوں چنے چبوائے ہیں، لیکن دیکھو کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ مصلحت اور کبھی مجبوری کے سبب ہمیں الگ ہو کے بھی کام کرنا پڑ جاتا ہے۔ اب مجھے ہی دیکھ لو، تم اور رومی وہاں ہو اور میں یہاں...... بلکہ میں تو پاکستان سے انڈیا بھی پہنچ چکا۔ میرا خیال ہے تم اب میری بات سمجھ رہے ہو۔ اب میں اور رومی خاموش ہو جاتے ہیں، اب تم ہمیں بتاؤ ہمیں اس صورتِ حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ بلکہ...... چلو،

جیساتم کہو گے ویسا بھی ہم کرنے کو تیار ہیں۔"

یہ کہہ کر طارق چپ ہو رہا۔ رومی بھی خاموش تھی۔ میں نے طارق کی بات کو غور سے سنا تھا۔ اس کی باتیں غلط نہیں تھیں۔

اس نے میری اب تک کی کاوشوں کا بھی اعتراف کیا تھا۔ اس نے آخر میں نہایت دیانت داری کے ساتھ سب کچھ میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا، بلاشبہ یہ اس کی اعلیٰ ظرفی تھی لیکن مجھے بہرحال سوچ میں ڈال دیا تھا۔ بالآخر میں نے کہا۔

"ہمارے اس مشترکہ تنظیم مقصد کو آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ جس طرح تمہیں مجھ پر بھروسا ہے اسی طرح میں بھی رومی اور تم پر مکمل بھروسا رکھتا ہوں۔ بس، اب جیساتم کہو مجھے کوئی اعتراض نہیں......"

"گڈ......!" طارق نے کہا۔ رومی بھی میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"سیف! یقین کرو، یہ ہم دونوں کی پاکستان سے یہاں آنے کے بعد پہلی مہم تھی اور تم نے مجھے اپنی جواں مردی سے حیران کر ڈالا تھا۔ میں یہاں طارق والی بات ہی دہراؤں گی کہ تم کم از کم میرے اور طارق کے مقابلے میں پروفیشنل یا تربیت یافتہ بھی نہیں، یہ صرف تمہارا جذبہ اور بلند ہمتی تھی کہ تم نے میرا یہاں بھی اسی طرح بہت ساتھ دیا۔ اب جبکہ بدقسمتی سے ایک مجبوری آڑے آگئی ہے تو مجھے بھی اس کا دکھ ہے کہ تم ساتھ نہیں ہو، لیکن ظاہر ہے یہ عارضی ہوگا، مجھے یقین ہے میں اور طارق مل کر اس کا بعد میں کوئی حل بھی نکالنے کی کوشش کریں گے۔"

"اور کیا۔" طارق نے درمیان میں کہا۔

اس کے بعد تھوڑی دیر مزید باتیں ہوتی رہیں۔ طارق زیادہ تر رومی کو ہی کچھ ضروری ہدایات دیتا رہا، وہ انڈیا میں اپنی اس وقت موجودگی کے بارے میں کوڈورڈز میں اسے بتاتا رہا۔

لیپ ٹاپ آف کرنے کے بعد رومی اپنی تیاریوں میں لگ گئی، اس کی آج رات بارہ بجے کی فلائٹ تھی، میں اسے سی آف کرنے کے لیے جانا چاہتا تھا مگر کسی مصلحت کے تحت رومی نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

میرے لیے ان دونوں کی یہی ہدایت تھی کہ میں بھی اگلے دن کسی قریبی دستیاب فلائٹ سے...... پاکستان روانہ ہو جاؤں، وغیرہ۔

رومی ایک گھنٹا پہلے ہی ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوگئی۔ رخصت ہوتے سمے اس کی آنکھیں نمناک سی ہوگئیں۔ اسے اکیلے جانے کا دکھ تھا۔ اتنا وقت ہم نے ایک دوسرے کا جاں نثار ساتھی بن کر ساتھ بتایا تھا اور اب جدا ہو رہے تھے، جس کا مجھے بھی رنج تھا، یوں ہمارے درمیان رخصت ہوتے سمے کچھ مزید جذباتی سے مکالموں کا تبادلہ ہوا بلکہ اس وقت تو میں ہکا بکا ہی رہ گیا جب اپنا مختصر سا سامان سنبھالتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے دم دلاسا دے کر آہستگی سے الگ کیا۔

اس کے بعد وہ چلی گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دل اُداس اور دماغ ماؤف سا ہو گیا، ایک خالی الذہنی کی سی کیفیات طاری رہی تھی مجھ پر، ایک قنوطیت سی تھی، جو پھاڑ کھائے دے رہی تھی۔

میں نے کھانا ابھی تک نہیں کھایا تھا اور اب ڈنر کا وقت ہو چلا تھا مگر کھانے کو اب بھی جی نہیں چاہ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کچھ اچانک ہی ختم ہو چکا ہو، جیسے کوئی زبردست اور سنسنی خیز فلم اچانک منقطع ہوگئی ہو۔

کمرے میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا، رومی نے مجھ پر زور دیتے ہوئے یہ دوستانہ مشورہ دیا تھا کہ میں جتنی جلدی ممکن ہو سکے پاکستان روانہ ہو جاؤں، یہاں اب زیادہ دیر پردیس میں "اکیلے" نہ رکوں۔ وجہ اس کے مشورے کی ایک یہی تھی جس "کیفیات" سے میں اس وقت تنہائی میں بیٹھا گزر رہا تھا۔ بہرحال اس کا مشورہ غلط بھی نہ تھا۔

ذرا دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ میں...... کچھ زہر مار ہی سہی، کھانے کی طلب ہو رہی ہے۔ میں نے روم سروس کے ذریعے سینڈوچز اور کافی منگوالی۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ رومی کا طیارہ انڈیا کے لیے اب تک ٹیک آف ہو چکا ہوگا۔ میں بیڈ پر آ کر لیٹ گیا۔

دماغ میں اَن گنت سوچوں کی یلغار ہونے لگی۔ مرحوم بھائی عادل کی یاد آنے لگی، پھر حمیرا یاد آئی...... تو دل مزید اداسی کا شکار ہونے لگا۔ میں نے زندگی میں ایک ہی تو محبت کی تھی، ایک ہی تو لڑکی پسند کی تھی، وہ بھی بدقسمتی کی نذر ہوگئی۔

دوسری جانب اب تک میں نے بھائی کے قاتلوں کو گرفت میں لینے کی کتنی تگ و دو کر ڈالی تھی مگر وہ بھی اب جیسے کوسوں دور جا چکے تھے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں چڑچڑا سا ہونے لگا۔

میں سونے کی کوشش کرتا رہا، فی الوقت شاید یہی میرے لیے زیادہ بہتر تھا۔ بالآخر اس کوشش میں کامیاب رہا، تب کافی رات گئے نیند کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی تھی اور میں گہری نیند میں چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے دن میں سو کر جاگا تو ذہن اور دل و دماغ کو بہتر اور فریش پایا۔ تھکے ہوئے مضمحل دماغی خلیے رات بھر کی نیند پا کر پھر سے نمو پانے کے بعد تر و تازہ ہو گئے تھے۔ ذہن میں از خود ہی تازہ و تابندہ خیالات آ رہے تھے۔

وقت دیکھا تو دس بج چکے تھے، غسل وغیرہ سے فارغ ہوا تو بھوک بھی چمکی، ناشتا میرا ہوٹل کے صاف ستھرے ڈائننگ ہال میں کرنے کا دل کیا تو میں کمرے سے نکل آیا۔

دل و دماغ فریش ہوں تو خیالات بھی درست سمت بتاتے ہیں۔ کافی میں نے روم میں آ کر پی۔ میں تب تک سوچ چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھے اپنا یہ فیصلہ درست لگا۔

میں نے زوہریہ کے سیل فون کا نمبر ملایا۔

''ہیلو۔'' دوسری جانب سے کسی اجنبی خاتون کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا یہ کوئی اس کی گھریلو ملازمہ ہوگی۔

''میں ڈاکٹر سیف بات کر رہا ہوں۔'' میں نے نہایت شستہ لہجے میں کہا۔ ''زوہریہ کی اگر طبیعت ٹھیک ہے اور وہ بات کر سکتی ہے تو پلیز میری ان سے بات کروا دیں۔''

''او ڈاکٹر سیف...... ! میں...... شریطہ بول رہی ہوں...... حبیبی زوہریہ کی طبیعت ٹھیک ہے، میں ابھی بات کراتی ہوں۔''

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ کون خاتون ہے جو بڑے شناسا انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی تھی، یوں جیسے مجھے برسوں سے جانتی ہو۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے، زوہریہ نے اسے میرے بارے میں بتایا۔ مجھے اس کی آواز سریلی اور لہجہ دلکش محسوس ہوا تھا، اس میں حیرانی کی مطلق بات نہ تھی، یہاں ملازمین اسی طرح کے ہی پڑھے لکھے، شائستہ اور خوش اخلاق ہوتے ہیں۔

''جی لیس...... بات کریں......'' ذرا دیر بعد اس کی دوبارہ مترنم سی آواز ابھری۔

''ہ...... ہیلو...... س...... سیف!'' دوسری جانب سے مجھے زوہریہ کی شناسا سا آواز سنائی دی، لہجہ اور آواز ایسا ہی تھا جیسے کوئی حالت بیماری میں بول رہا ہو۔

''تمہاری طبیعت اب کیسی ہے زوہریہ؟'' میں نے بڑی اپنائیت سے پوچھا۔ وہ ایک بہادر لڑکی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے بڑی عزت اور احترام تھا۔ اس نے ہماری بہت مدد کی تھی۔

''خدا کا شکر ہے، میں کچھ بہتر ہوں مگر تم کہاں ہو؟''

''الحمدللہ، خدا تمہیں مزید بھلا چنگا کرے، میں ادھر ہی ہوں اپنے ہوٹل میں......'' میں نے جواب میں کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں کہ کہیں مصروف رہا اور تم سے کوئی خیر خیریت نہیں پوچھ سکا۔''

''چھوڑیں اس بات کو، آپ میرے ہاں آ رہے ہیں ابھی......؟'' اس کے لہجے میں بے چینی تھی۔ میں تو خود بھی اس کے ہاں جانے کا ارادہ کیے بیٹھا تھا مگر اس سے پہلے فون پر بات کرنا چاہتا تھا۔

''بولو تو ابھی آ جاتا ہوں۔''

''اور رومی؟''

''وہ جا چکی ہے۔''

''جا چکی ہے! کہاں......؟''

''یہ میں تمہارے پاس آ کر ہی بتا سکتا ہوں، یہ بتاؤ سب خیریت...... ہے نا؟'' میں نے یونہی پوچھا۔

''بس! آپ آ جائیں، باقی باتیں یہاں ہوں گی۔'' وہ بولی۔ ''آپ آ رہے ہیں نا......؟''

''ابھی نکلتا ہوں۔'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

کپڑے تبدیل کر کے ہوٹل سے نکلا، ٹیکسی کروائی اور نیوٹی جا پہنچا۔

وہاں میرا استقبال ایک دلکش اور خوب صورت خاتون نے کیا۔ وہ اس قدر حسین اور ملکاؤں والے ملکوتی حسن و شباب کی حامل تھی کہ میں کئی لمحے تک اس پر سے اپنی نظریں ہی نہ ہٹا سکا۔

وہ میرے سامنے ایک بھرپور ''عربک خاتون'' کے روپ میں کھڑی تھی۔ سرو قد، متناسب جسمانی خطوط اور اس کے قیامت خیز حسن کو ابھار دینے والا خالص عربی لباس جو گلے سے لے کر پنڈلیوں تک سلکی ''لونگ اسکرٹ'' کی طرح تھا۔

اس کے حسنِ بلا خیز کی طرح آواز بھی مترنم تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ جس کمرے میں لائی وہاں ایک بیڈ پر زوہریہ دراز تھی، جو اٹھ بیٹھی تھی اور مجھے کافی بہتر نظر آ رہی تھی۔

ہم دونوں بڑی گرمجوشی کے ساتھ ملے۔ میں نے اس کی طبیعت پوچھی، چند رسمی کلمات کا تبادلہ ہوا پھر اس نے رومی کے بارے میں پوچھا۔

اس دوران میرے منع کرنے کے باوجود زوہریہ نے شریطہ کو کچھ کھانے پینے کے لیے لانے کا کہہ دیا، میں نے دیکھا شریطہ وہاں سے ٹلی نہیں تھی۔ یعنی اس خوب صورت عورت کا نام شریطہ تھا۔

میں زوہریہ کے بیڈ کے قریب دھری کرسی پر بیٹھ گیا۔ زوہریہ نے مجھ سے پھر رومی کے بارے میں پوچھا۔

میں نے دانستہ کن انکھیوں سے...... پاس کھڑی شریطہ کی جانب دیکھا تھا زوہریہ یہ اشارہ بھانپ گئی اور اس نے شریطہ کو وہاں سے جانے کا کہا۔ وہ چلی گئی۔

"یہ کون ہے؟ کوئی ملازمہ یا کوئی دور پرے کی رشتے دار......؟" میں نے زوہریہ کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا اس سے پوچھ لیا۔

"ملازمہ ہے۔ بے چاری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی۔" زوہریہ نے جواب میں بتایا۔ "پیاری ہے نا......؟" اس نے آخر میں میری طرف معنی خیز نگاہوں سے مسکرا کر دیکھا۔ میں جھینپ کر مسکرایا۔

نجانے میرے اس طرح پوچھنے پر اس نے کیا سمجھا تھا۔ میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، ہلکی مسکراہٹ اور نیک نیتی سے بولا۔

"ہاں! پیاری اور خوب صورت ہے، جب اس نے فون اٹھایا تو یہ مجھ سے یوں مخاطب ہوئی تھی جیسے مجھے پہلے سے جانتی ہو، حالانکہ ہم دونوں آج ہی آمنے سامنے ہوئے ہیں۔ تاہم میرے پوچھنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ایک لحہ توقف کیا۔ "مقصد یہ تھا کہ ایسے حالات میں تمہیں کسی نئے فرد پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اپنے اتنا قریب بھی......"

میری بات پر زوہریہ کے شاداب چہرے پر ایک دم سنجیدگی نمودار ہوگئی، اسی لہجے میں بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو سیف! میں نے اسے تمہارے بارے میں غائبانہ بتا رکھا تھا، لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل دکھی لوگوں کے لیے ایک دم نرم ہو جاتا ہے، ان کی داد و فریاد مجھے اندر سے چیر دیتی ہے۔"

"یہ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔" اچانک ایک بھاری اور مردانہ آواز پر ہم دونوں ہی چونک پڑے۔ دروازے پر یعقوب ترمذی موجود تھا۔ زوہریہ کے باپ کو دیکھتے ہی میں احتراماً اٹھ کھڑا ہوا اور انہیں سلام کیا۔

"جیتے رہو بیٹا! بیٹھو......" وہ میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے پُرشفیق مسکراہٹ سے بولے۔ میری ان سے یہ دوسری ملاقات تھی۔

"میں نے بھی اس سے یہی کہا تھا مگر یہ مانتی کب ہے۔ کوئی اس کے سامنے ایک ذرا آنسو بہا دے اور بس...... یہ اسی کی ہو جائے گی۔ تڑپ جائے گی اس کی مدد کو......"

"جی انکل! زوہریہ واقعی ایسی ہی ہے۔ نرم اور ہمدرد دل کی مالک۔ اللہ اسے اجر دے، لیکن حالات اور احتیاط کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔"

"اللہ میری دست گیری فرمانے والا ہے۔ میں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتی۔" زوہریہ بولی۔

"اچھا بیٹا! تم دونوں باتیں کرو، میں ذرا باہر جا رہا ہوں، کسی چیز کی ضرورت ہو تو حماد موجود ہے۔" یعقوب ترمذی نے کہا اور پھر وہ چلے گئے۔

اتنے شریطہ کھانے پینے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہوئی۔ میں نے کن انکھیوں سے مگر قدرے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں عام سے تاثرات تھے۔

"اس کی کیوں تکلیف کی تم نے؟" میں نے ٹرے میں رکھی کھانے پینے کی اشیاء کی طرف دیکھتے ہوئے زوہریہ سے کہا۔

"میں نے کہاں تکلیف کی ہے؟ یہ تو شریطہ کی مہربانی ہے۔" زوہریہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا جواب ٹرے کو ایک تپائی پر رکھ کر سیدھی کھڑی ہوگئی تھی۔

"میں نے تو کوئی تکلیف نہیں کی، یہ سب کچن میں تیار ہوتا ہے، بس، لانے کی دیر ہوتی ہے۔" شریطہ نے بھی اسی لہجے میں مسکرا کر کہا اور ایک بار پھر میری جانب دیکھا تو مجھے اس کا انداز دل لبھانے والا محسوس ہوا۔

زوہریہ نے اسے جانے کا کہا اور پھر مجھ سے رومی کے متعلق وہی سوال پوچھا تو میں ایک گہری سانس لے کر کہا۔

"رومی انڈیا جا چکی ہے، ڈاکٹر رمیش اگروال کے تعاقب میں......"

"کیا......؟" وہ چونکی۔ "اکیلی چلی گئی ان خطرناک لوگوں کے پیچھے؟"

"اکیلی نہیں ہے وہ...... ہمارا ایک اور ساتھی طارق پہلے ہی پاکستان سے وہاں پہنچ چکا ہے۔" میں نے بتایا۔

"اور تم......؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

"میں نہیں جا سکا، میرا ویزا نہیں لگا تھا۔"

"تو اب تم کیا کرو گے؟"

"واپس پاکستان لوٹ جاؤں گا۔"

"ہمم......!" اس نے ایک پُرسوچ سی ہمکاری خارج کی۔ پھر بولی۔ "کیا تم نہیں جانا چاہتے تھے انڈیا؟"

"اپنے معصوم اور بے گناہ بھائی کے سفاک قاتلوں کے پیچھے تو میں پاتال میں بھی جانے کو تیار تھا مگر......" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ زوہریہ نے اس پر افسوس کا اظہار کیا اور بولی۔

"کاش! میں تمہاری اس معاملے میں کوئی مدد کر سکتی۔"

"تمہارا شکریہ۔ ابھی فی الحال میرے پاس یہی ایک آپشن ہے کہ میں واپس اپنے ملک لوٹ جاؤں۔ وہاں جا کر کوئی صورت پیدا ہو تو ہو...... میں صرف تمہیں خدا حافظ کہنے آیا تھا۔ اب چلوں گا۔"

میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بے چین ہو گئی۔ "لل...... لیکن میری خواہش تھی کہ تم کچھ دن اور یہاں رک جاتے۔"

"نہیں، یہاں میرا دل بے چین رہے گا۔" میں نے جواب میں کہا۔ "میں دراصل جاتے جاتے تمہاری خیریت معلوم کرنے آیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی جانب سے تمہارا شکریہ ادا کرنے بھی کہ تم نے اپنی جان پر کھیل کر یہاں میری اور روی کی اس اہم مشن میں مدد کی۔"

"یہ میرا فرض تھا۔" وہ ہولے سے بولی۔ "لیکن اصل فریضہ تو روی اور تم نے انجام دیا کہ یہاں سے ان خونی سوداگروں کا صفایا کر ڈالا، ورنہ اس اسپتال میں نجانے کب تک معصوم انسانوں کے ساتھ یہ خونی کھیل کھیلا جاتا رہتا۔ اب وہ رمیش خطرناک اشتہاری بھی قرار دیا جا چکا ہو گا۔ یقیناً انہیں اپنے ملک میں بھی پناہ نہیں ملنی چاہیے۔" زوہریہ نے کہا۔

"ہونا تو ایسا ہی چاہیے مگر وہ انڈیا ہے، دیکھیں وہ ان کے خلاف کیا کرتے ہیں، وہاں ان کی سپورٹ کے لیے ایک بااثر سربراہ شنکر جانکیہ کے نام سے موجود ہے۔" میں نے بتایا۔

"کاش! میں کچھ کر سکتی۔" زوہریہ کے لہجے میں حسرت تھی۔

"تم نے اب تک جو کیا، وہ بھی کم نہ تھا، حتیٰ کہ تم نے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی، اللہ تمہیں جلد صحت یاب کرے، اب آگے اللہ ہماری مدد کرنے والا ہے۔"

پھر میں نے جاتے جاتے رک کر کسی خیال کے تحت اس سے کہا۔ "میں پاکستان روانگی سے پہلے ہو سکتا ہے تمہیں ایک کال کروں تو کوشش کرنا تم ہی میری کال ریسیو کرنا اور دوسری بات یہ کہ......" کہتے ہوئے میں نے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا اور نہ ہی مجھے کسی کی وہاں موجودگی کا احساس ہوا، پھر آگے بولا۔

"اس نئی ملازمہ شریطہ سے ذرا محتاط رہنا۔"

"او کے ڈاکٹر صاحب! آپ بے فکر رہیں۔" زوہریہ نے نرم اور شوخ سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور جواب میں، میں بھی اختتامی مسکراہٹ کے ساتھ کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

دروازے تک مجھے شریطہ چھوڑنے آئی۔ وہ میری جانب بار بار... شکاری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کا یہ انداز ناگوار لگا بلکہ میں فکرمند بھی ہوا، لہٰذا میں نے اسے جاتے جاتے پرکھنا ضروری خیال کیا اور اس کی حوصلہ افزائی میں مسکرا کر دیکھ کے بولا۔

"تم بہت خوب صورت ہو۔ تمہارا نام بھی بڑا دلکش ہے، کاش! میں تمہارے ساتھ کچھ وقت گزار سکتا۔"

شاید میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا تھا، کیونکہ اسی وقت اس نے محتاط اور "چور" سی نگاہوں سے ذرا گردن موڑ کر اس کمرے کی طرف دیکھا تھا پھر ایک ذرا ایڑیاں اونچی کر کے باہر کی طرف جھانکا، شاید وہ زوہریہ اور حماد (ملازم) کو غیر متوجہ پا کے مجھ سے کوئی رازداری برتنا چاہتی تھی، وہی ہوا۔ وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی۔

"میں بھی تمہیں پسند کرنے لگی ہوں، تم بہت ہینڈسم اور اسمارٹ ہو۔ ہم دوبارہ مل سکتے ہیں۔"

"کیسے کب؟" میں نے دل پھینک عاشقوں کی سی بے چینی و بے قراری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اس کے گداز اور بھرے بھرے خم دار جسم کو گھورنے لگا۔ وہ میری نظروں کی "آوارگی" کو...... بھانپ گئی اور معنی خیز لہجے میں بولی۔

"بہت جلد باز لگتے ہو۔"

"ایسی ہی بات ہے۔" میں بھی معنی خیز لہجے میں بولا۔

"تم کچھ ملنے کا بتا رہی تھیں؟" میں نے بے تابی سے اسے یاد دلایا۔

"ہاں! ایک پتا نوٹ کر لو، آج رات یہاں پہنچ جانا۔ میں تمہیں منتظر ملوں گی۔"

میں نے اس کی بات پر فوراً اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ اس نے جو پتا مجھے نوٹ کروایا، وہ میں نے اچھی طرح ذہن نشین کر لیا پھر پوچھا۔

"لیکن تم تو ادھر ہی رہتی ہو مستقل، وہاں کیسے آؤ گی؟"

"یہ میرا کام ہے، تم اس کی فکر نہ کرو۔"

"لیکن مجھے وہاں صرف شریطہ چاہیے اور کوئی نہیں۔"

میں نے پیار سے اس کے نرم و گداز گال کو چھوا۔

"تمہاری شریطہ تمہیں وہیں ملے گی، کیوں فکر کرتے ہو۔" کہتے ہوئے وہ ایک دل نواز سی مسکراہٹ کے ساتھ میرے بے حد قریب آ گئی، اس قدر کے اس کا ڈھلکتے ہوئے سلکی لباس میں ملفوف بھرے بھرے نرم و گداز جسم کا لمس مجھے محسوس ہونے لگا اور پھر بے اختیار نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں

نے دیوانہ وار خود سے لپٹا کر اس کے دلنشین ہونٹوں کا بوسہ لے لیا۔ میری پیار بھری گرفت میں اس کی کجراری آنکھیں مخموری سی ہونے لگیں، لوہا گرم تھا اور میں نے اپنائیت اور بے خودی دکھاتے ہوئے اسے مزید بھینچ لیا اور اپنے ہاتھوں کو تھوڑا آوارہ گردی کی جانب بھی مائل کیا تو وہ بالکل پگھل گئی، لیکن پھر جلد ہی سنبھلتے ہوئے مدہوش بھری سرگوشی میں بولی۔

"پلیز...... باہر حماد موجود ہے۔"

میں اس سے رخصت ہو گیا۔

زوہریہ کی عالیشان رہائش گاہ سے باہر آنے کے بعد میں نے شریطہ کے ساتھ ہونے والی "اٹھکیلیوں" کے متعلق سوچا۔ بے شک یہ ایک حربہ ہی مگر میں ایسا کر جاتا تھا، شاید اس کی وجہ حمیرا سے میری محرومی تھی۔ میں گاہے بہ گاہے اپنا احتساب بھی کر لیتا تھا اور یہ حقیقت تھی کہ وقت گزرنے کے ساتھ مجھ پر یہ بات آشکارا ہو گئی تھی کہ میں غیر معمولی حسین اور جسمانی کشش کی حامل لڑکیوں اور عورتوں میں "حربے" کے نام پر زیادہ ہی دلچسپی لینے لگا ہوں۔ پتا نہیں میں خود کو دھوکا دیتا ہوں یا پھر حمیرا سے محرومی کا خلا پُر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر...... میں باوجود کوشش کے خود کو روک نہیں پاتا۔ شاید کوئی نفسیاتی "پیچ" میرے اندر پروان چڑھنے لگی تھی۔ شاید کچھ یہی وجہ تھی کہ میں زوہریہ اور رومی سے دوری پر بھی جھلایا ہوا تھا۔

بہرکیف...... اپنے ہوٹل آکر میں ایک بار پھر مایوسی کا شکار ہونے لگا۔ میرا خیال تھا کہ زوہریہ کچھ مدد کر سکتی تھی، لیکن وہ بھی مجبور ہی رہی۔ میں نے بھی اس سے کہنا ضروری خیال نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کا معاملہ تو نہ تھا کہ ٹکٹ لیا اور چلے گئے۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کے کچھ قواعد ضوابط ہوتے ہیں اور اس میں بھی اگر ذرا سا کوئی سقم ہو جائے تو جانا اور بھی ناممکن ہی ہو جاتا ہے، یہی میرے ساتھ ہوا تھا، نجانے میرے ویزے میں ایسا کون سا آبجیکشن لگایا گیا تھا کہ اسے ریجیکٹ کر دیا گیا اور رومی...... کے سلسلے میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا، البتہ طارق اگر پاکستان سے انڈیا گیا تھا تو مجھے بھی امید تھی کہ کیا خبر وہاں سے میرا انڈیا کا ویزا لگ جائے، یوں بھی طارق نے مجھے امید دلائی تو تھی کہ میں پہلے پاکستان پہنچوں اور اس سے لاسلکی رابطے میں رہوں، وہ کوئی صورت نکالنے کی کوشش کرے گا۔

اس کے بعد میں شریطہ کی آج ہونے والی طے شدہ ملاقات کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اس کی اصلیت جانچنے کے لیے ایک جوا تو کھیلا تھا اب دیکھنا تھا کہ وہ کس قدر کامیاب رہتا ہے، اگر آج شریطہ کی طرف سے میرا شک باطل قرار پاتا تو میں بے فکری سے پاکستان کوچ کر جانے کا قصد کیے ہوئے تھا، شریطہ کی وجہ سے میں نے اپنے واپسی کے پروگرام میں کچھ تاخیر کر ڈالی تھی، کیونکہ مجھے زوہریہ کی فکر تھی۔

شام ہونے لگی اور اس کے بعد جب رات ہو گئی پھر میں نے مقررہ وقت کے مطابق زوہریہ کے سیل پر رابطہ کیا۔

میری نصیحت کے عین مطابق زوہریہ نے ہی کال اٹینڈ کی تھی، کیونکہ دوسری جانب سے اسی کی ... مترنم آواز ابھری تھی۔

"زوہریہ! یہ میں ہوں، اگر شریطہ تمہارے پاس موجود ہے تو میرا نام مت لینا کسی اور کا لے کر اسے پہلے کمرے سے جانے کا کہہ دو۔"

وہ میرا اشارہ ہی نہیں بلکہ بات بھی سمجھ گئی تھی۔ اس نے یہی کیا، کیونکہ شریطہ وہاں موجود تھی۔

"ہیلو، جہانزیب! کیسے ہو؟" پھر میں نے اسے شریطہ کو باہر بھیجنے کا کہتے سنا۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"وہ چلی گئی ہے۔ خیریت تو ہے؟"

"خیریت بالکل نہیں ہے۔" میں نے فرطِ جوش تلے تیزی سے دھڑکتے دل کے ساتھ زوہریہ سے کہا اور اس سے آج دن والی اپنی "حرکت" کا ذکر کیے بغیر بتاتے ہوئے مزید کہا۔

"آج اسے مجھ سے ملنے کے لیے ایک مقام پر آنا تھا، مگر وہ ابھی تک تمہارے پاس ہی موجود ہے، جس کا مطلب ہے کہ میرا اس پر شبہ درست ثابت ہوا، کیونکہ وہاں یقیناً مجھے "ٹریپ" کیا جانا والا تھا، نجانے وہ کون ہو سکتے ہیں، لیکن وہ ضرور شریطہ کے ہی ساتھی ہوں گے...... تم از حد محتاط ہو جاؤ، وہ بیک وقت یہاں تمہارے پاس بھی کوئی گل کھلا سکتی ہے، بلکہ ممکن ہو تو......" میری بات حلق میں ہی اٹک گئی کیونکہ اسی لمحے...... دوسری جانب سے زوہریہ، جو اب تک میری بات غور سے سُن رہی تھی اچانک...... تھرتھراتے لہجے میں بولی۔

"س...... سیف...... !اوہ...... وہ......"

"ہاں...... ہاں......! کک...... کیا ہوا؟ خیریت...... کچھ تو بولو......" میں چلا پڑا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے فون پر ایک دھماکے کی آواز سنی اور میرا دل بیٹھنے لگا۔

ان دیکھے دشمنی کے جال میں جکڑے نوجوان کی مزید مشکلات آئندہ ماہ پڑھیں

بھرم

حسام بٹ

یادیں اور باتیں بیتے وقت کا وہ خزانہ ہوتی ہیں جو انسان کی دسترس میں رہتی ہیں... جب دل چاہے ایک اک یاد کو اٹھاؤ... اور پلکوں سے پونچھ کے واپس رکھ دو... اشک نہیں یہ آنکھ میں رکھے قیمتی شیشے ہوتے ہیں... فضاؤں اور دلوں کو بوجھل کر دینے والے ایام کا ملال... چار دوستوں کے ذہن و دل میں اُبھرنے والے سوال...

ڈوب کر محبت کا بھرم رکھنے والے شکستہ دلوں کا زوال......

وہ چاروں ایک ایرانی ریسٹورنٹ میں بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے۔ وہ ہفتے دس دن میں ایک ایسی بیٹھک رکھ لیا کرتے تھے اور یہ ایرانی ریسٹورنٹ ان کی من پسند جگہ تھی۔ ایک وقت تھا جب کراچی میں ایرانی ریسٹورنٹس کی بہار ہوا کرتی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے یہ ریسٹورنٹ ''غائب'' ہونے لگے۔ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں اور اُن کی بھی حالت پہلے جیسی نہیں رہی۔

ان چار دوستوں کو یہ ریسٹورنٹ اس لیے بھی پسند تھا

کہ یہاں بیٹھ کر وہ بڑے سکون سے دل کے پھپھولے پھوڑ سکتے تھے۔ وہ عمر کے اس حصے میں پہنچ چکے تھے جہاں انسان کو تنہائی کا غم مار ڈالتا ہے اور یہ تنہائی اگر اولاد کی جدائی یا دوری کے باعث ہو تو پھر غم بھی سوا ہو جاتا ہے۔ ان چاروں کے درمیان اولاد کا دکھ قدرِ مشترک کی حیثیت کا حامل تھا اور ان کی تمام تر گفتگو اسی پوائنٹ کے گرد گھومتی تھی۔

الیاس خان نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میری زندگی کا پہلا اور آخری سہارا میرا بیٹا تھا مگر اسے سڈنی کا مرض لاحق ہو گیا۔ وہ سڈنی کو اور سڈنی اسے چھوڑنے کا نام نہیں لیتا اور میں یہاں اس آس میں اپنی سانسیں پوری کر رہا ہوں کہ ایک نہ ایک دن سہیل کو میرا خیال آئے گا اور وہ سڈنی کو لات مار کر میرے پاس چلا آئے گا مگر...... جانے وہ دن کب طلوع ہو گا۔ کہیں اس سے پہلے میری زندگی کا سورج غروب نہ ہو جائے......!''

الیاس خان کی ایک ہی اولاد تھی یعنی سہیل جسے آسٹریلیا جانے کا بہت شوق بلکہ جنون تھا۔ الیاس خان نے بیٹے کی خوشی کی خاطر قرض ادھار کر کے ایک ایجنٹ کے ذریعے اسے آسٹریلیا بھجوا دیا تھا۔ ایک آدھ سال ادھر اُدھر دھکے کھانے کے بعد سہیل سڈنی میں سیٹ ہو گیا تھا۔ اب اس کے پاس ایک اچھی جاب تھی اور اس نے ایک نرس سے شادی بھی کر لی تھی۔ دونوں میاں بیوی کما رہے تھے اور عیش و آرام کی زندگی گزار رہے تھے لیکن الیاس خان یہاں بیٹھا اپنے بیٹے کی راہ تک رہا تھا۔ سہیل نے گویا ماضی کو حرفِ غلط کے مانند اپنی یادداشت سے مٹا ڈالا تھا اور اسی گم گشتہ ماضی میں اس کا باپ بھی دفن ہو گیا تھا۔

''الیاس خان! اللہ کا شکر ادا کرو کہ تمہارا بیٹا اپنے دین پر قائم رہے۔'' ظہور حسین نے کہا۔ ''وہ تم سے دور ہے تو کیا ہوا، تمہیں اس کی واپسی کی اُمید بھی ہے اور خواہش بھی جبکہ میں داؤد کے حوالے سے ان دونوں چیزوں سے محروم ہو چکا ہوں۔ مجھے اس کی واپسی کی توقع ہے اور نہ ہی چاہت۔ اس ناخلف نے کام ہی ایسا کیا ہے کہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا......''

''ایسے کیوں کہہ رہے ہو ظہور حسین؟'' مقصود حسین نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تمہارا بیٹا برلن میں ہے اور برسرِ روزگار بھی ہے۔ جرمنی کو بہشتِ ارضی کہا جاتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت تو وہاں جانے اور سیٹل ہونے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا خواب سمجھتے ہیں۔ تمہیں داؤد کے برلن میں رہنے سے کیا تکلیف ہے؟''

''تم لوگ میری تکلیف کو نہیں سمجھ سکتے......'' ظہور حسین نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔

''تم سمجھاؤ گے تو ہم ضرور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔'' توفیق احمد نے کہا۔ ''بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟''

''جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ داؤد نے سیاسی بنیاد پر جرمنی میں اسائیلم لیا تھا۔'' ظہور حسین نے کہا۔ ''تم لوگ یہ بات اس لیے جانتے ہو کہ میں نے تمہیں یہی بتا رکھا ہے۔''

''یار، پہیلیاں نہیں بجھواؤ......'' الیاس خان نے بیزاری سے کہا۔ ''ظاہر ہے، ہمیں تو وہی معلوم ہے جو تم نے بتایا۔ ہم نے داؤد سے جا کر تو پوچھا نہیں اور...... تم نے سہیل کے حوالے سے ایمان کی سلامتی کی بات کیوں کی......؟''

''آہ...... یہی تو میرا دکھ ہے دوستو۔'' ظہور حسین نے ایک افسردہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ داؤد نے جرمنی میں پولیٹیکل اسائیلم (سیاسی پناہ) لی ہے مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔''

''حقیقت کیا ہے؟'' توفیق احمد نے سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔

''میں یہ سچائی جان چکا ہوں کہ داؤد نے جرمنی میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے لیے اپنا مذہب تبدیل کر لیا ہے۔'' ظہور حسین نے غم سے بوجھل لہجے میں انکشاف کیا۔

توفیق احمد نے پوچھا۔ ''کیا وہ عیسائی ہو گیا ہے؟''

''اگر وہ عیسائی ہو جاتا تو شاید میں اندر سے اتنا ٹوٹ پھوٹ نہ جاتا۔'' ظہور حسین جذبات سے مغلوب آواز میں بولا۔ ''وہ بدبخت قادیانی ہو گیا ہے۔ قادیانیوں کو جرمنی میں بہ آسانی پناہ مل جاتی ہے اور اس نے یہی راستہ اختیار کیا۔ میں اپنے ہادی، تاجِ دارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے سخت شرمندہ ہوں۔''

''ظہور حسین! تمہارے بیٹے نے جو کیا، یہ اس کا ذاتی فعل ہے۔'' توفیق احمد نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہر انسان اپنے اعمال کا خود جواب دہ ہے۔ میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں لیکن داؤد کے عمل کی وجہ سے تم اپنے آپ کو اذیت نہ دو۔ مجھے یقین ہے، داؤد کی غلطی کے لیے امام الانبیا تمہیں قصوروار نہیں ٹھہرائیں گے۔''

''توفیق بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ظہور حسین۔'' مقصود حسین نے معتدل انداز میں کہا۔ ''جب اولاد اختیار سے باہر ہو جائے تو انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے جیسا کہ میں نے کیا ہے۔''

مقصود حسین دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا باپ تھا۔ بیٹی گھر

سے بھاگ کر اس کی عزت کا فالودہ بنا گئی تھی اور بیٹوں نے اسے یکسر فراموش کر رکھا تھا۔ وہ دونوں شادی شدہ اور بچوں والے تھے۔ وہ خوش حال زندگی بسر کر رہے تھے مگر انہیں اپنے باپ کا بالکل خیال نہیں تھا۔ مقصود کو زندگی کا چراغ روشن رکھنے کے لیے اس عمر میں بھی کڑی محنت کرنا پڑتی تھی۔ جب تک اس کی اہلیہ زندہ تھی، وہ محنت مشقت سے نہیں گھبراتا تھا لیکن اب وہ بُری طرح ٹوٹ چکا تھا۔ بس، بکھرنا باقی تھا۔

”بھئی توفیق! تمہارے بیٹے کی کیا خبریں ہیں؟“ الیاس خان نے پوچھا۔ ”ناصر سے ہماری ملاقات کب تک متوقع ہے۔ ہم میں ایک تم ہی ہو جسے اولاد کا کوئی غم ہے اور نہ دکھ۔“

توفیق احمد کا اکلوتا بیٹا ناصر ٹورنٹو میں سیٹل تھا۔ اس نے الیاس خان کے استفسار کے جواب میں بتایا۔ ”ایک ماہ پہلے ناصر کا خط آیا تھا جس میں اس نے اسی سال پاکستان آنے کا ذکر کیا تھا۔ وہ کب یہاں آئے گا، میں اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں تو کہتا ہوں، ناصر جہاں بھی رہے، میرا پروردگار اسے خوش اور سلامت رکھے۔ میں اس کی طرف سے مطمئن ہوں۔ ماشاء اللہ! اس نے ایک عرب النسل کینیڈین لڑکی صوفیہ سے شادی کی ہے اور ان کے دو بچے بھی ہیں، حیا اور طلال۔ ٹورنٹو کی خبریں تو میں برابر تم لوگوں کو سناتا رہتا ہوں۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ الیاس نے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ”جب بھی ناصر کا کوئی خط آتا ہے، تم اس کا ذکر ہم سے ضرور کرتے ہو۔“

”یہ اپنا توفیق تو چھپا رستم ہے یارو......“ مقصود حسین نے پُرمعنی انداز میں کہا۔ ”اس خدا کے بندے نے اپنے بیٹے کے تمام خطوط کو ایک فولڈر میں سنبھال کر رکھا ہوا ہے اور اس فولڈر کے کور پر ناصر کی فوٹو کے نیچے ”مکاتیبِ ناصر“ کا لیبل بھی چسپاں کر رکھا ہے۔ میں ایک بار اس سے ملنے گھر گیا تو اس نے مجھے وہ فولڈر دکھایا تھا جس کے اندر پچھلے پانچ سال میں موصول ہونے والے ناصر کے تمام خطوط محفوظ ہیں۔“

”ہم میں ایک توفیق ہی ایسا ہے جسے خوش قسمت کہا جاسکتا ہے۔“ الیاس خان نے معتدل انداز میں کہا۔ ”ناصر اس سے ہزاروں کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے مگر اس کے ساتھ برابر جڑا ہوا ہے۔ ان باپ بیٹے میں ذہنی اور روحانی کنکشن قائم و دائم ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بڑے بھرپور انداز میں یاد رکھا ہوا ہے۔ اللہ ہر باپ کو ناصر جیسا

فرمانبردار اور لائق فائق بیٹا عطا فرمائے...... آمین۔"
مقصود اور ظہور نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ "ثم آمین......"
توفیق احمد کی آنکھیں چھلک گئیں۔
الیاس خان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "ارے توفیق! یہ کیا، تم رو کیوں رہے ہو......؟"
"یہ خوشی کے آنسو ہیں دوستو......" توفیق احمد ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے نمناک لہجے میں بولا۔ "اچانک مجھے ناصر کی ماں یاد آگئی تھی۔ اس نیک دل خاتون کی خواہش تھی کہ ناصر بہت زیادہ ترقی کرے۔ آج جب ناصر کو دنیا کی ہر نعمت، عیش اور آرام حاصل ہے تو یہ سب دیکھنے کے لیے اس کی ماں اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔ آہ...... قدرت کے کھیل بھی نرالے ہیں۔"
ماحول میں افسردگی اتر آئی تھی۔ فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے انہوں نے موضوعِ گفتگو تبدیل کیا اور روزمرہ کی سیاست اور ملک کی تیزی سے بگڑتی ہوئی معیشت پر بات کرنے لگے۔

☆☆☆

آج سلمیٰ اسے بے طرح یاد آرہی تھی۔ چھ سال پہلے وہ توفیق کو داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ توفیق نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا تھا لیکن ایک سال کے بعد جب ناصر نے اچانک کینیڈا جانے کا فیصلہ کیا تو توفیق کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ اگر سلمیٰ کی جدائی نے اسے ادھ موا کر دیا تھا تو ناصر کی روانگی نے تو اسے جان ہی سے گزار دیا ہے۔ جدائی عارضی ہو یا دائمی...... اس کی اذیت جان لیوا اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔
سلگتے دماغ، بوجھل دل اور تکان زدہ قدموں کے ساتھ وہ گھر پہنچا اور سیدھا بیڈ روم کا رخ کیا۔ اس کی حالت تو ایسی ہو رہی تھی کہ اسے ایک بھرپور، پُرسکون نیند کی ضرورت تھی مگر ایک ضروری کام کو نمٹائے بغیر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔
اس نے اپنے بیڈ روم کے ایک کونے میں لکھنے پڑھنے کے لیے ایک ٹیبل چیئر کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس نے الماری کھول کر اس کے اندر سے "مکاتیبِ ناصر" والا فولڈر نکال لیا اور اپنی سیٹ پر آبیٹھا۔ مذکورہ فولڈر کو اس نے میز پر رکھا اور ایک اعلیٰ درجے کے امپورٹیڈ کاغذ پر اپنے قلم کو رواں کر دیا۔
از ٹورنٹو (اونٹاریو) کینیڈا۔
بہ نام پیارے ابو جی!
السلام علیکم...... میں اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ یہاں پر بالکل خیریت سے ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ بھی ٹھیک ہوں گے۔ ابو جی! میں نے پچھلے خط میں آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اس سال میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ آپ سے ملنے ضرور آؤں گا لیکن آفس میں کچھ ایسے ایشوز کھڑے ہو گئے ہیں کہ ابھی چند ماہ تک مجھے چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے، آپ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اب ہماری ملاقات آئندہ سال ہی ہوگی۔
ابو جی! میں نے سنا ہے، اس سال کراچی میں قیامت خیز سردی پڑنے والی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ پچھلے پچاس سال کا ریکارڈ ٹوٹ جائے گا۔ میں نے کوریئر کے ذریعے آپ کے لیے بہت سارے گرم کپڑے بھجوائے ہیں جو ایک ہفتے میں آپ کو مل جائیں گے۔ اپنا خیال رکھیے گا۔ آپ میرے لیے بہت اہم ہیں۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں، یہ سب آپ کی مہربانی ہے......!
صوفیہ آپ کو سلام کہہ رہی ہے اور بچے کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ دونوں آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔
والسلام
آپ کا بیٹا
ناصر توفیق
توفیق نے اس تحریر کو "مکاتیبِ ناصر" والے فولڈر میں لگا دیا پھر اپنے لختِ جگر کی تصویر سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔
"دیکھو بیٹا! میں نے پچھلے پانچ سال سے تمہارے بھیجے ہوئے ان خطوط کو کتنے سلیقے اور محنت سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ یہ کاغذ کے ٹکڑے میرے لیے آکسیجن کی طرح ہیں۔ انہی کی مہربانیوں کے طفیل میں سانس لے رہا ہوں۔ مجھے تم پر فخر ہے بیٹا...... کہ تمہاری وجہ سے میں اپنے دوستوں میں سینہ چوڑا کر کے بیٹھتا ہوں۔ تم میرے سینے پر سجا ہوا ایک تمغا ہو، میری عزت و آبرو ہو، میرے جینے کا بہانہ ہو۔ اللہ تمہیں سلامت تا قیامت رکھے...... آئی لو یو بیٹا......"
اس کے بعد توفیق احمد نے اپنی پیشانی کو میز پر ٹکایا اور سسک سسک کر رونے لگا۔ اس کا دل غم سے بوجھل اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں لیکن اسے اپنی اس حالت کی ذرا سی بھی پروا نہیں تھی کیونکہ وہاں کوئی اس کی جذباتی شکست و ریخت کو دیکھنے والا موجود نہیں تھا۔
اس کا یہ بھرم پچھلے پانچ سال سے اسی طرح قائم تھا......!

❖❖❖

سزا

سیر ینا راض

بہن بھائیوں کی محبت میں جو چاہت... لگاوٹ اور احساس غالب ہوتا ہے... وہ وقت کے ساتھ بڑھتا ہے... اور بظاہر شب و روز ساتھ گزارتے ہوئے ہمیں اس محبت کا احساس نہیں ہوتا... جو اس کے جانے کے بعد عیاں ہوتی ہے... اس کی زندگی میں خالی پن بڑھ گیا تھا... وہ بہن جسے وہ اپنی زندگی کی اولین ترجیح سمجھتا تھا... اس سے کوسوں دور جا چکی تھی...

تنہا، سرد راتوں میں دلوں کو اُداس کر دینے والی تحریر کا حسن......

وہ جیک گورن کے بار پر برانڈی کی طلب میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچپن کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے نیوی بلیو سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا کہ جیسے وہ مجھے نہیں دیکھ رہا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی توجہ مجھ پر ہی ہے۔ میرا اندازہ درست نکلا جب وہ برانڈی کے تین پیگ پینے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوا۔

''مسٹر کیس پیرک؟''

''کیسپر۔'' میں نے اپنا مختصر نام بتایا۔ ''تم مجھے کوپر

بھی کہہ سکتے ہو۔"

"میرا نام ریڈ کلف ایڈلین ہے۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "میری بہن نے تمہارا نام تجویز کیا تھا۔"

"کیا میں اسے جانتا ہوں؟" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں، فلورنس ایڈلین۔ تین ہفتے قبل اس کا انتقال ہو گیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس نے پیراڈائز ٹاورز کی چھت سے کود کر خودکشی کر لی۔"

مجھے یاد آ گیا۔ وہ مسز وائٹ ہارٹ تھی۔ ہم اسے اسی نام سے جانتے تھے کیونکہ کسی کو بھی اس کا اصل نام معلوم نہیں تھا۔ ہارٹ لین وہ جگہ ہے جہاں وہ بھیک مانگتی اور گھومتی رہتی تھی اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے یہ ٹائٹل پسند تھا کیونکہ یہ اس کی شخصیت کے ساتھ چپک گیا تھا۔ لندن میں جگہ جگہ ایسے لوگ ملیں گے جو سڑکوں پر گھوم پھر کر مختلف طریقوں سے بھیک مانگتے ہیں۔ ان میں ایسے بوڑھے بھی ہیں جو کرنسی تبدیل کرنے یا بڑے نوٹ بھنانے کی آڑ میں کچھ رقم اینٹھ لیتے ہیں یا وہ لوگ جو بے مقصد آوارہ گردی کرتے ہیں۔ وہ دور سے بہت اچھے لگتے ہیں لیکن قریب آنے پر ان سے ڈر لگنے لگتا ہے۔

"وہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔" ریڈ کلف نے کہا۔ "ہمارا تعلق اچھے خاندان سے ہے۔ ہم دونوں بہن بھائیوں نے پبلک اسکول میں پڑھا۔ میں اس سے ایک سال آگے تھا اور ہمیں زندگی کی ہر آسائش میسر تھی۔"

"تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟"

"پولیس اس کی موت کو خودکشی قرار دے رہی ہے۔" اس نے کہا۔

"اور تم اس سے متفق نہیں ہو؟"

"میں اپنی بہن کو جانتا ہوں۔ وہ گھومنے پھرنے کی حد تک پاگل تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ کسی اونچی عمارت سے چھلانگ لگا دے۔"

میرا گلاس خالی ہو چکا تھا۔ میں نے بارمین کو اشارہ کیا اور اس نے میرا گلاس دوبارہ بھر دیا۔ اس کی قیمت ریڈ کلف نے ادا کی۔

"میں اس معاملے کی تحقیقات کرنے کے لیے تمہاری خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ اگر اس کی موت میں کسی کا ہاتھ ہے تو میں اسے گرفتار کرائے بغیر چین سے نہیں بیٹھوں گا۔"

"تمہیں یہ شبہ کیوں ہوا؟"

"اس نے اپنی موت سے پہلے منگل کے روز مجھے فون کیا جبکہ ہمارے درمیان ہر اتوار کو فون پر گفتگو ہوتی تھی اس لیے یہ ایک غیر متوقع بات تھی۔ اس نے بتایا کہ کوئی شخص اسے خوف زدہ کر رہا ہے۔ وہ اکثر ایسی باتیں کیا کرتی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ یہ احمقانہ بات ہے۔ اسے اسی طرح کے شبہات ہوا کرتے تھے لیکن میں اس سے پریشان ہو جاتا تھا۔ اس وقت میں کام پر تھا اس لیے زیادہ بات نہ ہو سکی تاہم میری خواہش تھی کہ اس سے مزید تفصیل پوچھوں۔"

"اس کے علاوہ کوئی بات؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے کہا۔ "میں نے اخبارات میں Tramp baating کے بارے میں پڑھا ہے یعنی کچھ لوگ بے گھر لوگوں اور فقیروں کو مارتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے بھی ان کے بارے میں سُنا ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ کچھ لڑکے اس علاقے میں بے گھر لوگوں کو مارتے ہیں۔ تمہارا خیال ہے کہ ان لوگوں نے تمہاری بہن کو چھت سے نیچے پھینکا ہوگا؟"

"میں نہیں جانتا۔" ریڈ کلف نے کہا۔ "میں سراغ رساں نہیں ہوں۔"

"تم نے اس بارے میں پولیس کو بتایا؟"

"بالکل لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ چھت پر جانے کا راستہ کھلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک مخبوط الحواس عورت تھی۔ ایسے لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تو تم چاہتے ہو کہ میں اس کا کھوج لگاؤں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی اور دونوں ہاتھ بار کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے بولا۔ "فلورنس نے تمہاری تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ تم بہت نفیس آدمی ہو۔ تمہاری کبھی اس سے ملاقات ہوئی ہوگی۔"

"اچھا۔" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

"میں تمہیں اس کام کا منہ مانگا معاوضہ دوں گا۔" کلف نے کہا۔

عام طور پر میں کام کے لیے ہاں کر دیتا ہوں۔ اس کھیل میں یہی ہوتا ہے کہ جو چل رہا ہے، وہ پکڑ لو گو کہ یہ ایک الجھا ہوا کیس تھا لیکن اس طرح کے کام میں چیلنج سمجھ کر قبول کر لیتا ہوں۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دیکھتا ہوں کہ اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے۔''

میں نے اسے اپنی فیس بتائی جس پر اس نے کوئی بحث نہیں کی۔ شاید میں اس سے زیادہ بھی مانگ سکتا تھا۔ اس نے میری ایک ماہ کی تنخواہ اور اخراجات کے لیے دوسو پاؤنڈز کا چیک لکھا اور اس کے ساتھ ہی مجھے اپنا کارڈ بھی دے دیا جس پر اس کا نمبر لکھا ہوا تھا۔

''اگر کوئی پیش رفت ہو تو مجھے اس نمبر پر فون کرنا لیکن صرف مجھ سے، میری سیکریٹری سے نہیں، یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی ہماری ملاقات ختم ہوگئی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور رخصت ہو گیا۔

میں نے چیک پر ایک نظر ڈالی اور جو کچھ اس نے اپنی بہن کے لیے کہا تھا، اسے میں نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ ان دنوں وہ کیسی لگتی تھی۔ جب مجھے چند مرتبہ وائٹ ہارٹ لین جانے اور اس سے باتیں کرنے کا اتفاق ہوا تھا، بے ترتیب لباس، پھندنے والی ٹوپی اور کھچڑی بال۔ اس کی انگلیاں کثرتِ تمباکونوشی سے زرد ہو چکی تھیں اور سانسوں سے بیئر اور سگریٹ کی بو آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں اس پتلے کی طرح لگتی تھی جسے کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے کے لیے کھڑا کیا جاتا ہے۔ خستہ حال اور اوٹ پٹانگ...... وہ ایسی شخصیت نہیں تھی جسے دیکھ کر کوئی تاثر قائم کیا جا سکے اسی لیے مجھے کبھی اس کا خیال نہیں آیا۔

آخر کیا وجہ ہے کہ لوگ اس حال کو پہنچ جاتے ہیں؟ مسز وائٹ ہارٹ اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ اس کا انتقال تین ہفتے قبل ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز صبح میں ووڈ گرین لائبریری گیا تا کہ اخبار میں فلورنس کی موت سے متعلق خبر یا کوئی آرٹیکل پڑھ سکوں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی توقع تھی کہ بے گھر لوگوں کی پٹائی کرنے والوں کے بارے میں کچھ مواد مل جائے۔

''ٹریمپ بیشرز Tramp bashers دو سفید فام نوجوان تھے جنہوں نے گزشتہ چند ماہ میں کم از کم چھ بے گھر افراد کی رات گئے پٹائی کی تھی۔ وہ سڑکوں یا پارکوں میں سو رہے تھے۔ اخبارات نے اسے نفرت پر مبنی جرم قرار دیا تھا۔ سب سے زیادہ سنجیدہ حملہ پندرہ روز پہلے ایک گیراج میں ہوا۔ متاثرہ شخص ایک ایرانی پناہ گزین تھا جس کے سر پر شدید چوٹ آئی اور اس کا آپریشن کرنا پڑا۔

اگر مسز وائٹ ہارٹ بھی ان کے تشدد کا نشانہ بنی تو یہ کارروائی چھت پر ہی ہوئی ہوگی اور یہ کوئی غیر حقیقی بات نہیں لگتی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ بہت محتاط یا خوف زدہ ہو اور وہ لڑکے اس کا پیچھا کرتے ہوئے چھت تک پہنچ گئے ہوں...... کچھ بھی ممکن ہے لیکن اس سے بھی یہ واضح نہیں ہوتا کہ وہ پیراڈائز ٹاورز کی چھت پر کیوں گئی تھی۔

اخبار نے فلورنس کو ایک ہردلعزیز مقامی بے گھر عورت قرار دیا تھا جس کی ذہنی صحت ٹھیک نہیں تھی اور اس نے جمعرات کی شب چھت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی ایک پرانی تصویر بھی شائع کی گئی تھی جس میں وہ اپنی عمر سے بہت کم نظر آرہی تھی۔ اس خبر میں کسی گواہ کا ذکر نہیں تھا جس نے اسے چھت پر جاتے ہوئے دیکھا ہو۔

اخبار پڑھنے کے بعد میں کچھ دیر وہیں بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ بھکاری نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ فٹ بال اسٹیڈیم سے پچاس گز کے فاصلے پر گشت کرتی رہتی تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک چھتری ہوتی تھی۔

پیراڈائز ٹاور، اپنے نام کے برعکس تھا۔ شمال مشرقی لندن میں واقع ستّر کی دہائی میں بنی یہ عمارت انتہائی خستہ حالت میں تھی اور اسی وجہ سے خوفناک نظر آتی تھی۔

وہ ایک سرد اور اُداس سہ پہر تھی جب میں وہاں پہنچا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں وہاں کس چیز کی تلاش میں آیا ہوں۔ میرے کام میں یہ ایک عام بات تھی۔ ٹاور کے احاطے میں داخل ہونے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا۔ دس منٹ ٹہلنے کے بعد میں نے ایک عورت کو بلاک سے باہر آتے دیکھا۔ میں دروازے کے بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ جیسے ہی پیچھے ہٹی، میں نے دروازہ کھولا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جانے دو۔'' اس نے حیرت سے مجھے دیکھا اور ایک طرف ہوگئی۔ میں فوراً ہی اندر چلا گیا۔

ڈیوڑھی میں ہلکی روشنی تھی اور وہاں ایک ناگوار بُو پھیلی ہوئی تھی۔ میرے بائیں جانب ایک نوٹس بورڈ آویزاں تھا اور چھت میں ایک سی سی ٹی وی کیمرا نصب تھا۔

ایک پرانے طرز کی لفٹ کے ذریعے میں سولھویں منزل پر پہنچا۔ دروازہ کھلنے پر میں نے اپنے آپ کو ایک راہداری میں پایا جس کے دونوں جانب فلیٹوں کے دروازے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گھروں سے کھانا پکنے کی خوشبو آرہی تھی۔ میں سیدھا چلتا گیا۔ بچوں کے قہقہے سنائی

دے رہے تھے پھر ایک زوردار آواز آئی۔ میں پہلے کونے سے مڑا تو دیکھا کہ ایک بچہ کھلونا ٹرک سے کھیل رہا ہے...... پھر ایک فلیٹ سے عورت باہر آئی جو غالباً اس بچے کی ماں تھی۔ اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا جو میں نہ سمجھ سکا۔ اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور بچے کو لے کر فلیٹ میں چلی گئی۔

ایک اور دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک سفید فام مرد برآمد ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ مجھے اس کے عقب میں مشہور فٹ بالر مورگن کلنس مین کا پوسٹر نظر آیا۔

"تم سوسائٹی کی طرف سے آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، میں آگ لگنے کی صورت میں باہر نکلنے کا راستہ دیکھنے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کس طرف ہے؟"

اس نے راہداری کے آخری سرے کی جانب اشارہ کیا۔

"زبردست۔" میں نے کہا۔ "بہت اچھا پوسٹر ہے۔"

"تم سوسائٹی سے نہیں آئے۔" وہ میرے عقب میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

میں راہداری میں چلتا گیا۔ بالآخر مجھے وہ سیڑھیاں نظر آگئیں جو چھت میں کھلنے والے دروازے کی طرف جا رہی تھیں۔ ان کے اوپر بھی ایک کیمرا لگا ہوا تھا۔ وہاں کوئی لائٹ یا روشن دان نہیں تھا اور وہ جگہ بالکل تاریک تھی۔ میں نے اپنے آئی فون کی ٹارچ روشن کی اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس میں ایک لیور لگا ہوا تھا۔ اس طرح کے دروازے کو اوپر اٹھانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے زور لگانا پڑتا ہے اور یہ کسی کمزور آدمی کے بس کی بات نہیں۔

میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت لگا کر اسے اوپر اٹھایا۔ اس میں چرچراہٹ ہوئی۔ میں نے اپنا جسم اوپر اٹھایا اور چھت پر آ گیا۔ وہ ایک چپٹی اور ہموار چھت تھی اور اس کا سائز ایک چھوٹے فٹ بال گراؤنڈ کے برابر تھا۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ میں کچھ دیر چھت پر ٹہلتا رہا پھر چھجے کی طرف گیا اور نیچے جھانک کر دیکھا۔ خوف کی ایک لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ یہاں سے چھلانگ لگانا کتنا تباہ کن ہوگا۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں اپنے آپ کو تنہا اور تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

عمارت سے باہر آنے کے بعد میں نے ریڈکلف کو فون کیا۔ "شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

"شکریہ۔" اس نے کہا۔

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں کچھ معلوم کر سکوں گا۔ اس واقعے کو تین ہفتے ہو چکے ہیں...... اگر کوئی ثبوت تھا تو وہ بھی ضائع ہو گیا ہوگا۔" میں نے مبہم بات کی۔

"میں سمجھ سکتا ہوں۔"

میں نے لمحہ بھر توقف کیا پھر بولا۔ "مجھے کچھ معلومات درکار ہیں۔ تمہاری کس آفیسر سے بات ہوئی تھی؟"

اس نے مجھے جو نام بتایا، میں اسے جانتا تھا۔ ٹام اسپنکس۔ پہلے وہ پولیس میں تھا اور اب سی آئی ڈی میں کام کر رہا تھا۔

"وہ بہت ہی نامعقول شخص ہے۔" ریڈکلف نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب مجھے کسی ایسے شخص کے بارے میں تفصیلات چاہئیں جو اس کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ مثلاً اس کا ڈاکٹر۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دو کہ اس سے کچھ سوال کر سکوں۔"

اس نے مجھے ڈاکٹر ورگاسی کا نام بتایا جو سینٹ این اسپتال میں ماہر نفسیات تھا۔ ریڈکلف نے کہا کہ وہ اس کی رضامندی معلوم کر کے مجھے دوپہر تک فون کر دے گا۔

"کیا وہ وائٹ ہارٹ لین کے علاوہ کسی اور جگہ بھی جاتی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"زیادہ تر وہ باہر ہی سوتی تھی پھر بھی میں نے اسے ایک فلیٹ لے کر دیا جو وڈگرین میں واقع ہے۔"

میں نے وہ تمام تفصیلات نوٹ کر لیں۔ "اس کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟"

"میں اس کے مالی معاملات دیکھتا تھا۔ اسے روزانہ اخراجات کے لیے رقم ملتی تھی۔"

"یعنی اس کے پاس گھر بھی تھا اور گزراوقات کے لیے رقم بھی ملتی تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔"

میں خاموش رہا۔ "کیا تم نہیں سمجھتے کہ کسی نے فلورنس کو قتل کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔"

"میں چاہوں گا کہ تم اس معاملے کو دیکھو۔"

"ہم بعد میں بات کریں گے۔" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

☆☆☆

میں آخری بار ٹام اسپنکس سے پولیس کی ملازمت کے دوران میں ملا تھا۔ ان دنوں ہم دونوں کی تعیناتی وڈگرین پولیس اسٹیشن پر تھی۔ اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے

ہوئے کہا۔ ”تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی۔“

”مجھ سے ملنے کا شکریہ ٹام۔“

یہ کھانے کا وقفہ تھا اور ہماری ملاقات ایڈ منڈ ون بائی اسٹریٹ پر واقع ایک کیفے میں ہوئی تھی۔ وہ سادہ کپڑوں میں تھا۔ چند رسمی جملوں کے بعد میں نے مطلب کی بات چھیڑی۔ ”میں فلورنس ایڈلین کی موت کی تحقیقات کر رہا ہوں۔ سُنا ہے کہ تم نے ہی اس کیس کی تفتیش کی تھی؟“

اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”دوبارہ کہو۔“

”مسز وائٹ ہارٹ۔“

”وہ پاگل پاگل عورت جس نے چھت پر سے چھلانگ لگائی تھی۔ اوہ میرے خدا کتنا بھیانک منظر تھا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ سولھویں منزل سے گرنے کے بعد اس کا کیا حال ہوا ہوگا۔“

”میں نے سنا ہے کہ اس کا بھائی نہیں سمجھتا کہ اس نے چھلانگ لگائی ہے۔“

”کیا یہ درست ہے؟“

”ہاں، اس کا کہنا کہ اس نے تم سے بھی یہ بات کہی تھی۔“

”دیکھو یہ ایک واضح کیس ہے۔ اس پاگل عورت نے چھلانگ لگائی۔ میں نے اس کے ڈاکٹر سے بھی بات کی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ ہمارے پاس اس طرح کے کتنے کیس آتے تھے؟“

”مجھے یاد ہے ٹام۔“ میں نے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ میں اس عمارت میں گیا تھا۔ وہاں چھت پر جانے کا ایک ہی راستہ ہے۔ مجھے اس کا دروازہ اوپر اٹھانے کے لیے بہت زیادہ زور لگانا پڑا۔“

”پھر؟“

”میں حیران ہوں کہ ایک کمزور عورت کس طرح وہ دروازہ کھول سکتی ہے؟“

”اس کے علاوہ کیا کہو گے؟“ ٹام نے پوچھا۔

”تم سی سی ٹی وی کیمرا چیک کرو۔“ میں نے کہا۔ ”اس عمارت کی ڈیوڑھی اور چھت کے دروازے پر ایسے کیمرے لگے ہوئے ہیں۔“

”وہ صرف دکھانے کے لیے لگائے گئے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”انتظامیہ اصلی کیمرے لگانے کے قابل نہیں ہے۔“

”ٹریمپ بریشرز کے بارے میں کیا کہو گے؟“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مسز وائٹ ہارٹ کی موت سے ان کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے؟“

”نہیں، وہ لڑکے صرف غیر ملکی مردوں کو مارتے ہیں۔ بوڑھے سودائی لوگوں کو نہیں۔ ویسے بھی اب تک انہوں نے جتنے لوگوں کی پٹائی کی ہے، ان میں سے صرف ایک کوما، میں گیا ہے۔ وہ لوگوں کو مارتے پیٹتے ہوئے کسی عمارت میں لے کر نہیں جاتے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہی مر گئی ہو؟“ میں نے کہا۔ ”انہوں نے اسے حادثاتی طور پر مار دیا ہو اور پھر گھبراہٹ میں اسے عمارت میں لے گئے اور اسے چھت پر سے دھکا دے دیا تا کہ یہ خودکشی معلوم ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟ لگتا ہے کہ اس کے بھائی نے تمہیں خاصا معقول معاوضہ دیا ہے؟“

”میں صرف امکانات دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کچھ خفگی سے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کھانے میں مصروف ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ”اس کے علاوہ تم مسز وائٹ ہارٹ کے بارے میں کوئی اور بات بتا سکتے ہو؟“

”دیکھو دوست۔ میرے پاس تمہیں بتانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اس واقعے کی کوئی تحقیقات نہیں ہوئی۔ تم ایک مردہ گھوڑے پر سواری کر رہے ہو۔“

”شاید......“

”اگر تمہیں کوئی کام کی بات معلوم ہو تو مجھے فون کرنا۔ میں اس معاملے کو ضرور دیکھوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

☆☆☆

اگلے دن میں سینٹ این اسپتال پہنچ گیا۔ ایک بھاری بھر کم سفید بالوں والی استقبالہ کلرک نے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر آندرے درگاسی اس وقت او پی ڈی میں ہے جو ایک گھنٹے بعد ختم ہو گی۔ اس نے مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا۔ اس وقت انتظارگاہ میں صرف ایک مریض بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر نے مجھے بلوایا۔

”میں تمہیں صرف پانچ منٹ دے سکتا ہوں۔“ اس نے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

”میرا نام کوپر ہے۔“ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ہاں، میں جانتا ہوں۔“

”ریڈکلف نے مجھے اجازت دی ہے کہ تم سے اس کی بہن فلورنس کے بارے میں بات کروں۔“

”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے بات کرنے

کا پابند ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ کسی پرائیویٹ سراغ رساں کو معلومات فراہم کرتے ہوئے مجھے تکلیف ہوتی ہے۔"
"ٹھیک ہے۔ میں تم سے چند سوالات پوچھوں گا۔ اگر تم جواب نہ دینا چاہو تو کوئی بات نہیں، میں چلا جاؤں گا۔"
اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"پہلا سوال۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس نے خودکشی کی ہے؟"
"بالکل، وہ ایک غیر متوازن شخصیت کی مالک تھی۔ اس نے گزشتہ دو اپائنٹمنٹ ضائع کر دیے اور جب میں اس سے ملا تو وہ بدحواس اور چڑچڑی نظر آئی۔"
"کیا اس نے تمہیں اپنے چڑچڑے پن کی وجہ بتائی تھی؟"
"اس کی کوئی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ خلل دماغی کی کیفیت میں ایسا ہوتا ہے۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ لوگ اسے مارنا چاہتے ہیں۔ حال ہی میں بے گھر لوگوں کو مارنے کے جو واقعات ہوئے ہیں، ان سے بھی اس کا ذہنی انتشار بڑھ گیا تھا۔ تم نے بھی ان کے بارے میں سنا ہوگا۔"
"ہاں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے دماغ میں یہ وسوسہ کیسے آیا کہ وہ اسے مار دیں گے۔ کیا اس پر حملہ ہوا تھا؟"
"مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں لیکن وہ ہر ایک کو شک کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ بدقسمتی سے اس نے میرے بارے میں بھی ایسا سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ میں وہ اسے دواؤں کے ساتھ زہر دے رہا ہوں۔"
"کیا وہ تمہیں ناپسند کرتی تھی؟"
"بہت زیادہ۔"
"کیا اس نے تمہاری دوائیں لینا بند کر دی تھیں؟"
"ہاں...... جب میں نے یہ ذکر چھیڑا تو وہ مجھ سے بحث کرنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اسے اسپتال میں داخل کرنا ہی پڑے گا پھر اس کی موت کی خبر آ گئی۔" ڈاکٹر نے تفصیل سے بتایا۔
"کیا تم نے پولیس کو بتایا کہ وہ ان لڑکوں کی وجہ سے پریشان تھی؟"
"بالکل، میں نے بتایا تھا۔"
"کیا تمہیں یاد ہے کہ کس آفیسر سے تمہاری بات ہوئی تھی؟"
"وہ گول منہ اور بڑی جسامت والا شخص تھا۔"
"اسپنکس؟"

"ہاں وہی۔ میں نے اسے سب باتیں بتائیں اور کہا کہ اگر فلورنس کی موت کی عدالتی تحقیقات ہوئیں تب بھی یہ ہی بتاؤں گا۔ خودکشی ایک دردناک واقعہ ہے لیکن یہ کوئی انہونی بات نہیں۔ لوگ آئے دن خودکشی کرتے رہتے ہیں۔"

☆☆☆

میں نے اس رات ٹام اسپنکس کو فون کیا۔ وہ شاید پب میں تھا۔ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "کیا مسئلہ ہے کوپر۔ ہم آج دوسری بار بات کر رہے ہیں؟"
"میری بات سنو ٹام۔ میں فلورنس کے بارے میں مزید کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"
"تم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے۔"
"میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔"
"کہو۔" اس نے چڑچڑے پن سے کہا۔
"مجھے بے گھر لوگوں پر ہونے والے تشدد کے بارے میں بتاؤ۔"
"ہم اس موضوع پر پہلے ہی بات کر چکے ہیں۔ ان لڑکوں کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"
"کیا تمہیں یقین ہے ٹام؟ میں آج اس کے ڈاکٹر سے ملنے گیا تھا۔"
"اچھا پھر؟"
"اس نے بتایا کہ مسز وائٹ کو خطرہ تھا کہ وہ ان لڑکوں کا اگلا نشانہ ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ اسے کوئی دھمکی ملی ہو یا اس نے کوئی ایسی بات دیکھی جس سے وہ ڈر گئی ہو۔ کون جانتا ہے؟ اب اس سے تو ہم پوچھ نہیں سکتے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے اس سلسلے میں کوئی انکوائری کی تھی؟"
"ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ فضول باتیں کرتی تھی۔ اس کے خیال میں وہ ذہنی مریضہ ہو چکی تھی۔"
"کیا واقعی؟" میں نے کہا۔ "کیا یہی وجہ ہے کہ تم نے اس معاملے کی چھان بین نہیں کی۔ تمہیں یقین تھا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہوگا کیونکہ وہ ایک پاگل بوڑھی عورت تھی۔" میں نے اپنی جرح جاری رکھی۔
"دفع کرو۔" اس نے کہا۔
"مجھے بتاؤ کہ بے گھر لوگوں کو مارنے والوں کے بارے میں تمہارے پاس کیا معلومات ہیں۔ کسی پر شبہ ہے؟ اس سلسلے میں کیا کارروائی ہو رہی ہے؟"
"نہیں لیکن ہم انہیں بہت جلد پکڑ لیں گے۔"
"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس معاملے کو دیکھ رہا ہوں۔ اگر مجھے اس عورت کی موت اور ان بدمعاشوں کے

درمیان کوئی تعلق نظر آیا تو میں خود ان کا پیچھا کروں گا۔"

☆☆☆

اگلے روز صبح نو بجے میں شیلا اسکاٹ سے ملا جو وڈگرین پروجیکٹ میں ہاؤسنگ آفیسر تھی۔ یہ وہی عمارت ہے جس میں تین ہفتے قبل ریڈ کلف نے اپنی بہن کے لیے فلیٹ لیا تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملی لیکن جب میں نے فلورنس کا اسٹوڈیو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا کہ وہ جگہ اس کی موت کے ایک ہفتے بعد ہی کرائے پر دے دی گئی ہے اور اس کا تھوڑا بہت سامان ریڈ کلف کو دے دیا گیا ہے۔

"ہم فلیٹ کو خالی نہیں رکھ سکتے۔" اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"اگر کرائے پر نہ دیا جائے تو جگہ کی قیمت کم ہو سکتی ہے۔"

"تم اسے کتنا جانتی تھیں؟"

"جتنا تم اس جیسی عورت کو جانتے ہو۔ وہ اپنی دنیا میں رہنے والی دلچسپ عورت تھی اور کسی کو اپنے قریب نہیں آنے دیتی تھی۔ اس کا تعلق دولت مند خاندان سے تھا۔ بھائی اس کا خیال رکھتا تھا۔ اسی نے فلیٹ کا کرایہ دیا۔ فرنیچر خریدا اور ہمیں اس کی گزراوقات کے لیے رقم دی جو ہم اسے دے دیا کرتے تھے۔"

"کیا وہ اپنے فلیٹ میں سوتی تھی؟"

"بہت کم، وہ زیادہ تر سڑکوں پر رہتی تھی اور وائٹ ہارٹ لین اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ اسے کھیلوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب وہ چھوٹی تھی تو اس کے والد اسے کھیلوں کے مقابلے دکھانے کے لیے لے جاتے تھے۔ سب لوگ اسے مسز وائٹ ہارٹ کہہ کر بلاتے تھے اور اسے یہ نام پسند تھا۔"

"دوستوں کے بارے میں کیا کہو گی؟ کیا وہ کسی سے باقاعدہ ملتی تھی؟"

"نہیں، میں نے ایسا کوئی دوست نہیں دیکھا۔ وہ اس ٹائپ کی نہیں تھی کہ کسی کو اپنی جانب متوجہ کر سکے۔"

"کوئی ایسا شخص جس سے وہ خوف زدہ ہو؟ کیا اس نے کبھی ان لڑکوں کے بارے میں کچھ کہا جو بے گھر لوگوں پر حملے کرتے ہیں؟"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے یاد نہیں کہ اس نے اپنے خوف کے بارے میں مجھے کچھ بتایا ہو۔ جیسا کہ میں نے کہا کہ وہ اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ اس نے چھت پر سے چھلانگ لگائی ہو گی؟" میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ممکن ہے۔"

میں نے اس کی جانب دیکھا۔

"میں کوئی ایکسپرٹ نہیں ہوں لیکن جانتی ہوں کہ وہ تنہا تھی۔ اسے کسی کی تلاش تھی۔ شاید اسی لیے وہ تھک گئی تھی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے تم سمجھتی ہو کہ وہ تنہا ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر پھرتی تھی؟"

"لوگ کسی بھی وجہ سے باہر جا سکتے ہیں۔ میں ایسے بوڑھوں کو جانتی ہوں جن کے لیے فلیٹ اور بستر کا انتظام کیا گیا لیکن اس کے باوجود وہ دن رات پارک کی بینچوں پر نظر آتے ہیں۔ تم میرا مطلب سمجھ گئے ہو گے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں بلڈنگ کا ایک چکر لگالوں؟"

میں نے فلورنس کے کچھ پڑوسیوں سے بات کی لیکن وہ مجھے کوئی نئی بات نہ بتا سکے انہوں نے اس کی تعریف کی۔ انہیں اس کی موت کا صدمہ تھا لیکن اس پر حیرانی نہیں ہوئی تھی۔

گھر آکر میں نے اپنی مکان مالکن اور سابق ماہرِ نفسیات ڈاکٹر کلارا کے ساتھ کھانا کھایا۔ میں ان دنوں اس کے زیرِ علاج تھا جب میری بیٹی کا انتقال ہوا تھا۔ اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے مجھے اپنے مکان کا بالائی کمرا برائے نام کرایہ پر دے دیا۔ وہیں سے ہماری دوستی پروان چڑھی۔

"پھر تم کیا کرو گے؟" اس نے اب تک کی پیش رفت سننے کے بعد کہا۔

"ان لوگوں کو ڈھونڈنا ہے جن پر مجھے شبہ ہے۔"

"ٹریپ بریشرز؟"

"ہاں۔"

"کیا یہ پولیس کا کام نہیں ہے؟"

"مجھے نہیں لگتا کہ یہ ان کی ترجیحات میں شامل ہے۔"

"لیکن یہ تمہاری پہلی ترجیح ہے؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ اس نے چھت پر سے چھلانگ لگائی ہو گی۔"

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم نے ان لڑکوں کو پکڑنے کے لیے کیا منصوبہ بنایا ہے؟"

مجھے کچن میں وہسکی کی بوتل نظر آئی۔ میں اٹھ کر گیا اور اس کے ساتھ دو گلاس لے کر آیا پھر میں نے ڈاکٹر کو اپنی پلاننگ بتانا شروع کر دی۔

☆☆☆

مجھے اپنے کام کے سلسلے میں بعض اوقات بھیس بدلنا ہوتا تھا۔ ایک بار پھر اس کی ضرورت پیش آ گئی تھی۔ اگلے تین روز تک میں اپنے آپ کو ایک سڑک چھاپ شرابی کے سانچے میں ڈھالتا رہا۔ میں نے شیو کرنا اور نہانا چھوڑ دیا۔ اس روز میں نے دوپہر میں بیئر اور شام چھ بجے سے وہسکی پینا شروع کر دی۔ رات دس بجے کے قریب میں نے ایک اونی کمبل، دستانے اور گول ٹوپی پہنی اور سخت سردی میں باہر نکل گیا۔

میں نے پہلی رات وائٹ ہارٹ لین پر فلورنس کے پلاٹ سے چند گز کے فاصلے پر گزاری۔ میں اس کے علاوہ کہیں اور جانے کے بارے میں نہیں سوچ سکا اس لیے وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ دس منٹ میں ہی میری کمر تختہ ہو گئی۔ میں نے کمبل گھٹنوں پر پھیلا لیا اور بوتل سے وہسکی کے گھونٹ لینے لگا۔

اسٹریٹ لائٹ کی روشنی بہت کم تھی۔ میرے دائیں جانب پرانا فٹ بال اسٹیڈیم تھا جبکہ بائیں جانب ایک جنرل اسٹور، فون کارڈ شاپ، بیوٹی کلینک اور کھلونوں کے سامان کی دکان تھی۔ ہر دس منٹ بعد کوئی نہ کوئی وہاں سے گزرتا لیکن میں کسی کو نہیں پہچانتا تھا اور نہ ہی کسی نے مجھ پر توجہ دی۔

میں وہاں اس وقت تک رکا رہا جب تک میری وہسکی ختم نہیں ہو گئی اور صبح کی پہلی کرن سیاہ آسمان پر نمودار نہ ہو گئی جب میں کھڑا ہوا تو لگا کہ میری عمر میں بیس سال کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میری کمر بُری طرح اکڑ گئی تھی اور میرے پاؤں سوج گئے تھے۔

اگلی چار راتیں بھی اسی طرح گزر گئیں لیکن وہ لڑکے نظر نہ آئے جن کی تلاش کے لیے میں نے یہ سوانگ بھرا تھا تاہم پانچویں رات مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو گئی۔ اس رات میں وڈ گرین کے علاقے میں پرانے سوک سینٹر کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ رات ایک بجے کے قریب مجھے پیشاب کی حاجت ہوئی۔ اس وقت میکڈونلڈ کھلا ہوا تھا لیکن میں وہاں جانے کے بجائے ایک ستون کے پیچھے چلا گیا۔ ابھی میں فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ وہاں آ گئے۔

ایک نے پیچھے سے آ کر میرے گھٹنے کے عقبی حصے پر لات ماری جبکہ دوسرے نے میری پسلیوں پر کندھا مارا۔ میرا توازن بگڑ گیا اور دیوار سے جا ٹکرایا پھر میں کمر کے بل گر گیا۔

انہوں نے مارنا شروع کر دیا۔ وہ مجھے دونوں طرف سے ٹھوکریں مار رہے تھے۔ دو مرتبہ میری کنپٹی پر ضرب لگی اور مجھے لگا کہ بے ہوش ہو جاؤں گا۔

''نکمے انسان۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''یہاں سے چلے جاؤ۔''

مجھے کافی ٹھوکریں لگ چکی تھیں۔ میرے منہ سے خون نکلنے لگا۔ وہ مجھے مسلسل گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے ایک قلابازی کھائی اور ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ ان کی عمریں پندرہ سولہ سال کے درمیان تھیں۔ میں غراتے ہوئے اس کی جانب بڑھا جو مجھے گھور رہا تھا۔ وہ ایک طرف ہٹا لیکن میں نے آگے بڑھ کر اس کی ناک پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ پھر میں نے دوسرے کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔

وہ دونوں زمین پر پڑے چلّا رہے تھے اور ان کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے پہلے لڑکے کو کالر سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ یوں چلایا جیسے میں نے اس کا ہاتھ مروڑ دیا ہو۔ میں نے اسے ایک تھپڑ مارا اور خاموش رہنے کے لیے کہا۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم...... ہم سب سے پہلے برطانوی ہیں۔'' وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''

''چلے جاؤ۔'' اس نے کہا۔

میں نے اسے ایک اور تھپڑ مارا، اس نے دوبارہ رونا شروع کر دیا۔

''سنو۔'' میں نے کہا۔ ''میں تم سے ایک سوال پوچھ رہا ہوں۔ اگر تم نے جھوٹ بولا تو میں تمہارا بہت بُرا حشر کروں گا۔ سمجھ گئے؟''

دونوں نے بیک وقت اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کہا۔ ''ایک بوڑھی عورت وائٹ ہارٹ لین میں گھومتی رہتی تھی۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟''

انہوں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ ''وہ تین ہفتے قبل ایک عمارت کی چھت سے گر گئی۔ کیا تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق ہے؟''

دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے انہیں باری باری غور سے دیکھا۔ وہ یا تو بہت بڑے جھوٹے تھے یا پھر یہ سچ تھا۔

''تم اگر کچھ جانتے ہو تو بتا دو۔''

ایک بار پھر ان کا جواب نفی میں تھا۔ شاید وہ سچ بول

رہے تھے۔ میں نے ان سے مزید چند سوالات کیے لیکن کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ بالآخر میں نے پہلے لڑکے کا کالر چھوڑ دیا۔ وہ زمین پر گرا اور اپنے ساتھی کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ وہ خوف زدہ بچوں کی طرح چمٹ گئے۔

میں نے ان کی طرف دیکھا اور سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کے ساتھ کیا کیا جائے۔ بالآخر میں نے کہا۔ ''اپنا والٹ اور فون مجھے دے دو۔''

انہوں نے بلاچون چرا دونوں چیزیں میرے حوالے کر دیں۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کر رہا۔ وہ تمہیں بچوں کی جیل میں بھیج دیں گے جہاں سے تم پکے بدمعاش بن کر نکلو گے لیکن میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو۔'' میں نے ان کے والٹ کھول کر بینک کارڈ میں ان کا نام دیکھا۔ ''اگر تم نے آئندہ کسی بے گھر کو مارا تو میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، سمجھ گئے؟''

انہوں نے ایک بار پھر سر ہلا دیا۔ ''ٹھیک ہے۔ دفع ہو جاؤ۔'' میں نے کہا۔

وہ آوارہ کتوں کی طرح دوڑتے ہوئے رات کی تاریکی میں غائب ہو گئے۔ میں سوچنے لگا کہ انہیں چھوڑ کر کوئی حماقت تو نہیں کی۔

آئندہ چند روز تک میں گھر میں اپنی تھکن اتارتا اور زخموں کا علاج کرتا رہا پھر ایک دن ریڈ کلف نے مجھے فون کیا۔ ''کوئی تازہ ترین خبر؟''

''فی الحال کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ اس کے بعد میں نے اسے ان لڑکوں سے جھگڑے کے بارے میں بتایا۔ میری آواز میں لرزش محسوس کر کے وہ چونک گیا۔

''اوہ میرے خدا۔'' اس نے کہا۔ ''کیا تم تکلیف میں ہو؟''

''ہاں، میرے کام میں اس طرح کی مار پیٹ ہوتی رہتی ہے۔ بہرحال تمہارے پوچھنے کا شکریہ۔''

''فلورنس کی موت کی تحقیقات پندرہ روز میں ہونے والی ہے۔ اگر تم مصروف نہیں ہو تو میرے ساتھ ڈرنک کرو۔''

میں تین دن سے گھر سے باہر نہیں گیا تھا اور میری وسکی بھی ختم ہو رہی تھی۔

''بالکل۔'' میں نے کہا۔ ''اسی جگہ جہاں ہم پہلے ملے تھے۔''

''تم میرے فلیٹ پر کیوں نہیں آجاتے۔'' اس نے کہا۔ ''میں گاڑی بھیج دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا اور اسے اپنا پتا سمجھا دیا۔

ریڈ کلف ایک لگژری اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ وہ مجھے ڈائننگ ہال میں لے گیا اور بولا۔ ''میں تمہیں کیا پیش کروں؟''

''تمہارے پاس کیا ہے؟''

''Cognac۔''

''ٹھیک ہے۔ دو گلاس بناؤ۔''

میں نے کئی مرتبہ عمدہ قسم کی برانڈی پی تھی لیکن یہ ان سب سے بہترین تھی۔

''تم اپنی گزر اوقات کے لیے کیا کرتے ہو؟'' میں نے ایک آرام دہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے ورثہ میں خاندانی کاروبار ملا ہے۔ ڈیڈی کے مرنے کے بعد میں ہی ان کا وارث تھا۔''

''کیا اس وقت فلورنس نفسیاتی مریض ہو چکی تھی؟''

''تم یہ کہہ سکتے ہو۔''

''پھر تو تمہیں اس کا خیال رکھنا چاہیے تھا؟''

''ہاں، میں دولت مند ہوں۔ تم یہ پہلے سے جانتے ہو لیکن میں اپنی تمام دولت اس پر خرچ کر دیتا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہ کیسے ٹھیک ہو سکتی ہے۔'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بہرحال مجھے تمہارے زخمی ہونے پر افسوس ہے۔''

''میں تمہاری پریشانی کی قدر کرتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''بہرحال میں ابھی تک فلورنس کی موت کے حوالے سے کوئی نئی بات معلوم نہیں کر سکا اور پولیس کے کہنے کے مطابق یہ خودکشی ہی ہے۔''

''کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ اس نے خودکشی کی تھی؟''

''میں نہیں جانتا کہ کیا سوچ رہا ہوں۔ میں تم سے متفق ہوں کہ اس کے علاوہ کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے لیکن ابھی تک مجھے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ البتہ ایک سوال مجھے پریشان کر رہا ہے کہ وہ پیراڈائز ٹاور کیوں گئی اور چھت پر کیسے پہنچی؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ وہ وائٹ ہارٹ لین میں کیوں گھومتی پھرتی تھی؟ اس جگہ میں ایسی کیا خاص بات تھی؟''

''وہ ٹوٹینم ہاٹ سپر فٹ بال کلب، کو پسند کرتی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد فٹ بال نے ہمیں ڈیڈی سے جوڑے رکھا۔ وہ ہمیں میچ دکھانے لے جاتے تھے۔''

اس نے کارنس پر سے ایک فریم شدہ تصویر اٹھا کر مجھے دکھائی۔ اس میں وہ اپنے باپ اور بہن کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ یہ اس کی جوانی کی تصویر تھی۔ فلورنس کے چہرے سے نوعمری جھلک رہی تھی۔ یہ اس عورت سے کافی مختلف تھی جسے میں نے دیکھا تھا۔ اس کے باپ نے دونوں بچوں کے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی موٹی انگلیوں کو غور سے دیکھا جن سے اس نے انہیں پکڑ رکھا تھا اور میری سمجھ میں بہت کچھ آ گیا۔

''اس نے تم دونوں کے ساتھ بُرا سلوک کیا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

ریڈ کلف نے وہسکی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''ان دنوں ہمیں اتنا محسوس نہیں ہوا۔ ہم اپنے باپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ممی کے مرنے کے بعد وہ تنہا ہو گیا تھا۔ اس لیے ہم اس کا خیال رکھ رہے تھے لیکن جب ہم اس کی توقعات پوری کرنے میں ناکام ہو گئے تو محسوس ہوا کہ وہ ہم سے مایوس ہو گیا ہے۔ میں تو کسی نہ کسی طرح اسے مطمئن کرتا رہا لیکن فلورنس سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اور وہ راستے سے بھٹک گئی۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو ڈیڈی کا خلا پُر کر سکے گو کہ وہ اب بھی ان سے محبت کرتی تھی۔ اس نے مجھے ان خوشگوار دنوں کے بارے میں بتایا جب ڈیڈی ہمیں فٹ بال میچ دکھانے لے جاتے تھے۔ وہ تنہا تھی...... بہت تنہا لیکن ہم ایک دوسرے کو تسلی نہ دے سکے۔ کیا یہ مضحکہ خیز نہیں ہے؟''

اس نے وہسکی کا گلاس اٹھایا اور بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مقروض ہوں اسی لیے جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا؟''

میں نے اپنا گلاس کافی کی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ فلورنس کے ساتھ بہت سے مسائل تھے۔ تمہیں اس کی موت کے بارے میں اتنا زیادہ نہیں سوچنا چاہیے۔''

''میں تمہاری بات سمجھ گیا۔'' وہ بولا۔ ''میں تم سے مزید تحقیقات کے لیے نہیں کہہ رہا لیکن میں دروازہ کھلا رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی بات معلوم ہو تو اسے دیکھو ورنہ کوئی بات نہیں۔ میں پھر بھی تمہیں پورا معاوضہ دوں گا اور میں اپنے کام میں لگ جاؤں گا۔ اگر تمہیں کچھ معلوم ہوتا ہے تو اس معاملے کو دیکھنا۔ مجھے تم پر بھروسا ہے۔ بس ایک مختصر پیغام بھیج دینا 'ڈن' کیا تم یہ کر سکتے ہو؟''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

اس نے مجھے گاڑی میں گھر چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن میں نے پیدل جانے کو ترجیح دی۔ میں تازہ ہوا میں سانس لینا چاہ رہا تھا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد میرے دماغ نے کام کرنا شروع کر دیا۔ سوچ کی کڑیاں ملتی جا رہی تھیں پھر اچانک ہی میں رک گیا۔ مجھے مسز وائٹ ہارٹ کے بارے میں سوالوں کا جواب مل گیا تھا اور میں ٹکڑے جوڑ کر جو تصویر بنا رہا تھا، وہ مکمل ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو لیکن اچانک ہی میں جان گیا تھا کہ فلورنس کی موت کیسے واقع ہوئی اور یہ بھی کہ اسے کس نے قتل کیا۔

میں ایک بار پھر پیراڈائز ٹاور گیا اور لفٹ کے ذریعے سولھویں منزل پر پہنچا۔ لفٹ سے باہر آتے ہی ناگوار ہوا کا جھونکا آیا جو پہلے بھی میں محسوس کر چکا تھا لیکن میں بھول گیا کہ اس کا فلیٹ کون سا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ کوئی آواز پیدا کروں یا سیٹی بجاؤں۔ جب اس سے کام نہ بنا تو میں نے چند دروازوں پر دستک دی۔ پہلے فلیٹ سے ایک بنگالی باہر آیا۔ دوسرا، اور تیسرا خالی تھا جبکہ چوتھے فلیٹ سے ایک حاملہ عورت برآمد ہوئی۔ اس نے مجھے گھورا اور بولی کہ دروازے پر دستک کیوں دی۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنی جان چھڑائی۔

پانچواں دروازہ اس کا تھا جس سے ملنے کے لیے میں اس عمارت میں آیا تھا۔

''تم سوسائٹی سے آئے ہو؟'' اس نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت اس نے سپرز کلب کی شرٹ اور گرے پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے عقب میں دیوار پر مشہور فٹ بالر کا پوسٹر لگا ہوا تھا۔

''میں تم سے فلورنس ایڈلین کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کون؟'' اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''فلورنس۔'' میں نے دہرایا۔ ''مسز وائٹ ہارٹ۔''

''کیا تم پولیس والے ہو؟'' اس نے اونچی آواز میں کہا۔

''نہیں۔''

میں اس سے دو فٹ کے فاصلے پر تھا جب اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی۔ میں نے جلدی سے اپنا پاؤں اندر ڈال دیا اور کندھے سے اس کے سر پر ضرب لگائی۔ اس نے ایک چیخ ماری اور پیچھے کی جانب فرش پر گر گیا۔

میں فلیٹ کے اندر داخل ہوا۔ وہ فرش پر آلتی پالتی

مارے بیٹھا ہوا تھا اور دونوں بازو رانوں پر تھے۔ اس کی تیوری چڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی۔

''میں پولیس کو بلاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے اس کی دھمکی کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''دفع ہو جاؤ۔''

میں نے جھک کر اس کی آستین کا کف پکڑ کر اسے اوپر اٹھایا اور اسے دیوار کی طرف دبایا۔ اس نے ہلکی سی چیخ ماری جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ میرے قدموں میں گر گیا۔

''تمہارا نام؟'' میں نے غضب ناک لہجے میں پوچھا۔

''مارٹن۔''

''پورا نام بتاؤ۔''

''مارٹن ریوز۔''

''ٹھیک ہے مارٹن۔ ہم بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ تم مجھے فلورنس کے بارے میں سب کچھ بتا دو۔ اس کے بعد سوچوں گا کہ تمہارے ساتھ کیا کرنا ہے۔''

ہم ایک چھوٹی سی میز پر بیٹھ گئے۔ وہاں صرف دو ہی کرسیاں تھیں۔ پورا کمرا کتابوں، رسالوں، کتابچوں اور اخبارات سے بھرا ہوا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ پھٹا ہوا چمڑے کا صوفہ رکھا تھا جسے بستر کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کمرے میں ایک فریج اور کوکر کے سوا کوئی سامان نہیں تھا اور تمام دیواروں پر فٹ بال کے کھلاڑیوں کی تصاویر چسپاں تھیں۔

میں نے مارٹن کو دیکھا۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا، اس کی کوئی اہمیت ہے؟''

''ہاں۔''

''کچھ باتیں یونہی میرے ذہن میں آجاتی ہیں۔ فلورنس نے چھلانگ لگانے کے لیے اس عمارت کا انتخاب کیوں کیا۔ میں نے سوچا کہ شاید وہ یہاں کسی کو جانتی ہو پھر مجھے یاد آیا کہ میں نے تمہارے کمرے میں گلنس مین کا پوسٹر دیکھا تھا۔ وہ بھی Spurs کی پرستار تھی پھر مجھے تمہاری چھوٹی گول آنکھیں یاد آئیں اور میں سمجھ گیا کہ تم نے ہی اسے قتل کیا ہے۔ یہ مجھے اسی وقت جان لینا چاہیے تھا جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ اب میں سننا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟''

اس نے آہستہ سے سر ہلایا پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ اس کی کہانی واقعی درد انگیز تھی۔ اس کا کوئی خاندان تھا نہ دوست اور نہ کوئی ملازمت بس اس کے ذہن پر Spurs کلب کے کھلاڑی چھائے ہوئے تھے۔

اس نے بتایا کہ چند ماہ قبل اس نے فلورنس سے بات چیت شروع کی تھی۔ جب وہ اپنے گھر جا رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ایک اجنبی عورت اس کے قریب آئی۔ اس نے اپنا نام مسز وائٹ ہارٹ بتایا اور کہا کہ اس کے گلے میں سپرز کا اسکارف اسے پسند آ گیا ہے جبکہ خود اس نے بھی سپرز کا ہڈ پہنا ہوا تھا۔ اس طرح دونوں میں ایک تعلق بن گیا۔ وہ اس کے فلیٹ پر آ کر فٹ بال کی باتیں کرتی پھر مارٹن اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔

''اس کا کہنا تھا کہ میں مہربان اور ہینڈسم ہوں۔ اس سے پہلے کسی نے مجھ سے ایسی بات نہیں کہی تھی۔ ماں کے مرنے کے بعد میں بالکل تنہا ہو گیا تھا لیکن فلورنس میری دوست بن گئی گو کہ وہ عمر میں مجھ سے بڑی اور خبطی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''اس کا رویہ خراب ہو گیا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس کا کہنا تھا کہ میں نے اسے خوف زدہ کر دیا ہے۔ میں صرف اس سے بغل گیر ہونا چاہ رہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، آئندہ نہیں کہوں گا۔ ہم صرف باتیں کریں گے لیکن اس کا رویہ ایک بار پھر خراب ہو گیا۔''

یہ کہہ کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ''میں تنہا ہوں بالکل تنہا۔ میری ساری زندگی اسی فلیٹ میں گزر گئی۔ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کہ مجھ جیسے آدمی کا خیال رکھنا چاہیے۔ میں نے سوچا کہ فلورنس اس جانب توجہ دے گی لیکن وہ بھی دوسروں کی طرح نکلی۔''

اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دواؤں کے استعمال سے اس میں یہ تبدیلی آئی تھی۔ یہ دوائیں عورتوں کو سرد مہر بنا دیتی ہیں۔''

میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟''

''وہ ایک حادثہ تھا۔''

''پھر بھی میں سننا چاہتا ہوں۔''

''وہ نشے میں تھی جس نے اسے جوشیلا بنا دیا۔ اس کا

لہنا تھا کہ اس کے ڈیڈی کبھی مجھے قبول نہ کرتے۔ بہرحال میں نے اس سے رکنے کے لیے کہا تا کہ ہم اس کا کوئی حل نکال سکیں۔ سردی بہت تھی۔ میں اس سے بغل گیر ہونا چاہ رہا تھا لیکن اس نے انکار کر دیا۔ میں نے اسے رکنے پر مجبور کیا اور دروازہ بند کر دیا تا کہ وہ باہر نہ جا سکے پھر میں نے اسے مارا۔ اس نے چلانا شروع کر دیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس پر کتنی بار حملہ کیا۔ میں صرف اسے خاموش کرنا چاہ رہا تھا۔ جب میں نے مارنا بند کیا تو وہ خون میں لت پت ہو چکی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ میں نے اسے ہلایا۔ منہ کے ذریعے اس کا تنفس بحال کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔“

اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ ”میں نے اسے وہاں سے نیچے پھینک دیا۔“ اس نے کہا۔ ”اس کا وزن زیادہ نہیں تھا پھر میں نے چھت پر جانے والا دروازہ کھول دیا تا کہ یہی سمجھا جائے کہ اس نے وہاں سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی ہے۔ وہ پاگل تھی اور پاگل ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔

”اس کے بعد میں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ لوگوں کے چلانے کی آوازیں آئیں۔ ایمبولینس اور پولیس بھی آئی لیکن کوئی میری طرف نہیں آیا۔“

میری نظریں کھڑکی پر تھیں۔ میں اس کی طرف دیکھنا نہیں چاہ رہا تھا۔ ”اب تم کیا کرو گے؟“ مارٹن نے پوچھا۔

”میں تمہیں اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جاؤں گا اور انسپکٹر ٹام اسپنکس کے حوالے کر دوں گا۔ تم میری موجودگی میں اپنا بیان ریکارڈ کرواؤ گے پھر تمہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔“

”تم پولیس والے نہیں ہو؟“ اس نے کہا۔

”ہاں۔“

”اس لیے تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے؟“

”یہ بھی ٹھیک ہے۔“

اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ ”لہٰذا میں ہر بات سے انکار کر سکتا ہوں۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”نہیں مارٹن۔“ میں نے کہا۔ ”پولیس کی تفتیش میں سب کچھ سامنے آ جائے گا۔ ڈی این اے، انگلیوں کے نشان سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔“

اس نے پلکیں جھپکائیں۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن خاموش رہا۔

”تم کہہ سکتے ہو کہ اسے قتل کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ وہ اس پر یقین کریں گے یا نہیں۔“

”میں جیل جانا نہیں چاہتا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ مجھے ماریں گے۔“

”ممکن ہے کہ وہ تمہیں کسی خاص جگہ پر رکھیں۔“

”کیوں؟“

”کیونکہ تم ایک خبطی شخص ہو۔“

”نہیں۔“

میں نے اسے چولھے کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے وہاں سے فرائی پین اٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اسے کندھے سے اوپر لے گیا۔

”چلے جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”ورنہ میں تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔“

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مارٹن، میرے ساتھ چلو۔“

اس کے ہونٹ کپکپائے اور فرائی پین اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ وہ فرش پر اکڑوں بیٹھ کر رونے لگا۔ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”مارٹن! نیچے ایک پب ہے، میں وہاں ڈرنک کے لیے جا رہا ہوں۔ اس دوران تم فیصلہ کر لو کہ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں۔ میں تم پر تشدد نہیں کروں گا لیکن تمہیں ہر صورت میں فلورنس کے ساتھ کیے گئے سلوک کا جواب دینا ہے۔“

”اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں ہے۔“ اس نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔

میں اسے گھسیٹ کر بھی پولیس اسٹیشن لے جا سکتا تھا لیکن یہ زبردستی ہوتی اور اس میں کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ اسی لیے میں چاہ رہا تھا کہ وہ رضاکارانہ طور پر پولیس کے حوالے کر دے۔

میں عمارت سے باہر آیا اور بمشکل پچاس گز گیا ہوں گا کہ مجھے مارٹن کی چیخ سنائی دی۔ میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد مجھے لوگوں کے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ایمبولینس کو بلانے کے لیے فون کر رہے تھے۔ ”کوئی گر گیا ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ایمبولینس کے سائرن کی آواز آئی تو میں دوبارہ پب کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دور آگے جا کر میں نے فون نکالا اور ریڈکلف کو ایک مختصر پیغام بھیجا۔ ”کام ہو گیا۔“

مارٹن نے جیل جانے کے بجائے خود ہی اپنے لیے سزا تجویز کر لی تھی......

❖❖❖

محبِ زنداں

اعتزاز سلیم وصلی

کچھ لوگ فطرتاً پیاسے پیدا ہوتے ہیں۔ لبِ دریا رہتے ہوئے بھی سیراب نہیں ہوپاتے... بلکہ سرابِ تشنگی میں بھٹکتے ہی رہتے ہیں... اذیت پرور، بدفطرت... ہوس زدہ شخص کا قصہ... نازک... بے بس اور مجبور عورتوں کو آزار میں مبتلا رکھنا اس کا پیشہ تھا...

محبِ زنداں میں تازندگی اسیری اختیار کرنے والوں کا دردانگیز تماشا

کولین اسٹان نے اردگرد نظر دوڑائی۔ ہائی وے سے گزرتی گاڑیاں رکنے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھیں۔ ''آج تو اینا ناراض ضرور ہوگی۔'' اس نے اپنے پرس میں موجود بریسلٹ پر نگاہ دوڑائی۔ یہ بریسلٹ اس نے کل اپنی جمع کی گئی رقم سے خریدا تھا۔

''شاید مہنگا گفٹ دیکھ کر میرا دیر سے آنا نظرانداز کر دے۔'' وہ دوبارہ بڑبڑائی۔ اسے لفٹ مانگنے کا تجربہ تھا۔ اس کام میں وہ اور اس کے دوسرے دوست مہارت رکھتے

تھے۔ وہ جانتی تھی، اسے صبر کرنا ہے۔ کافی دیر گزر گئی۔ اس دوران میں اسے دو ڈرائیور رکنے کے لیے تیار دکھائی دیے مگر وہ دونوں اکیلے اور جوان تھے۔ یوجین، اوریگون سے شمالی کیلیفورنیا کی طرف بغیر اپنی گاڑی کے سفر کرنا مشکل تھا۔ بیس سال کی کولین کو اگر دوست کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کبھی یہ رسک نہ لیتی۔ اسی کی دہائی میں حالات ویسے بھی اتنے اچھے نہیں تھے۔ کولین خوبصورت نقوش کی مالک ایک پُرکشش لڑکی تھی جسے اپنے حُسن کا بخوبی اندازہ تھا۔

''کس طرف جانا ہے؟'' ایک مہنگی گاڑی پاس آکر رکی۔ اس میں موجود تیس بتیس سال کے شخص کے منہ میں سگار دبا ہوا تھا۔

''مخالف سمت۔'' کولین نے جھوٹ بولا۔ اس نے کندھے اچکائے اور ایک واہیات اشارہ کرکے آگے بڑھ گیا۔ کولین جانتی تھی، وہ اسے کوئی آوارہ لڑکی سمجھ رہا تھا۔

پندرہ منٹ مزید گزر گئے۔ ایک ہارن بجاتی گاڑی اس کے قریب آئی۔ اس نے نظر دوڑائی۔ کار میں ایک چھبیس ستائیس سال کی عمر کا شخص بیٹھا دکھائی دیا۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ چڑھائے وہ عام سے نقوش کا مالک شخص تھا جس کے چہرے پر نرم تاثرات تھے۔ فرنٹ سیٹ پر اس کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی جس کی شکل بھی گاڑی کے ڈرائیور کی طرح عام تھی۔ کولین نے ہچکچاتے ہوئے انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ گاڑی پہلے ہی آہستہ کرچکا تھا۔ اس نے کولین کے قریب آکر بریک لگا دیا۔ ان دونوں کی شکل وصورت کا جائزہ لینے کے بعد اس نے لڑکی کی گود میں موجود بچہ دیکھ لیا۔ لفٹ مانگنے والی لڑکیاں اکثر بیس سے تیس سال کی عمر والے ڈرائیور کے ساتھ نہیں بیٹھتی تھیں۔ یہ ان کا اصول تھا مگر آج مجبوری تھی۔ اس کے علاوہ لڑکی اور اس کی گود میں موجود بچہ دیکھ کر اسے تسلی ہوئی۔ اس جوڑے سے اسے کوئی پریشانی نہیں ہوسکتی تھی۔

''کہاں جانا ہے؟'' ڈرائیور نے پوچھا۔

''شمالی کیلیفورنیا۔'' اس نے اپنا مطلوبہ ایڈریس بھی بتایا۔

''بیٹھ جائیں...... ہم بھی وہیں جارہے ہیں۔'' اس نے پچھلی سیٹ کی جانب اشارہ کیا۔ وہ شکریہ کہہ کر بیٹھ گئی۔ سفر شروع ہوگیا۔ ڈرائیور نے اپنا تعارف کروایا۔

''میرا نام کیمرون ہوکر ہے اور یہ میری بیوی جینیس ہوکر......''

''میں کولین اسٹان، اپنی دوست کی سالگرہ پارٹی میں شرکت کے لیے جارہی ہوں۔'' سردی کی وجہ سے اس کے ہاتھ برف بن چکے تھے۔ ہیٹر کی حرارت محسوس کرکے اس نے دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑا اور چہرے سے لگایا۔ کیمرون نے چور نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ نوجوان لڑکی کسی مرد کو بھی پاگل کرسکتی تھی۔ کیمرون کی نسبت جینیس ایک خاموش لڑکی تھی۔ وہ بس اپنے بچے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کولین کو محسوس ہوا جیسے وہ کیمرون سے ڈرتی ہے۔

''کیا کرتی ہیں آپ مس اسٹان؟'' کیمرون شاید گپ شپ کے موڈ میں تھا۔

''اسٹوڈنٹ ہوں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔ نجانے کیوں اس کے دل نے دماغ کے فیصلے کو رد کردیا تھا۔ اس جوڑے سے لفٹ مانگنا غلطی ہے، دل نے ایک بار پھر گواہی دی۔ اس نے سوچوں کو دوسری طرف موڑ لیا۔ اب وہ اپنا کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیمرون کی آواز نے ایک بار پھر خاموشی توڑی۔

''میں لبرل میں کام کرتا ہوں......'' اس نے پوچھے بغیر اپنا کام بتایا۔

''اچھی بات ہے۔'' وہ خشک لہجے میں بولی۔ جینیس پورے سفر میں ایک مرتبہ بھی نہیں بولی تھی۔ اسی دوران راستے میں ایک گیس اسٹیشن کا بورڈ دکھائی دیا۔ کیمرون نے گاڑی موڑی۔ وہ سب وہاں اتر گئے۔ کولین واش روم کی طرف چل دی۔

''یہاں سے بھاگ جاتی ہوں۔'' اس نے سوچا۔ اسے کیمرون کی نظروں سے خوف محسوس ہورہا تھا۔ ''بلاوجہ کے خوف کے دباؤ میں آکر دوبارہ اس شدید سردی میں ہائی وے پر کھڑا ہونا بے وقوفی ہے۔'' مخالف سوچ نے انکار کیا۔

اس نے اپنی پہلی سوچ کو وہم قرار دیا اور فارغ ہوکر واپس گاڑی میں جابیٹھی۔ سفر دوبارہ شروع ہوگیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد کیمرون نے اچانک گاڑی روک لی۔

''کیا ہوا؟'' کولین نے پوچھا۔ اس نے جواب دیے بغیر ڈیش بورڈ کھولا۔ ہاتھ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر کولین کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ پیچھے مڑا۔ اس نے چاقو کولین کی گردن پر رکھ دیا۔

''خبردار...... ہلنامت۔''

''کیمرون۔'' جینیس چیخی۔

''تم خاموش رہو۔'' وہ غرایا۔ ''ڈرائیونگ تم کرو گی۔'' کولین کا جسم کانپ رہا تھا۔ کیمرون ڈرائیونگ سیٹ

سے اتر کر اس کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جینیس نے بچہ فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی کی رفتار بڑھ گئی۔ جینیس بار بار خشک لبوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ کولین کی گردن پر چاقو تھا اور وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی......

☆☆☆

سفر کا اختتام ایک گھر کے گیٹ پر ہوا۔ یہ چھوٹا سا گھر تھا اور اس علاقے میں زیادہ گھر نہیں تھے۔ کیمرون، کولین کو اندر لے آیا اور ایک کمرے میں بند کر دیا۔ خوف سے کولین کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی۔ اس کا دماغ سوچنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ اسی دوران میں جینیس نے گاڑی اندر کھڑی کی اور بچے کو لے کر بیڈروم میں آگئی۔ کیمرون نے کچن میں جا کر کافی بنائی۔ اس نے چپ چاپ کافی لا کر جینیس کے سامنے رکھ دی۔ اور دوسرا کپ...اپنے منہ سے لگا لیا۔ جینیس نے بھی کافی کا کپ اٹھا لیا۔

''کیمرون...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' اس کی بات سن کر وہ مسکرا دیا۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں مائی ڈیئر۔''

''آپ اس سے شادی نہیں کریں گے؟'' اس نے دوٹوک انداز میں کہا۔

''ایک معاہدہ تمہارا اور میرا ہوا تھا پچھلے سال۔'' کیمرون نے یاد دلایا۔ ''تم شاید اس کی شرائط بھول رہی ہو...... اگر تم کہو تو میں اسے چھوڑ دیتا ہوں اور معاہدہ توڑنے کی صورت میں تمہیں جو جرمانہ دینا ہے، وہ روز لوں گا۔'' اس نے جینیس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ دھیرے دھیرے اس کا ہاتھ آگے سرکنے لگا۔ جینیس بجلی کی تیزی سے اس سے دور ہوئی۔

''نن نہیں کیمرون......''

''پھر میرے کام میں رکاوٹ بھی مت ڈالو۔'' وہ غرایا۔ جینیس کے چہرے پر خوف کے تاثرات پھیل گئے۔ کیمرون کے ساتھ گزارے شادی کے بعد کے عرصے میں اس نے یہ جان لیا تھا کہ کیمرون ذہنی مریض ہے۔ وہ حقیقت میں جنسی دیوانہ تھا۔ جینیس کو اسے جھیلنا بہت مشکل تھا۔ بستر پر اس کے ساتھ گزارے لمحات اس کے لیے قیامت بن جاتے تھے۔ جینیس کا کوئی نہیں تھا۔ زندگی گزارنے کے لیے جو سہولیات اسے کیمرون نے دی تھیں، وہ حاصل کرنے کے لیے اسے یا تو جسم فروشی کا پیشہ اپنانا پڑتا یا پھر کیمرون کو برداشت کرنا پڑتا...... اس نے کیمرون کے ساتھ زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ بچے کی پیدائش کے بعد اس کے لیے کیمرون کی ضروریات پوری کرنا مزید مشکل ہو گیا۔ کیمرون یہ بات جانتا تھا۔ اس نے جینیس کے سامنے ایک معاہدہ رکھ دیا۔ جینیس معاہدہ پڑھ کر لرز اٹھی۔ کیمرون کسی لڑکی کو اپنی کنیز بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔

''نہیں، میں یہ نہیں کر سکتی۔''

''تمہاری مرضی۔'' کیمرون نے کندھے اچکا دیے۔ اس سے اگلی رات جینیس کے لیے قیامت تھی۔ دوسری صبح بستر پر سسکتے ہوئے اس نے کافی دیر سوچا۔ شام کو جب کیمرون واپس آیا تو اس نے چپ چاپ معاہدے پر سائن کر دیے۔ اس کے مطابق کیمرون ایک لڑکی کو کنیز بنا کر رکھ سکتا تھا مگر وہ اس سے ایک حد میں تعلق قائم کر سکتا تھا۔ جنسی تعلق رکھنے یا شادی کرنے کی شرط اس معاہدے میں شامل نہیں تھی۔ اس کے نتیجے میں جینیس کو وہ سہولت دے رہا تھا۔ کیمرون اگلے ماہ ہی ایک لڑکی لے آیا۔ وہ کوئی کال گرل تھی جسے اس نے اغوا کر لیا تھا۔ وہ ان کے ساتھ دو ماہ رہی۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہ چلا۔ اس دوران کیمرون خود کو ماسٹر کہتا تھا جبکہ دوسری لڑکی کا فرض تھا کہ وہ بھی اسے ماسٹر کہے۔ جینیس کے لیے وہ دن سکون کے تھے۔ کیمرون کچھ وقت اس لڑکی کو دیتا تھا مگر اس سے تعلق ایک حد میں رکھتا تھا۔

دو ماہ بعد وہ کہاں گئی، کچھ علم نہ ہوا۔ کیمرون اگلے شکار کے لیے کافی ماہ سے کوشش کر رہا تھا مگر کوئی مناسب لڑکی نہیں مل رہی تھی۔ کولین کی خوبصورتی نے اسے مجبور کر دیا تھا۔ نتیجے میں وہ لفٹ لے کر برتھ ڈے پارٹی پر جانے کے بجائے اس کے گھر آ چکی تھی۔ جینیس نہیں جانتی تھی کہ مستقبل میں کیا ہو گا مگر وہ کولین کی خوبصورتی سے خوفزدہ تھی۔

کیمرون نے کافی ختم کی اور کہا۔

''بے فکر رہو...... دوسری شادی نہیں کروں گا۔'' وہ اس کی ہر سوچ سے ایسے ہی واقف ہو جاتا تھا۔ جینیس نے سر ہلا دیا۔

''یہی ہمارے حق اور تمہاری ضروریات کے لیے ٹھیک رہے گا۔''

☆☆☆

''پولیس تمہیں ڈھونڈ لے گی۔'' کولین نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اپنی آواز کی لرزش پر وہ قابو

نہیں پا سکی۔ کیمرون اس کی بات سن کے مسکرا دیا۔
"پورے دن کی تھکن تمہاری یہ خوبصورتی دیکھ کر اتر گئی...... کیا چیز ہو تم...... آفس میں بھی تمہارا خیال...... سفر میں بھی......" اس نے اس کا گال سہلایا۔
"تم پکڑے جاؤ گے۔"
"تمہاری یہ آنکھیں......"
"مما پاپا پولیس میں رپورٹ درج کروائیں......"
اس کے الفاظ مکمل ہونے سے پہلے کیمرون نے اس کی گردن شکنجے میں جکڑ لی۔ اس نے خود کو چھڑوانا چاہا مگر ناکام رہی۔ اس کی مزاحمت چند منٹوں میں ختم ہو گئی۔ وہ بمشکل سانس لے رہی تھی۔
"مس کولین اسٹان...... تمہارے گھر والے تمہیں جلد بھول جائیں گے۔ اگر تم نے یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تو میرے لوگ انہیں مار دیں گے۔" اس نے اچانک اسے چھوڑ دیا اور سکون سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں سگار دکھائی دیا۔ کولین کی سانسوں کی رفتار قابو سے باہر تھی۔
"کون لوگ؟" اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔
"میرے لوگ...... دا کمپنی۔"
"دا کمپنی؟"
"ہاں...... میں نے گینگ بنا رکھا ہے اس نام سے...... اس گینگ میں قاتل ہیں، ڈکیت ہیں۔ مجھ تک تمہارے گھر والوں کی ایک ایک منٹ کی خبر پہنچ رہی ہے۔ تمہارا باپ پولیس اسٹیشن میں رپورٹ درج کروا چکا ہے کیونکہ جس دوست کی سالگرہ پارٹی میں تم شرکت کرنے گئی تھیں، اس نے انہیں بتا دیا ہے کہ تم وہاں نہیں پہنچیں۔ دوسری بات...... اگر تم نے یہاں سے نکلنے کی غلطی کی یا میری بات نہ مانی...... تو پھر تم ان کی موت کی ذمے دار ہو گی۔" اس کے لہجے میں سفاکیت تھی۔ کولین کا پورا جسم کانپنے لگا۔
"تم ایسا نہیں کر سکتے۔"
"میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ "صرف ایک شرط پر تمہارے گھر والے محفوظ ہیں...... اس پر سائن کر دو۔" اس نے ایک معاہدہ کولین کے سامنے رکھا۔ کولین نے شرائط پر نگاہ دوڑائی۔ اس معاہدے کے مطابق وہ اگلے دس سال کے لیے کیمرون کی ملازمہ تھی۔ کیمرون اس سے کسی قسم کا کوئی بھی سلوک کر سکتا تھا۔ وہ جانتی تھی اس معاہدے کی کوئی قانونی حیثیت نہیں مگر اس میں موجود جسمانی تعلقات کی شرائط پڑھ کر وہ کانپ اٹھی۔ کیمرون کے معاہدے کے مطابق وہ اسے جسمانی تشدد سے لے کر ہر قسم کی اذیت دینے کا حق رکھتا تھا۔
"میں نہیں کروں گی سائن۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔
"ٹھیک ہے...... میں دا کمپنی کو تمہارے خاندان کا قصہ ختم کرنے کا کہہ دیتا ہوں۔" اس نے عام سے لہجے میں کہا اور کھڑا ہو گیا۔
"نن نہیں۔" وہ باہر جانے لگا۔ "میں سائن کر رہی ہوں کیمرون۔" یہ اعصاب کا کھیل تھا۔ وہ چند منٹ میں ہار گئی۔ اس نے سائن کر دیے۔ کیمرون کے چہرے پر وہی مسکراہٹ لوٹ آئی جس سے کولین کو نفرت ہو چکی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور کولین کے ہونٹوں سے ہونٹ لگا دیے...... کولین خود کو چھڑا نہیں سکتی تھی۔ وہ اب کیمرون کی خادمہ تھی۔ تھوڑی دیر وقت گزارنے کے بعد کیمرون آگے بڑھا اور الماری سے ایک ناول نکال کر دیا۔ یہ ناول کسی اور زبان میں تھا مگر کیمرون کے پاس اس کا انگلش ترجمہ تھا۔ ٹائٹل پر موجود تصویر دیکھ کر ہی وہ اس ناول کا مقصد سمجھ چکی تھی۔
"یہ ہے ناول...... اسٹوری آف دا او (Story of The O)"
"میں کیا کروں گی اس ناول کا؟"
"تمہیں خود کو اس کے ایک کردار کے مطابق ڈھالنا ہے...... کونسا کردار ہے...... یہ تم خود پڑھ کر اندازہ لگا لینا، ذہین لڑکی ہو تم۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اور مجھے کیمرون نہیں، ماسٹر کہنا ہے آج سے۔"
"ٹھیک ہے کیمرو...... ماسٹر۔" اس کی زبان پھسلی مگر اس نے جلد قابو پا لیا۔ وہ سر ہلاتا ہوا باہر چلا گیا۔ کولین نے ناول کھول لیا۔ ناول مکمل پڑھنے کے بعد اسے اپنے کردار کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

کولین کو قید میں رہتے ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے۔ اس دوران اسے کمرے سے نکل کر گھر میں گھومنے کی اجازت مل گئی مگر یہ کام کیمرون کی نگرانی میں ہوتا تھا۔ وہ اسے ہر وقت اپنے ان لوگوں کی سفاکیت کے بارے میں بتاتا رہتا تھا جو اس کے گھر والوں کی نگرانی کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ کولین کا دماغ نئی صورتِ حال قبول کر رہا تھا۔ ان کا زبردستی کا یہ رشتہ ایک حد سے آگے نہیں بڑھا۔ وہ اور کیمرون جب قریب ہوتے تب ہی کولین کو احساس ہو جاتا

تھا کہ کوئی ان کو دیکھ رہا ہے۔

کیمرون کو اس کے جسم کی کشش کھینچ لاتی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ جینیس سے بالکل دور ہو گیا۔ انہی دنوں کولین کے دماغ میں ایک نئے خیال نے جنم لیا۔ اس نے ایک ہفتے میں منصوبہ تیار کیا تھا۔

وہ اتوار کی شام تھی۔ جینیس گھر سے باہر تھی۔ اسے بچّے کی خریداری کے لیے شہر جانا تھا۔ کیمرون حسبِ معمول صوفے پر لیٹ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا جبکہ کولین، کیمرون کی پسند کے مطابق لباس پہن کر اس کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ لباس اس کا جسم چھپانے میں ناکام تھا۔ اسی دوران میں اس نے کیمرون کے اشارہ کرنے پر بوتل سے بیئر کا گلاس بھر کر اسے دیا۔

”تم بہت اچھی ہو...... کولین۔“

”شکریہ ماسٹر۔“ اس نے ہدایت کے مطابق جواب دیا۔ وہ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ اس کے جسم سے بھی چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔ اچانک کولین کا ہاتھ باہر آیا۔ اس نے صوفے کے نیچے سے چھری نکالی اور کیمرون پر حملہ کر دیا۔ کیمرون ہرگز تیار نہ تھا۔ اس نے بچنے کی کوشش کی مگر چھری اس کے کندھے میں دھنس گئی۔ اس کے حلق سے غراہٹ نکلی۔ کولین نے چھری نکالنی چاہی مگر وہ کندھے میں پھنس چکی تھی۔ کولین اسے مارنا چاہتی تھی...... مگر کیمرون کا پیر پوری قوت سے اس کے منہ پر لگا۔ وہ چیختی ہوئی پیچھے جا گری۔ اس نے اٹھنے میں پھرتی دکھائی اور بھاگنے لگی۔ گیٹ کھولنے کے بجائے اس نے پھلانگ کر گیٹ پار کیا۔ کیمرون اس کے تعاقب میں تھا۔ وہ چیخ رہا تھا......

”کولین رک جاؤ۔“ کولین جانتی تھی...... اب رکنا موت تھی۔

اس نے سیدھا سڑک پر بھاگنے کے بجائے درختوں کے جھنڈ کی طرف رخ کیا۔ باہر بارش تھی...... تیز ہوا اور سردی نے اس کا استقبال کیا۔ مختصر لباس میں اس کا پورا جسم اس سردی کو محسوس کر رہا تھا مگر بھاگنے کی وجہ سے پورے جسم میں حرارت پھیل رہی تھی۔ اسے شدید سردی میں بھی ماتھے پر آئے پسینے کا احساس ہوا۔

”کولین...... کمپنی کے لوگ تمہارے گھر والوں کو مار دیں گے۔“ کولین کے قدم سست پڑ گئے۔ کیمرون اس کے قریب آ رہا تھا۔ اچانک کولین نے دوبارہ بھاگنا شروع کر دیا۔ بارش کی بوندوں کی آواز درختوں کے پتوں سے ٹکرا کر شور پیدا کر رہی تھی۔ بادلوں کی گھن گرج اور بجلی کی چمک نے ماحول کو مزید خوفناک کر دیا تھا۔ کولین نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کیمرون نے کندھے سے بہنے والا خون پورے چہرے پر مل لیا تھا۔ اس کا چہرہ خون کی سرخی میں کسی درندے سے کم خطرناک نہیں لگ رہا تھا۔ کولین اس سے چند قدم دور تھی۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا اس کی غلطی تھی۔ خوف اس کے پورے جسم میں پھیل گیا۔ ماں باپ بہن بھائی...... سب کی شکلیں اس کے دماغ میں گھومنے لگیں۔

”کولین...... کوئی زندہ نہیں بچے گا۔“ کیمرون کی چیخ گونجی۔

”بھاگو......“ اس کے دماغ نے کہا۔ ”رک جاؤ۔“ دل نے صاف انکار کیا۔ اس لڑائی میں ہار اس کے قدموں کی ہوئی۔ وہ لڑکھڑا کر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ شمالی کیلیفورنیا کی سرد ہوائیں اس کے بے ہوش جسم سے ٹکرا رہی تھیں۔

☆☆☆

اسے ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک ڈبے میں بند پایا۔ یہ ڈبا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ بمشکل اپنے جسم کو موڑ سکی۔ لکڑی کے اس ڈبے میں چند چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے تھے جن سے ہوا اندر آ رہی تھی۔ روشنی نہ ہونے برابر تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ چند منٹ آنکھیں بند کرنے کے بعد اس نے دوبارہ کھولیں۔ چند گہری سانسیں لے کر اسے احساس ہوا، ڈبے میں موجود آکسیجن اس کے لیے ناکافی تھی۔

”کیمرون۔“ اس نے پکارا۔ ”مجھے باہر نکالو...... ماسٹر...... پلیز۔“ کوئی سننے والا نہیں تھا۔ وہ دوبارہ چیخی۔ ”آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی ماسٹر......“ کیمرون شاید کہیں موجود نہیں تھا۔ چند منٹ بعد ہی وہ ہانپنے لگی۔ آخر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب کسی نے ڈبا کھولا تھا۔ اس نے دیکھا۔ وہاں کیمرون موجود تھا۔ وہ اچھل کر باہر آئی۔ اس نے گہری سانسیں لیں۔ کیمرون کے چہرے پر مخصوص مسکراہٹ سجی ہوئی تھی۔

”مزہ آیا؟“

”مجھے معاف کر دیں ماسٹر۔“ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکنے لگے۔

”معاف کر کے ہی ڈبے میں بند کیا ورنہ اس جیسا حال کرتا۔“ اس نے ایک تصویر اس کے سامنے کر دی۔ یہ بھی کوئی خوبصورت لڑکی تھی۔

''یہ کون ہے؟''
''ایرک...... تم سے پہلے میری خادمہ یہ تھی...... اسٹوری آف دا او کا وہی کردار جسے تم نبھا رہی ہو۔''
''یہ کہاں گئی؟'' اس نے حیران نظروں سے تصویر میں موجود لڑکی کو دیکھا۔
''ٹکڑے کر کے بہا دیا دریا میں۔'' کیمرون نے ایسے کندھے اُچکائے جیسے اس کے لیے یہ سب معمول کی بات ہو۔
''میں آپ کی ہر بات مانوں گی...... مجھے ڈبے میں مت بند کیجیے گا۔'' اس کے لہجے میں رحم کی طلب تھی مگر کیمرون کی ڈکشنری میں رحم نام کا لفظ شامل نہیں تھا۔
''تم باتوں میں وقت ضائع کر رہی ہو...... آئندہ تم صرف ایک گھنٹے کے لیے اس ڈبے سے باہر آؤ گی، ابھی دس منٹ ہو چکے ہیں، پچاس منٹ گزار لو۔'' کولین نے منہ پر ہاتھ رکھا۔ کیمرون اسے مار نہیں رہا تھا مگر موت جیسی زندگی دے رہا تھا۔
''نن نہیں......''
''اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔'' اس نے منہ بنایا۔ کولین بھاگ کر باتھ روم میں داخل ہوئی۔ دس منٹ بعد جب وہ باہر آئی تو اس کے جسم پر پانی بہہ رہا تھا۔ کیمرون نے ہوس بھری نظروں سے اسے دیکھا۔
''کاش...... جینیس سے ہر حد پار کرنے کی شرط منظور کروائی ہوتی۔'' وہ بڑبڑایا۔ کولین نے دوبارہ اس سے ڈبے میں نہ بند کرنے کی درخواست کی مگر وہ نہ مانا۔ چند لمحے اس کے جسم سے کھیل کر اس نے وقت دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد کولین دوبارہ اس ڈبے میں بند پڑی تھی۔
یہ دونوں کا معمول بن گیا۔ کولین کو رفتہ رفتہ عادی ہونا پڑا۔ دن کے تئیس گھنٹے ایک ڈبے میں گزارنا اس کے لیے شروع شروع میں بہت مشکل تھا مگر آہستہ آہستہ ... عادت ہو گئی۔ اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں کھو چکا تھا۔ وہ حقیقت میں خود کو ایک کنیز سمجھتی تھی جس کا کام ماسٹر کے ہر حکم کی تعمیل کرنا تھا۔
اگلے ایک سال میں زندگی کا ہر وہ دن خوبصورت تھا جب کیمرون اس کے جسم سے کھیلنے کے لیے اسے ڈبے سے زیادہ دیر باہر رکھتا تھا۔ اس نے غور کیا...... جینیس بھی بالکل اسی کی طرح معمول کی پابند تھی۔ کیمرون نے دونوں کے دماغ کو مکمل اپنے قابو میں رکھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی کیمرون کے خلاف اگر کوئی سوچ دماغ پر دستک دیتی تو اسے اپنا سر پھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔
ایک سال اور سات ماہ بعد کیمرون نے اسے ایک دن ڈبے سے خلافِ معمول صبح ہی باہر نکال لیا۔
''آج میری چھٹی ہے...... اتوار ہے۔''
''پھر؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے کیمرون کی طرف دیکھا۔
''تمہیں تمہارے گھر والوں سے ملوانا ہے۔'' کیمرون کی بات سن کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
''مگر کیوں؟''
''تمہیں نہیں ملنا؟'' اس نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''ٹھیک ہے رہنے دیتے ہیں۔''
''نن نہیں...... ملنا ہے۔'' وہ ہکلائی۔ ''مگر......''
''اگر مگر کچھ نہیں، تم وہاں ظاہر کرو گی کہ تم دوسرے شہر میں کام کر رہی ہو...... اگر کسی قسم کی زبردستی یا میرے رویّے کا کوئی اشارہ انہیں دیا...... تم تو بچ جاؤ گی مگر میرے لوگ انہیں مار ڈالیں گے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ مزید ہدایات دے کر وہ اسے باہر لے آیا۔ گیراج سے گاڑی نکال کر اس نے فرنٹ سیٹ پر کولین کو بٹھایا۔ کولین کسی معصوم بچے کی طرح اردگرد دیکھ رہی تھی۔ ایک طویل عرصے بعد اسے رہائی ملی تھی۔ درخت، پرندے، اردگرد چلتے لوگ...... دنیا کی رونق برقرار تھی۔ ہائی وے سے طویل سفر کر کے وہ اس کے ٹاؤن میں پہنچے۔ اسے اپنا ایڈریس یاد تھا۔ کولین کو گیٹ پر چھوڑ کر کیمرون نے کہا۔
''جاؤ...... مل لو...... شام کو لینے آ جاؤں گا اور یاد رکھنا، اردگرد میرے لوگ ہیں، وہ سامنے پارک میں رکھی بینچ پر جو بندے بیٹھے ہیں وہ میرے خاص بندے ہیں۔'' اس نے اشارے سے اسے دور بیٹھے دو افراد دکھائے۔ کولین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گاڑی سے اتر کر وہ تیز قدم اٹھاتی گھر کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ بیل کے جواب میں جس لڑکے نے گیٹ کھولا وہ اس کا بڑا بھائی تھا۔ وہ بھائی سے لپٹ گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔
''جون......'' خلافِ توقع جون نے اتنی گرمجوشی نہیں دکھائی۔ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔
''پاپا نے بہت ڈھونڈا تمہیں مگر تم غائب تھیں......''
''میں دوسرے شہر میں جاب کر رہی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ اس کی آواز سن کر ماں الزبتھ اور چھوٹی بہن بھی باہر آ گئیں۔ ''کیتھرین......'' چھوٹی بہن سے ملنے کے بعد وہ ماں سے لپٹ گئی۔

''تم کہاں تھیں، کولین...... ہم نے بہت ڈھونڈا تمہیں۔''

''میں جاب کر رہی ہوں دوسرے شہر میں۔'' اس نے سب کو یہی جواب دیا۔ وہ اسے اندر لے آئے۔ کافی دیر باتیں کرنے کے بعد الزبتھ نے ایک عجیب بات کی۔

''شام ہونے سے پہلے چلی جانا واپس۔''

''کیوں؟'' اس نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ''میں اتنے دنوں بعد آئی ہوں مما، پاپا سے مل کر جاؤں گی۔''

''وہ تم سے نہیں ملیں گے۔'' الزبتھ ہچکچائی۔

''مگر کیوں؟'' الزبتھ کے بجائے جون نے میز پر پڑے پرانے اخبار کی خبریں اسے دکھائیں۔

''ہم کافی دیر تمہیں ڈھونڈتے رہے مگر جب یہ خبر ملی تو ہمیں معلوم ہوگیا ہمارا ڈھونڈنا بے کار ہے۔'' اس نے خبر پر نظر دوڑائی۔ اینا...... جس کی سالگرہ کی پارٹی میں وہ شرکت کرنے گئی تھی، وہ پولیس کی قید میں تھی۔ اس پر ایک بدنام ڈکیت گروپ کی ساتھی ہونے کا الزام تھا۔

''مگر میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔'' اس نے احتجاج کیا۔ اسے اب گھر والوں کے سرد رویے کی سمجھ آئی تھی۔ شاید کیمرون تک بھی یہ خبر پہنچ چکی تھی اس لیے وہ اسے گھر والوں سے ملوانے لے آیا تھا۔

''میں مجبور ہوں میری بیٹی۔'' الزبتھ کی آنکھوں میں نمی دکھائی دی۔ ''ہم خود کو پولیس کے چکر سے بچانا چاہتے ہیں......'' کولین نے گہری سانس لی۔ اس بات کے بعد اس کا وہاں ایک پل بھی رکنا مشکل ہوگیا تھا۔ ساری آس امید، گرمجوشی، پیار اور لاڈ...... سب ختم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے غور کیا تو یہ ایک لحاظ سے بہتر محسوس ہوا۔ اگر گھر والوں کو اس جرم والی غلط فہمی نہ ہوتی تو اب تک وہ ان کے سوالوں کے سامنے ہار چکی ہوتی۔ بمشکل ایک گھنٹا رک کر اور ایک کافی کا کپ پی کر اس نے ان سے اجازت مانگی۔ جیسے ہی وہ گیٹ سے باہر نکلی...... کیمرون گاڑی لے کر آ گیا۔

''مجھے امید تھی تم اتنی دیر ہی رکو گی۔''

''تمہیں ہر بات کا کیسے علم ہو جاتا ہے؟'' وہ جھنجلائی ہوئی تھی۔ کیمرون نے اس کی جھنجلاہٹ سے لطف اٹھایا۔

''وا کمپنی......'' اس نے وہی پرانا جواب دیا۔ ''اور مجھے 'تم' کہلانا پسند نہیں...... ماسٹر کہا کرو۔'' اس کی بات پر توجہ دیے بغیر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ دنیا کی رونق اس کے لیے ختم ہو چکی تھی......

☆☆☆

وقت کا کام گزرنا ہے سو وہ گزرتا چلا گیا۔ دھوپ بارش، سردی گرمی، ہوا یا حبس...... باہر کیا موسم ہے، یہ دن میں تیس گھنٹے ایک ڈبے میں قید رہنے والی کولین کو معلوم نہیں تھا۔ اس نے دن اور موسموں کا حساب رکھنا چھوڑ دیا۔ ایک اندازہ تھا...... شاید اسے چھ سال گزر گئے تھے۔ اس کی کمر اب سیدھے ہونے سے انکار کر چکی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے چل پھر پاتی۔ اس کے دماغ پر مکمل طور پہ کیمرون کا قبضہ تھا۔ جینیس بھی اسی کے جیسی تھی۔ ایک مشین کی طرح اپنے فرائض سرانجام دیتی جینیس اگر کبھی اسے آزادی کے ایک گھنٹے میں دکھائی بھی دی تو اس کی زبان خاموش اور وہ روبوٹ کی طرح کام کرتی دکھائی دی۔

چھ سال بعد کیمرون کو اچانک ایک نیا خیال آیا۔ وہ شاید یکسانیت سے اکتا چکا تھا۔ اس نے کولین کو قید سے آزادی دے کر چند دن ورزش کروائی اور جب وہ ٹھیک سے چلنے پھرنے لگی تو اسے ایک ہوٹل میں لے آیا۔ یہاں کے مالک نے اس کا انٹرویو لیا۔ وہ کیمرون کا دوست تھا۔ کولین کی خوبصورتی دیکھ کر اس نے اسے بخوشی ویٹریس کی جاب دے دی۔

''دن میں آٹھ گھنٹے ڈیوٹی ہوگی۔'' اس نے اوقات بتائے۔ قید سے آزادی تک کے اس سفر میں کولین کو خوشی ہونی چاہیے تھی مگر وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

''مت بھولنا...... دو آنکھیں تمہیں ہر وقت دیکھ رہی ہیں......'' کیمرون وارننگ دینا نہیں بھولا تھا حالانکہ اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کولین نے نوکری کرنا شروع کر دی۔ نئی روٹین نے رفتہ رفتہ اس کے دماغ پر خوشگوار اثر ڈالا۔ اب وہ چھبیس سال کی ایک بھرپور جسم کی مالک خوبصورت لڑکی تھی۔

اتوار کو اس کی چھٹی ہوئی تھی۔ جینیس حسبِ معمول اس دن باہر تھی۔ وہ عام طور پر بیٹے کو گھمانے کے ساتھ ساتھ اتوار کو خریداری کے لیے باہر جاتی تھی۔ کیمرون اور وہ دونوں گھر میں تھے۔ مارچ میں ہونے والی بارش نے سردی میں شدید اضافہ کر دیا تھا۔ نجانے کیمرون کے دماغ میں کیا خیال آیا...... اس نے اچانک کولین سے کہا۔

''باہر بارش میں بھیگ کر آؤ۔''

''یس ماسٹر۔'' اس نے باہر دیکھا اور پھر ٹھنڈی ہوا اور بارش میں باہر چلی گئی۔ سوال کرنا اور جواب طلب کرنا وہ کب کا بھول چکی تھی۔ وہ واپس آئی تو کیمرون اس کے گیلے جسم سے کھیلنے لگا۔ دونوں کو حرارت محسوس ہوئی۔ چھ سال

کے عرصے میں ان کا یہ تعلق ایک حد میں رہا تھا مگر آج کیمرون کی وحشت کے سامنے وہ مزاحمت نہ کر سکی۔ اس نے چپ چاپ خود کو کیمرون کے حوالے کر دیا۔ یہ قیامت کی گھڑیاں تھیں...... باہر بارش کی آواز...... اور اندر کمرے کی خاموشی ان کی سانسوں کی گونج سے مقابلہ کر رہی تھی۔ جینیس اس وحشت و ہوس کو ہمیشہ ایک حد میں رکھنے کی کوشش کرتی تھی مگر کولین نے ایسی کوئی کوشش نہ کی۔ وہ چپ چاپ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتی چلی گئی۔ بارش تھم گئی۔ کیمرون بیڈ کے کنارے پڑا تھا۔ کولین نے نجانے کیوں خود کو مکمل محسوس کیا۔

دونوں کے رویے میں غیر محسوس سی تبدیلی آ گئی۔ کیمرون اس کا خیال رکھنے لگا تھا۔ ایک شام وہ ہوٹل سے جلدی لوٹ آئی۔ جینیس اس کی منتظر تھی۔ وہ جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہوئی...... جینیس اس کے پیچھے آ گئی۔

"تم اپنے گھر چلی جاؤ۔"

"میں نہیں جا سکتی۔" اس نے صاف انکار کیا۔

"مگر کیوں؟" وہ تیز لہجے میں بولی۔ "کیمرون میرا شوہر ہے، وہ تمہیں ساری عمر ایسے ملازمہ بنا کر نہیں رکھے گا جب اس کا دل بھر گیا تب وہ تمہیں مار دے گا۔"

"میں فرار ہو گئی تو وہ میرے گھر والوں کو مار دے گا۔"

"وہ سب جھوٹ بولتا ہے...... اس کا کوئی بندہ نہیں، اس کی تنخواہ سے گھر کا گزارا مشکل سے ہوتا ہے۔ اتنے بندے نوکری پر رکھ کر وہ تنخواہ کیسے دیتا ہوگا؟ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔ میں سب جانتی ہوں...... اس نے جو معاہدہ کیا ہے وہ بھی غلط ہے اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں۔" کولین نے چند لمحوں کے لیے سوچا پھر کمرے میں آ کر ایک بیگ میں کپڑے ڈالے اور باہر آ گئی۔

"ٹھیک ہے...... مگر میں اپنے گھر جانے کا رسک فی الحال نہیں لوں گی۔" وہ باہر آ گئی۔

☆☆☆

شام کو کیمرون واپس آیا۔ اس نے آتے ہی معمول کے مطابق لباس تبدیل کیا اور جینیس سے پوچھا۔

"کولین آ گئی واپس؟"

"میں مصروف تھی...... دیکھا تو نہیں، شاید آ گئی ہو۔"

کیمرون سر ہلاتا ہوا اندر بڑھ گیا۔ کمرا خالی پڑا تھا۔ اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ لپک کر باہر آیا۔

"کہاں ہے وہ؟" اس نے جینیس کا بازو تھام لیا۔

"مم، مجھے نہیں معلوم۔" اس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔

"اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔" اس نے صاف الفاظ میں کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

"وہ ہوٹل سے......" جینیس کی بات مکمل ہونے سے پہلے تھپڑ اس کے منہ پر پڑا۔ وہ الٹ کر گری۔ کیمرون باہر گیٹ کی طرف بھاگا۔ وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ اسی دوران گیٹ پر بیل بجی۔ اس نے بھاگ کر گیٹ کھولا۔ سامنے کولین کھڑی تھی۔

"کہاں گئی تھیں تم؟" وہ غرایا۔ اس نے کولین کو بالوں سے پکڑ لیا۔ وہ اسے گھسیٹ کر اندر لے آیا اور تین چار تھپڑ رسید کر کے اسے دوبارہ ڈبے میں بند کر دیا۔ کولین نہیں جانتی تھی یہ قید کتنے عرصے رہے گی مگر اس نے کیمرون کے تشدد اور گالیوں کے جواب میں صرف خاموشی اختیار کی تھی۔

تقریباً تین ماہ بعد اس قید سے اسے دوبارہ رہائی ملی۔ ویٹریس کی جاب پھر سے شروع ہو گئی۔ نوکری کی پہلی تنخواہ اس نے کیمرون کے ہاتھ پر رکھ دی۔ اس نے پیسے جیب میں ڈال لیے۔ وہ خوش دکھائی دیا تھا۔

"مجھ سے شادی کرو گی کولین؟" اس نے عجیب انداز میں پوچھا۔

"ی...... یس ماسٹر۔" انکار کرنا وہ کب کا بھول چکی تھی۔ اس نے کولین کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ کولین کو اس کے وجود سے محبت کی مہک...... کبھی نہیں محسوس ہوئی......

اگلے دن شام کے وقت کیمرون کے آنے سے پہلے جینیس اس کے پاس آئی۔ کولین کو اس کی آنکھوں میں نفرت دکھائی دی۔

"تم میرا گھر برباد کر کے اپنا آباد کرنا چاہتی ہو۔"

"ماسٹر کا یہی حکم ہے......" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"تم جھوٹ بولتی ہو...... یہ ڈراما بند کرو...... کیمرون نے تمہارے دماغ پر ہرگز قابو نہیں پا رکھا۔" وہ چیخی۔ "تم میرا شوہر قابو کر رہی ہو...... وہ مجھے طلاق دے رہا ہے......" جینیس نے آنسو روکنے کی کوشش کی مگر ضبط کی کوشش ناکام رہی۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔ اس کی آواز میں درد تھا۔ "وہ مجھے گھر سے نکال دے گا میرا بیٹا در در کی ٹھوکریں کھائے

گا...... ہمیں بھیک مانگنی پڑے گی۔''

''میں یہاں سے چلی گئی تو وہ میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا' مجبوراً مجھے پولیس کا سہارا لینا پڑے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے تم سے دور ہو جائے گا۔'' اس کا جواب سن کر جینیس نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا۔

☆☆☆

''یہ ایک کمزور ترین کیس ہے۔'' کیمرون نے کولین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مس کولین کہتی ہیں انہیں سات سال ایک ڈبے میں رکھا گیا ہے اس دوران انہیں گھر والوں سے بھی ملنے دیا گیا ہے اور جاب بھی کرنے کی اجازت ملی..... کیا یہ بات تسلیم کی جاسکتی ہے؟ کیا میں اتنا بے وقوف مجرم ہوں کہ انہیں قید کرنے کے بعد آزادی سے گھومنے دوں گا؟''

''میرے پاس تمام میڈیکل رپورٹس موجود ہیں۔'' مارک نے جواب میں لفافہ سامنے رکھا۔ ''اس کے مطابق ان کی ریڑھ کی ہڈی میں مسئلہ ہے...... ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ جو ماہرِ نفسیات نے دیا ہے اس کے مطابق ان کے دماغ پر اثر ہے جس کی وجہ سے انہیں کافی عرصہ سیشن لینے پڑیں گے۔''

''یہ کوئی ثبوت نہیں...... میرے خلاف کوئی گواہ موجود نہیں۔'' کیمرون نے تیز لہجے میں کہا۔

''سچ جھوٹ کا فیصلہ عدالت کرے گی...... لیکن گواہ موجود ہے۔'' مارک نے جواب دیا۔ کولین جو خاموش بیٹھی تھی اچانک بول پڑی۔

''اس کے علاوہ ایرک جس کی تصویر تم دکھاتے تھے' اس کی لاش بھی پولیس ڈھونڈ لے گی۔''

''تم بکواس بند کرو۔'' کیمرون نے نفرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ آج کولین ہرگز خوف زدہ نہیں تھی۔ ''مجھے گواہ کا بتایا جائے ورنہ یوں حراست میں لینے پر میں تم پر بھی کیس کروں گا آفیسر۔'' پولیس آفیسر مارک مسکرا دیا۔ اس نے اشارہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے گواہ موجود تھا۔ کیمرون نے حیرت بھری نظروں سے جینیس کی طرف دیکھا۔ بازی پلٹ چکی تھی......

''تت' تم میرے خلاف گواہی دو گی...... جینیس......؟'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کیمرون کی طرف دیکھے بغیر اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ ایرک کے قتل کی وہ گواہ تھی۔ اس نے چند مقامات کی نشاندہی بھی کی جہاں ایرک کی لاش ہو سکتی تھی۔ کیمرون کو بند کر دیا گیا۔

اس شام جینیس کے رونے اور درخواست کرنے پر کولین نے فیصلہ کر لیا۔ اگلے دن وہ ہوٹل سے سیدھا پولیس اسٹیشن چلی آئی۔ پولیس آفیسرز کے لیے اس کی بات پر یقین کرنا مشکل تھا مگر جلد انہیں سچائی کا اندازہ ہو گیا۔ نتیجے میں کیمرون کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

مارک باہر گیا تو جینیس نے کولین کی طرف دیکھا۔

''تمہیں اپنی قید سے پیار کیوں تھا؟ کیوں موقع ملنے کے باوجود فرار نہیں ہوتی تھیں؟''

''پہلے تم بتاؤ...... گواہی کے لیے تیار کیسے ہوئیں؟ اکیلے کیسے گزرے گی زندگی؟'' اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال پوچھا۔

''میرا شوہر تھا کیمرون' پہلے اس نے میرے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ ایک مخصوص حد میں کسی اور سے رشتہ رکھ کر وہ اپنی ساری وحشت کا نشانہ مجھے نہیں بنائے گا اس لیے اپنی آسانی کے لیے مجھے اس کی عجیب شرط ماننی پڑی مگر تم سے میں خوف زدہ تھی اس لیے مجھے اس کا جیل جانا منظور ہے مگر اس کا تقسیم ہونا یا کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنا ہرگز منظور نہیں۔'' جینیس نے واضح جواب دیا۔ یہ ایک عورت کی فطرت تھی...... ''اب تم بتاؤ۔''

''قید کے پہلے سال مجھے یہی لگتا تھا کہ میرا خاندان اس کے قبضے میں ہے مگر دوسرے سال جب وہ گھر والوں سے ملوانے لے گیا تو مجھے بینچ پر بیٹھے دو بندے دکھائے جو اس کے مطابق وا مپنی کا حصہ تھے...... مگر میں پہچان چکی تھی وہ دونوں میرے رشتے دار تھے...... اس نے غلطی کی کر دی۔ تب مجھ پر اس کا جھوٹ کھل گیا...... میں نے سات سال اس جھوٹ میں گزار دیے...... میں فرار ہو سکتی تھی مگر نہیں ہوئی......''

''کیوں؟'' وہ اب بھی حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''مجھے سات سالوں کی اس قید میں...... ڈبے میں گزارے اُن دنوں کے تئیس گھنٹوں میں بس ایک اس لمحے کا انتظار تھا جب کیمرون کو اپنے گناہ کا احساس ہوتا یا تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ میں کتنی مشکل میں ہوں...... مگر میں سات سال صبر کر کے بھی ناکام رہی، تم نے اپنی انا کی خاطر میرا ساتھ دیا اور کیمرون وہی شیطان رہا......'' کولین کے آنسو بہنے لگے...... جینیس خاموش تھی...... کچھ بولنے کو بچا ہی کیا تھا؟

❖❖❖

وہ رات...

نجمہ مودی

کہانی کوئی بھی ہو... اس کے کردار اور واقعات جیتے جاگتے مختلف بھیسوں میں ہمارے اردگرد گھومتے نظر آتے ہیں... کہانی کا آغاز کہیں سے بھی... اختتام ہی کی طرف بڑھتی ہے... بعض کہانیوں کے کردار اپنے انجام سے بالکل بے خبر رہتے ہیں... سردیوں کی سرد اور ٹھٹھری ہوئی راتیں... سنسان سڑکوں پر کوئی نظارہ تھا نہ تماشائی... مگر اچانک ہی شکاریوں کا ایک غول نمودار ہوگیا... دیکھتے ہی دیکھتے ایک معمولی واقعے نے خونی رنگ اختیار کر لیا...

چار شکاریوں کے جال میں اُلجھ جانے والی عورت کا دلیرانہ مقابلہ......

اُن کی شادی کو صرف سات سال ہوئے تھے اور علیزے حیرت سے سوچتی تھی، اتنے مختصر سے عرصے میں اس کی ازدواجی زندگی میں سے خوشی کہاں چلی گئی تھی؟ اس کے خیال میں سات سال کوئی اتنا لمبا عرصہ نہیں تھا کہ اس دوران میں میاں بیوی ایک دوسرے کی شکل سے بیزار ہو جائیں۔ خاص طور پر، جبکہ شادی محبت کی ہو۔ شادی سے پہلے علیزے اور وقار دو سال تک نئے زمانے کے لیلیٰ مجنوں کی طرح ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار رہے تھے۔ دونوں تعلیم یافتہ تھے، دونوں کا تعلق اونچے طبقے سے تھا۔ دونوں کے گھرانے ماڈرن اور آزاد خیال تھے۔ اس کے باوجود دونوں کو ایک دوسرے سے شادی کرنے میں خاصی مشکلات پیش آئی تھیں۔ کچھ خاندانی مسائل اور جھگڑوں کی وجہ سے انہیں کچھ ایسا ہی لگتا رہا تھا جیسے ”ظالم سماج“ ان دونوں کے بیچ میں آگیا ہے۔ پھر بڑی مشکلوں سے دو سال بعد ان کی شادی کی نوبت آئی تو انہیں یوں لگا جیسے انہیں دنیا جہان کی خوشیاں مل گئی ہوں۔

شادی کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد ان کے ہاں جڑواں بچے ہوگئے۔ بچے جوں، جوں بڑے ہوتے گئے، ان کی محبت ”چھوٹی“ ہوتی گئی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہ آئی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُن کے درمیان چخ چخ ہونے لگی۔ اس کی وجہ بھی علیزے کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اسے جوائنٹ فیملی کا مسئلہ بھی درپیش نہیں تھا۔ وقار شادی کے فوراً بعد ہی علیزے کے ساتھ الگ بنگلے میں رہنے لگا تھا جو اس کے والد ہی کی ملکیت تھا۔ پہلے کرائے پر اٹھا ہوا تھا۔ شادی کے بعد وقار نے اپنے لیے خالی کرا لیا تھا۔ ان میاں بیوی کی زندگی میں کسی کا عمل دخل نہیں تھا۔ گھر میں بس نوکر چاکر تھے اور وہ خود تھے۔ دونوں جڑواں بیٹے جوں جوں بڑے ہورہے تھے، خوب شرارتی نکل رہے تھے۔ علیزے انہیں سنبھالنے اور ان کی دیکھ بھال کے سلسلے میں کسی ملازم یا ملازمہ پر انحصار نہیں کرتی تھی، خود

سنبھالتی تھی اور بے حال ہو جاتی تھی۔

جب بچے اسکول جانے لگے تو علیزے کو احساس ہوا کہ اس دوران میں وہ اور وقار شاید ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئے تھے۔ ان کے درمیان ایک نادیدہ سی خلیج حائل ہو چکی تھی۔ ایک دوسرے سے بات کرتے وقت جلد ہی ان کے لہجے میں چڑچڑاہٹ آجاتی۔ رفتہ رفتہ یہ چڑچڑاہٹ، نوک جھوک کا سبب بننے لگی۔ پھر یہ نوک جھوک گویا لائف اسٹائل کا ایک حصہ بنتی چلی گئی۔ قربتیں اور ایک دوسرے کی چاہت کم ہو گئی تھی، بحث و تکرار زیادہ ہوتی تھی لیکن اچھی بات یہ تھی کہ یہ بحث و تکرار زیادہ سنگین صورت اختیار نہیں کرتی تھی۔ دونوں بس ایک دوسرے سے کچھ خفا خفا سے ہو جاتے تھے مگر یہ خفگی صرف ایک آدھ دن تک ہی رہتی تھی۔ پھر آئندہ کسی کج بحثی کے بعد نئی خفگی شروع ہو جاتی تھی۔

اس رات گھر کا ماحول اچھا خاصا پُرسکون تھا لیکن بیٹھے بٹھائے ہلکی پھلکی جھڑپ سی ہو گئی۔ علیزے بچوں کو سُلانے ان کے کمرے میں گئی تھی لیکن انہوں نے سونے کے بجائے علیزے کا ناک میں دم کرنا شروع کر دیا۔ دونوں کمسن، جڑواں بھائی بے حد شریر تھے اور پوری کوشش کرتے تھے کہ علیزے کا کہنا بالکل نہ مانیں۔ بڑی دیر کی کوششوں کے بعد آخر انہوں نے اس شرط پر، سونے کے لیے آمادگی ظاہر کی کہ انہیں ''ڈونٹس'' لا کر کھلائے جائیں۔ اس وقت رات کے نو بجنے والے تھے۔ لاہور میں اچھی خاصی سردی شروع ہو چکی تھی۔ اوپر سے ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی جس کی وجہ سے سردی کا احساس بڑھ گیا تھا۔
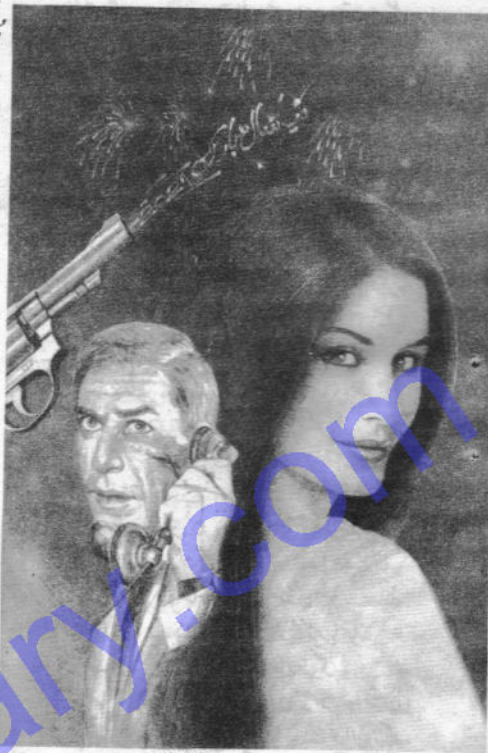
وقار اور علیزے ڈیفنس میں، جس گھر میں رہ رہے تھے، وہ زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن اس میں بھی اندر بیٹھ کر، باہر کے ماحول اور فضا کا کچھ خاص اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ رات کے وقت تو پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔ تاہم علیزے کو اندازہ تھا کہ اس وقت ڈیفنس کی سڑکوں پر تقریباً سناٹا ہو گا مگر یہ اس کے لیے کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ کم از کم ڈیفنس کی حدود میں تو وہ رات کو اس سے بھی زیادہ دیر ہو جانے کے باوجود گاڑی لے کر کسی کام سے نکل سکتی تھی۔ ان کا ڈرائیور رات آٹھ بجے تک چلا جاتا تھا۔ اس ڈرائیور کو وقار نے درحقیقت گھر کے کاموں کے لیے ہی رکھا ہوا تھا اور نہ وہ اور علیزے زیادہ تر اپنی اپنی گاڑی خود ہی چلاتے تھے لیکن رات کے وقت گاڑی لے کر کہیں جانے کی ضرورت علیزے کو شاذ و نادر ہی پیش آتی تھی۔ آج ایسا ہی موقع آ گیا تھا۔ بچوں کی بے پناہ ضد کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے اس نے ہامی بھر لی کہ وہ ان کے لیے ڈونٹس لے آئے گی۔

یہ بات وقار کو بتانے کے لیے وہ بچوں کے کمرے سے باہر آئی۔ وقار اسٹڈی میں بڑے انہماک سے کمپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا۔ وہ اکثر دفتر کا کام بھی گھر میں کرتا تھا۔

علیزے نے ایک نظر کمپیوٹر اسکرین پر ڈالی......

وقار گرافک ڈیزائننگ کر رہا تھا۔ اسکرین پر ایک بہت دلکش دوشیزہ نظر آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک پستول سے کرنوں کی صورت میں نئے سال کی مبارک باد کے الفاظ '2021ء' کی صورت میں نمودار ہو رہے تھے۔ مجموعی طور پر یہ ایک خوب صورت نظارہ تھا۔

علیزے کو یکدم یاد آیا کہ وہ وقار کے پاس کام سے آئی تھی اور دلکش سے ٹائٹل میں کھو گئی تھی۔

''وقار میں بچوں کے لیے ڈونٹس لینے ذرا شاپنگ مال تک جارہی ہوں۔'' اس نے اسٹڈی کے دروازے پر کھڑے ہوکر وقار کو اطلاع دی۔

''کیا کہا تم نے؟'' وقار نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اس کی طرف گردن موڑ کر پوچھا۔ نہ جانے اس نے واقعی علیزے کی بات نہیں سنی تھی یا اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ دونوں ہی امکانات کے بارے میں سوچتے ہوئے علیزے کو اپنی کنپٹیوں میں خون کی گردش تیز ہوتی محسوس ہوئی۔ قدرے تیکھے لہجے میں اس نے اپنی بات دہرائی۔

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟'' وقار کے لہجے میں بھی سخت ناگواری تھی اور چہرے پر بھی۔ ''یہ وقت ہے شاپنگ مال جانے کا؟''

''وقت تو کچھ ایسا زیادہ نہیں ہوا ہے۔ ساڑھے نو ہی تو بجے ہیں۔'' علیزے نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے رسان سے جواب دیا۔ تاہم اس کی کنپٹیوں میں خون کی گردش کچھ اور تیز ہو رہی تھی۔ وہ پوری کوشش کررہی تھی کہ اس کے لہجے میں اس کا اثر نہ آنے پائے۔

''موسم ٹھیک نہیں ہے۔ باہر سناٹا ہونے لگا ہوگا۔'' وقار نے خیال ظاہر کیا۔ اس کے چہرے پر سخت ناگواری کے تاثرات صاف دیکھے جاسکتے تھے۔

علیزے کہنا چاہتی تھی۔ ''موسم ایسا بھی نہیں کہ لاہور کے لوگ تمہاری طرح گھر میں دُبک کر بیٹھ جائیں۔'' لیکن اس نے یہ بات کہتے وقت ''تمہاری طرح'' کے الفاظ جملے میں سے حذف کردیے۔ وہ بِرُدست احتیاط کررہی تھی۔ بات بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

''بعض لوگ تو ایسے موسم میں خاص طور پر باہر نکلتے ہیں۔'' علیزے نے نہایت لطیف انداز میں وقار کو اس کی خشک مزاجی کا احساس دلانا چاہا۔

''لوگ تو نہ جانے کیا کچھ کرتے ہیں......'' وقار کے چہرے پر ناگواری کی علامتیں گہری ہوگئیں۔ ''بہرحال، میرے خیال میں اس وقت اکیلی عورت کا باہر جانا مناسب نہیں۔ شاپنگ مال اچھا خاصا دور ہے۔ اس وقت تو شاید وہ بند ہوچکا ہوگا۔''

''نہیں، وہ گیارہ بجے بند ہوتا ہے۔ انہوں نے خصوصی اجازت نامہ لیا ہوا ہے۔'' علیزے نے اسے مطلع کیا۔ کاروباری معاملات کے سوا باقی تقریباً تمام معاملات میں علیزے کی معلومات وقار سے زیادہ تھیں۔

''پھر بھی...... میرے خیال میں اس وقت اکیلی عورت کو وہاں نہیں جانا چاہیے۔'' وقار کے لہجے میں سختی در آئی۔

''تو پھر تم ساتھ چلو۔'' علیزے نے اطمینان سے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا یہ کہنا گویا وقار کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کے مترادف تھا۔

''میں اتنا گدھا نہیں ہوں کہ ایک بیکار کام کے لیے ایک انتہائی اہم کام چھوڑ کر، اٹھ کر چل دوں۔'' وقار گویا بمشکل اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ''مجھے گیارہ بجے تک یہ ضروری گرافکس تیار کرکے...... ای میل کرنے ہیں۔ وہاں ان کا انتظار ہورہا ہے۔''

''تمہاری نظر میں یہ بیکار کام ہوگا، میری نظر میں نہیں ہے۔ تمہیں تو اندازہ نہیں ہے کہ بچے کس طرح ضد کررہے ہیں۔'' علیزے کے لہجے میں تیکھا پن تھا۔

''بچے تو ضد کرتے ہی ہیں...... خاص طور پر ہمارے بچے...... ضروری نہیں ہوتا کہ ان کی ہر ضد پوری کی جائے۔'' وقار کے لہجے میں اب اچھا خاصا غصہ تھا۔ وہ تو کئی بار یہ بھی کہہ چکا تھا کہ بچوں کو ضدی علیزے نے ہی بنایا تھا اور اس کا بے جا لاڈ پیار بچوں کو بگاڑ رہا تھا۔

علیزے کی کنپٹیوں کی تپن بڑھتی جارہی تھی۔

''یہ ضد نہیں، بچوں کی چھوٹی چھوٹی معصوم خواہشیں ہوتی ہیں، جنہیں بیدردی سے رد کردیا جائے تو ان کے ننھے ذہنوں میں نہ جانے کیسی کیسی گرہیں پڑ جاتی ہیں جو آگے چل کر ان کی شخصیت کا سارا توازن بگاڑ سکتی ہیں۔'' بعض معاملات پر بات کرتے وقت علیزے کا لہجہ اسی طرح عالمانہ ہوجاتا تھا۔

''مجھے معلوم ہے، سگمنڈ فرائڈ کی خالہ جان! لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ کس وقت بچوں کی کون سی ضد مانی جاسکتی ہے اور کس وقت کون سی ضد نہیں ماننی چاہیے۔'' وقار کے لہجے سے اب اس کے غصے اور ناگواری کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

''تمہیں بس اسی قسم کی باتیں کرنا آتی ہیں۔ بچوں کی پرورش میں کوئی پازیٹو رول پلے کرنا تمہارے بس کی بات نہیں۔'' علیزے نے بھی اچھی خاصی ناگواری اور غصے سے جواب دیا۔ اس نے جان بوجھ کر اسٹڈی کا دروازہ ذرا زور سے بند کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر، لاؤنج عبور کرکے پورچ کی طرف چل دی۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید وقار اس کے پیچھے آئے لیکن وہ نہیں آیا۔

چوکیدار نے اس کے لیے گیٹ کھولا اور اس نے تیزی سے اپنی ایس یو وی، ریورس گیئر میں باہر نکالی۔ پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ ادھر اُدھر دیکھے بغیر کچھ زیادہ ہی تیزی سے سڑک تک آ گئی تھی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ سڑک پر اس وقت گاڑیوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی، ورنہ کوئی ناخوشگوار صورتِ حال بھی پیدا ہوسکتی تھی، کوئی حادثہ بھی ہوسکتا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ یہ اس کی کنپٹیوں میں بڑھتی ہوئی تپش کا نتیجہ تھا۔ اس نے گاڑی سڑک کے کنارے، کچی جگہ میں لاکر، چند لمحے کے لیے وہیں رک کر دو تین گہری گہری سانسیں لے کر اپنے اعصاب پر قابو پایا پھر پُرسکون انداز میں گاڑی آگے بڑھائی۔ باہر فضا میں عجیب، دھندسی پھیلی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اسٹریٹ لائٹس بھی دھندلی دھندلی سی دکھائی دے رہی تھیں اور ان کی روشنی بھی، نہ ہونے کے برابر تھی۔

چند منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ مین مارکیٹ کے قریب اس سب سے بڑے شاپنگ مال پہنچ گئی جو رات کو دیر تک کھلا رہتا تھا۔ اسے راستے میں ٹریفک بہت کم نظر آیا تھا اس لیے اس کا خیال تھا کہ شاپنگ مال میں بھی لوگ ذرا کم ہی ہوں گے لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پارکنگ لاٹ، جو بے حد وسیع تھی، کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اسے اندر گھسنے کے لیے بھی راستہ بڑی مشکل سے ملا۔ وہ پارکنگ لاٹ کے ''کنارے کنارے'' تنگ سے راستے پر دھیرے دھیرے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے، گاڑیوں کے اوپر سے دور تک دیکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ اگر کہیں گاڑی پارک کرنے کی جگہ ہوتی تو اسے اندازہ ہو سکتا تھا۔

جب وہ پارکنگ لاٹ میں آگے کی طرف، گاڑیوں کی سب سے پچھلی قطار کے قریب پہنچنے والی تھی تو اسے اندازہ ہوا کہ ایک جگہ شاید آسانی سے گاڑی پارک کرنے کی گنجائش تھی۔ وہ دل میں ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتے ہوئے مہارت سے گاڑی آگے بڑھاتی چلی گئی۔ دل ہی دل میں وہ دعا کر رہی تھی کہ دوسری طرف سے کوئی اور گاڑی اس سے پہلے اس خالی جگہ تک نہ پہنچ جائے۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہاں پہنچ کر وہ گاڑی ریورس کر کے آسانی سے اس جگہ پارک کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

وہاں پہنچ کر وہ بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گئی جس میں اس کی جھنجلاہٹ اور غصہ بھی شامل تھا۔ پارکنگ کی جگہ تو موجود تھی لیکن اسے بڑی سی ایک سیاہ گاڑی نے ''خراب'' کیا ہوا تھا۔ وہ گاڑی کچھ ایسے بے ڈھنگے طریقے سے، آڑی ٹیڑھی کھڑی ہوئی تھی کہ اس نے کم از کم تین گاڑیوں کی جگہ گھیری ہوئی تھی۔ اگر اسے ذرا طریقے سلیقے سے پارک کیا گیا ہوتا تو وہاں مزید دو گاڑیاں آسانی سے کھڑی ہوسکتی تھیں۔ علیزے چند لمحے گاڑی روکے، دونوں بازو اسٹیئرنگ وہیل پر ٹکائے، نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اس سیاہ گاڑی کو گھورتی رہی۔ ایک پول پر لگی ہوئی لائٹ سے کچھ روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔

گاڑی میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا اور جب وہ وہاں پہنچی ہوگی تو شاید پارکنگ لاٹ میں بہت زیادہ جگہ خالی پڑی ہوگی، اس لیے اسے اس طرح بے پروائی سے آڑے ترچھے انداز میں کھڑا کر دیا گیا تھا لیکن علیزے کے خیال میں، خواہ پوری پارکنگ لاٹ خالی پڑی ہوتی، تب بھی کسی کو اس طرح گاڑی کھڑی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ انتہائی بے پروا، بے حس بلکہ جنگلی ہونے کی نشانی تھی۔ علیزے کو اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ جو جگہ میسر تھی، اسی میں گاڑی پارک کرنے کی کوشش کرے۔ وہ ایک ماہر اور مشاق ڈرائیور تھی۔ اس نے گاڑی تھوڑی آگے اور تھوڑی پیچھے کر کے، اتنی جگہ میں پارک کر دی جتنی میسر تھی۔ اس کی گاڑی کا بونٹ دائیں بائیں کھڑی گاڑیوں سے ذرا آگے نکلا ہوا تھا۔ یہ گویا پارکنگ کے ''آداب'' کی تھوڑی کی خلاف ورزی تھی۔ اس سے چند گاڑی والوں کو اپنی گاڑیاں نکالنے میں کچھ دشواری پیش آسکتی تھی لیکن علیزے نے یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لی کہ وہ لوگ اگر ذرا بھی گردوپیش پر نظر ڈالیں گے تو اس کی مجبوری کو سمجھ جائیں گے۔

اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور گاڑی سے اُتر آئی۔ ریموٹ سے گاڑی لاک کرنے کے بعد اس نے ذرا قریب جا کر سیاہ گاڑی کا جائزہ لیا۔ وہ ٹویوٹا کا چند سال پرانا مگر خاصا مہنگا ماڈل تھا۔ بڑی اور پُرتعیش گاڑی تھی لیکن لگتا تھا کہ اسے گدھا گاڑی سے بھی زیادہ بُرے طریقے سے استعمال کیا جارہا تھا۔ اس پر کئی ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔ ایک بیک ویو مرر ٹوٹ کر تاروں کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔ بیشتر حصہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ نمبر پلیٹ بھی کیچڑ میں تقریباً چھپی ہوئی تھی لیکن علیزے نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ وہ ایک دوسرے صوبے کی نمبر پلیٹ تھی لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی، شہر میں ہر صوبے کی نمبر پلیٹ والی گاڑیاں نظر آتی رہتی تھیں۔

گاڑی کا سرسری جائزہ لیتے وقت ایک بار پھر علیزے کے دل میں غصے اور جھنجلاہٹ کی لہر اُبھری۔ تقریباً غیر ارادی سے انداز میں اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا، اپنی نوٹ بک اور بال پوائنٹ نکالا۔ نوٹ بک کو اسی گاڑی کے بونٹ پر ٹکا کر، ذرا جھک کر اس نے ایک صفحے پر چند سطریں گھسیٹیں۔ اس نے لکھا:

جنگلی پن اور بے حسی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ یہ گاڑی پارک کرنے کا کون سا انداز ہے؟ انسان کو صرف اپنی سہولت نہیں دیکھنی چاہیے، کبھی کبھی دوسروں کی تکلیف کے بارے میں بھی کچھ سوچ لینا چاہیے۔ میری خدا سے دعا ہے کہ وہ تمہارے اندر تھوڑی سی انسانیت بھی پیدا کر دے۔ فقط: ایک حساس شہری۔

اس نے نوٹ بک سے وہ ورق پھاڑا، اس کی کئی تہیں کیں اور اسے وائپر کے نیچے پھنسا دیا۔ بوندا باندی ابھی جاری تھی لیکن علیزے کو اُمید تھی کہ خاصی دیر تک کاغذ زیادہ نہیں بھیگے گا اور بہرحال، پڑھنے کے قابل رہے گا۔ نوٹ بک اور بال پوائنٹ واپس بیگ میں ڈال کر اس نے زپ بند کی اور سر اونچا کر کے نم آلود فضا میں ایک گہری سانس لی۔ اس کے دل و دماغ سے گویا کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس نے وہ چھوٹا سا رقعہ لکھ کر اپنے حق میں اچھا کیا تھا۔ اس کے دل کا غبار نکل گیا تھا ورنہ اسے نہ جانے کب تک غصہ آتا رہتا اور اس کا خون کھولتا رہتا۔

وہ مستعدی سے قدم اٹھاتی، شاپنگ مال کے سب سے بڑے دروازے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ وہ اس وقت ذرا ڈھیلے سے ٹراؤزر، آرام دہ اسپورٹس شرٹ اور جوگرز میں تھی۔ اسے احساس ہوا کہ غیر ارادی طور پر وہ ایسے حلیے میں نکل آئی تھی جو موسم اور موقع محل کے اعتبار سے موزوں تھا۔ اگر بارش تیز ہو جاتی اور اسے کھلی جگہ میں چلنا پڑتا تب بھی اپنے لباس اور جوتوں کی وجہ سے اسے شاید کوئی اُلجھن یا دشواری محسوس نہ ہوتی۔

شاپنگ مال میں خوب رونق تھی۔ ہر فلور پر اچھا خاصا شور تھا۔ بہت سے لوگ بچوں کو بھی ساتھ لے کر آئے ہوئے تھے جیسے شاپنگ کے لیے نہیں بلکہ سیر و تفریح کے لیے نکلے ہوں۔ باہر کی خاموش فضا اور اندر کی گہما گہمی کی وجہ سے علیزے کو کچھ یوں لگا جیسے وہ یک دم ہی ایک دنیا سے کسی دوسری اور قطعی مختلف دنیا میں آ گئی ہو۔ شیشے کے در و دیوار والی مختلف دکانیں رنگارنگ روشنیوں سے جگمگا رہی تھیں۔ وہ اس ماحول میں پہنچی تو گویا بھول ہی گئی کہ وہ یہاں صرف ڈونٹس خریدنے کے لیے آئی تھی۔ کافی دیر تک وہ مختلف دکانوں کا جائزہ لیتی رہی اور اس دوران اس نے کئی دوسری چیزیں خرید ڈالیں جن کے بارے میں وہ بھولی ہوئی تھی کہ اسے ان کی ضرورت ہے۔ ڈونٹس کی دکان پر وہ سب سے آخر میں گئی۔ اس کے لیے اسے برقی سیڑھیوں کے ذریعے تھرڈ فلور پر جانا پڑا۔

آخرکار وہ شاپنگ مال سے باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا شاپر تھا جس کے اندر تین چار چھوٹے شاپر تھے۔ اس مختصر سی شاپنگ نے اسے کچھ تازہ دم کر دیا تھا۔ اس بات پر اسے خود اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ گھر سے روانہ ہوتے وقت اس کی وقار سے ایک قسم کی نوک جھوک ہوئی تھی لیکن شاپنگ مال میں اس نے وقار کے لیے اس کی پسندیدہ پرفیوم خرید لی تھی۔ وہ کافی دنوں سے وقار کو یہ پرفیوم تحفے کے طور پر دینا چاہ رہی تھی لیکن خریدنا یاد ہی نہیں رہتا تھا۔ آج شاپنگ مال میں، پہلے کچھ دیر کے لیے ونڈو شاپنگ کرنے کے دوران اس پر نظر پڑ گئی تھی تو علیزے نے اسے خریدنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ تو آخر میں اپنے لیے جوتے بھی خریدنے لگی تھی لیکن پھر اسے احساس ہوا تھا کہ اسے گھر واپس جانے میں دیر ہو رہی تھی۔ اسے اندیشہ محسوس ہوا کہ بچے کہیں ڈونٹس کا انتظار کرتے کرتے سو ہی نہ جائیں۔ ویسے بھی اس کے پاس جوتوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔

باہر آتے ہی اسے ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ شاپنگ مال کے اندر کی فضا میں حرارت تھی۔ درجہ حرارت کے اس فرق نے علیزے کو جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا لیکن اسے امید تھی کہ گاڑی میں بیٹھتے ہی سردی کا احساس ختم ہو جائے گا۔ تیز تیز قدموں سے خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ گاڑی تک پہنچی تو غیر ارادی طور پر اس سیاہ ٹویوٹا کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ اب بھی اسی طرح کھڑی تھی لیکن اس میں اب بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا البتہ علیزے کی گاڑی کے برابر سے ایک گاڑی رخصت ہو چکی تھی جس کی وجہ سے کچھ جگہ خالی ہو گئی تھی۔

علیزے کو نہ جانے کیوں سیاہ گاڑی میں کسی خفیف سی تبدیلی کا احساس ہوا لیکن اسے پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ تبدیلی کیا تھی۔ گاڑی اب بھی خالی تھی اور بالکل اسی طرح کھڑی تھی جس طرح علیزے نے شاپنگ مال کی طرف جاتے وقت اسے دیکھا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر گاڑی کے

ذرا قریب چلی گئی اور تب اچانک ہی اسے پتا چلا کہ وہ معمولی سی تبدیلی کیا تھی جو اس کی نظر میں کھٹک رہی تھی۔ دراصل کاغذ کا وہ تہ شدہ ٹکڑا غائب ہو چکا تھا جو وہ وائپر کے نیچے پھنسا کر گئی تھی۔ پہلے اسے خیال آیا کہ شاید وہ بارش میں بھیگ کر اور سکڑ کر وائپر کے نیچے سے پھسل گیا ہو لیکن وہ علیزے کو شیشے کے بالکل نچلی طرف بھی کہیں نظر نہ آیا۔ گاڑی کے شیشے پر بارش کا پانی اب ٹیڑھی میڑھی دھاروں کی صورت میں پھسلتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے جھک کر اِدھر اُدھر بھی دیکھا لیکن وہ کاغذ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ گاڑی میں، یا اس کے آس پاس اب بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا لیکن وہ کاغذ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ ایسا کاغذ بھی نہیں تھا کہ پانی میں تحلیل ہو جاتا۔

آخرکار اس نے سر جھٹکا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا۔ ”بھاڑ میں گیا وہ کاغذ، میرا پیغام گاڑی کے اس جنگلی مالک تک پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو، لیکن مجھے اب گھر پہنچنا چاہیے۔“

ابھی اس نے ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھول کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ گھرگھراہٹ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی گاڑی اور آس پاس کا کچھ حصہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ اس نے گردن موڑ کر ادھر دیکھا تو اس کی نظر غیر ارادی طور پر ہیڈ لائٹس پر پڑ گئی اور اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اسے گاڑی کا دروازہ کھلنے اور بند کرنے کی آواز نہیں آئی تھی لیکن گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی اور ہیڈ لائٹس بھی آن ہو گئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ جب اس نے اپنے رقعے کی تلاش میں گاڑی کا اور اس کے آس پاس کا جائزہ لیا تھا، اس وقت بھی کوئی گاڑی میں موجود تھا لیکن وہ علیزے کو نظر نہیں آیا تھا۔ شاید وہ سیٹ سے نیچے اُتر کر کسی طرح چھپا ہوا تھا...... لیکن کیوں؟

ابھی اسے اس سوال کا ہی کوئی جواب نہیں ملا تھا کہ بڑی سی سیاہ گاڑی کسی عفریت کی طرح حرکت میں آئی، پہلے تھوڑی سی پیچھے ہوئی پھر ذرا سی گھوم کر علیزے کی گاڑی کے برابر میں خالی ہونے والی جگہ میں اس طرح گھس گئی کہ علیزے کی گاڑی سے جڑ گئی۔ اگر اب علیزے اپنی گاڑی آگے بڑھا کر پارکنگ سے نکلنے کے لیے دائیں یا بائیں کسی طرف بھی موڑتی تو اس کی گاڑی دونوں طرف کی کسی ایک گاڑی سے ٹکراتے ہوئے بہت بُری طرح رگڑ کھاتی۔ اسی اثنا میں علیزے نے اپنے آس پاس تین ہیولے نمودار ہوتے دیکھے۔ کافی فاصلے پر موجود لیمپ پوسٹ سے آتی ہوئی دھندلی سی روشنی میں علیزے نے دیکھا، وہ تینوں نوجوان تھے۔

ان کی شخصیت ایک دوسرے سے کافی مختلف تھی لیکن بہت سی باتیں تینوں میں مشترک تھیں۔ تینوں کی عمریں بیس سے پچیس سال کے درمیان تھیں۔ تینوں کا ڈیل ڈول کچھ خاص نہیں تھا لیکن تینوں کے چہروں پر ایک عجیب خباثت آمیز قسم کی پختگی اور کرختگی تھی۔ ایک کے کان میں کسی دھات کا چھلا بھی تھا۔ بالوں کی تراش خراش عجیب اور لباس بے ہنگم تھے۔ ان میں سے ایک سرخ رنگ کی ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ اور شکن آلود ٹراؤزر میں تھا جس پر بڑی بڑی جیبیں نظر آرہی تھیں۔ ایک کی شرٹ بنیان نما تھی۔ اس کے نیچے پرانی سی تنگ جینز تھی۔ تیسرا سیاہ شلوار قمیص میں تھا جو شاید ریڈی میڈ اور کسی اچھی کمپنی کی تھی لیکن اس کے جسم پر ڈھیلی ڈھالی تھی اور وہ شاید اس شلوار سوٹ کو کئی دن سے پہنے ہوئے تھا۔ ان کے علاوہ ایک شخص سیاہ گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ تعداد میں کم از کم چار تھے۔ علیزے کے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی جس کی وجہ سرد موسم ہرگز نہیں تھا۔

پھر گاڑی میں سے چوتھا شخص بھی اُتر آیا لیکن گاڑی، اسٹارٹ اور ہیڈ لائٹس روشن ہی رہیں۔ گاڑی سے اترنے والا بھی نوجوان ہی تھا لیکن وہ ذرا بھاری جسم کا تھا۔ وہ ڈینم کی پرانی سی شرٹ اور اسی قسم کی جینز میں تھا جسے فیشن کے طور پر دو تین جگہوں سے پھاڑ دیا جاتا ہے۔ وہ دیگر تینوں نوجوانوں کی نسبت گورا چٹا تھا لیکن اس کے چہرے پر بھی خباثت کی کمی نہیں تھی اور اس کا شیو بھی اس کے ساتھیوں کی طرح بڑھا ہوا تھا۔ وہ چاروں کچھ اس طرح آن کھڑے ہوئے تھے کہ علیزے اور اس کی گاڑی گویا ان کے نرغے میں آگئی تھی۔ گاڑی سے اُترنے والے کے سر پر سرخ پی کیپ تھی جسے اس نے دو تین مرتبہ بڑی ادا سے اِدھر اُدھر گھمایا۔ شاید اپنی دانست میں وہ اسٹائل دکھا رہا تھا۔

”بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے پاس پسٹل ہے۔“ سرخ شرٹ اور ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر والے نے بیٹھی بیٹھی اور کچھ عجیب سی آواز میں کہا۔

وہ منحنی سا نوجوان تھا لیکن سخت جان دکھائی دیتا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آواز کم از کم کسی خاتون کو خوف زدہ

کر دینے والی تھی۔ علیزے کو اس کے ہاتھ میں پسٹل نظر تو نہیں آیا لیکن اس کا ایک ہاتھ اپنے ٹراؤزر کی بڑی سی جیب میں تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ جیب میں چھپے ہوئے اس ہاتھ میں پسٹل موجود ہو۔ علیزے دم بخود کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا تھا۔ وہ یک دم خوف زدہ تو ہو گئی لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس خوف کی تہ میں کہیں غصہ بھی اُبل رہا تھا۔ لہو اس کی کنپٹیوں میں گویا ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کے چہرے سے ذرا بھی خوف کا اظہار نہ ہونے پائے۔ اس کا خوف زدہ نظر آنا ایسے بدمعاش قسم کے نوجوانوں کو اور بھی شیر بنا سکتا تھا۔

''یہ تم لوگ کیا کر رہے ہو؟ یہ گاڑی تم نے اس طرح کیوں پھنسائی ہے؟'' اس نے سیاہ گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حتی الامکان بے خوفی سے کہا۔ اس احساس سے اسے خوشی ہوئی کہ اس کی آواز میں کپکپاہٹ نہیں تھی، حالانکہ اندر ہی اندر وہ کانپ رہی تھی۔

''ہم گاڑیاں نہیں پھنساتے... ہم تو لڑکیاں پھنساتے ہیں۔'' پسٹل کی دھمکی دینے والے سوکھے سے نوجوان نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا، جس پر اس کے ساتھیوں نے یوں ہم آہنگ ہو کر زوردار قہقہہ لگایا جیسے اس نے کوئی بہت عمدہ لطیفہ سنایا ہو۔

باہر کے سناٹے میں ان کے قہقہے کی آواز بڑی بھیانک محسوس ہوئی۔ باہر بارش کی مدھم سی ٹپ ٹپ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بھیگے ہوئے ماحول کا سناٹا بھی نہ جانے کیوں یکا یک بے حد خوفناک محسوس ہونے لگا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے، تھوڑے ہی فاصلے پر جب علیزے شاپنگ مال کے اندر تھی تو وہاں گویا زندگی کی رونقیں اور ہلا گلا تھا لیکن یہاں، باہر اسے قبرستان کا سا سناٹا محسوس ہونے لگا تھا۔ موٹی موٹی، شیشے کی دیواروں نے گویا اندر اور باہر کے ماحول کو دو الگ دنیاؤں میں تقسیم کر دیا تھا۔

''تم لوگوں کی اوقات کہاں ہے لڑکیاں پھنسانے کی......'' بے اختیار علیزے کے منہ سے نکل گیا۔ ''تم تو اصل میں لڑکیوں کو ڈراتے ہو گے اور سمجھتے ہو گے کہ لڑکیاں پھنس رہی ہیں۔''

الفاظ غیر ارادی طور پر علیزے کے منہ سے نکل تو گئے لیکن اسے خود بھی احساس ہوا کہ اس نے یہ بات قطعی غیر ضروری طور پر کی تھی۔ اس کے الفاظ ان اوباشوں اور بدمعاشوں کی انا مجروح کر سکتے تھے جن کے ارادے پہلے ہی کچھ اچھے نظر نہیں آرہے تھے۔ علیزے کے شوہر وقار کو بھی اس سے یہی شکایت تھی کہ وہ اکثر کوئی نہ کوئی غیر ضروری بات کرتی تھی یا اکثر باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیتی تھی۔ کبھی کسی بات پر خاموش نہیں رہتی تھی۔ وقار کے خیال میں یہ ایک بُری عادت تھی اور ان کے درمیان اکثر جھگڑے اسی وجہ سے ہوتے تھے لیکن ساتھ ہی وقار کا یہ بھی کہنا تھا کہ یہ کوئی ایسی انوکھی بات بھی نہیں تھی، اکثر خواتین میں...... یا یوں کہنا چاہیے کہ اکثر بیویوں میں یہ عادت ہوتی تھی۔

علیزے نے محسوس کر لیا کہ ان چاروں کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں، چہروں کے عضلات جو پہلے ہی کچھ کھنچے ہوئے سے تھے، ان کی کھچاوٹ اور کرختگی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ ان چاروں کا تعلق مختلف علاقوں سے معلوم ہوتا تھا جس کا اندازہ ان کے لہجوں سے بھی ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ چاروں اکٹھے کیسے ہو گئے تھے۔

''تیز چیز معلوم ہوتی ہے خبیث کی بچی!'' پسٹل کی دھمکی دینے والے نے گورے چٹے اور قدرے بھاری سے نوجوان کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کا لہجہ کچھ اور خوف زدہ کر دینے والا محسوس ہونے لگا۔

گورے نوجوان نے تائیدی انداز میں سر ہلایا اور ذرا سرسری سے لہجے میں بولا۔ ''ہیروئن بننے کی کوشش کر رہی ہے۔'' جملے کا اختتام اس نے ایک موٹی سی گالی پر کیا تھا جسے سن کر علیزے کی کنپٹیوں میں ٹھوکریں مارتے ہوئے لہو کی گردش کچھ اور تیز ہو گئی۔ وہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو مزید غصے میں آنے سے روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے قدرے جھنجلاہٹ بھی محسوس ہو رہی تھی کہ گھر جاتے جاتے قطعی غیر متوقع طور پر یہ کیا مصیبت راستے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آرہا تھا کہ وقار نے اسے اس وقت اکیلے باہر جانے سے منع کیا تھا۔ اس کے خیال میں موسم اور وقت، اکیلی عورت کے، باہر جانے کے لیے مناسب نہیں تھا جبکہ علیزے کے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ خود کو اپنی حفاظت کرنے کا اہل سمجھتی تھی لیکن یہ بات کبھی اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی تھی کہ برسات کی ایک رات میں، شہر کے پوش علاقے کے ایک شاندار اور طویل و عریض شاپنگ مال کے سامنے چار بدمعاش اور خطرناک قسم کے نوجوان اسے گھیر لیں گے۔

علیزے نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ سوکھے سڑے سانولے نوجوان کے پاس

پسٹل وغیرہ کچھ نہیں تھا، وہ خواہ مخواہ اسے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ علیزے نے بے خوفی کے اظہار کے لیے اسے غصے سے گھورا پھر شلوار قمیص والے نوجوان کو اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تو ہیروئن بننے کا کوئی شوق نہیں ہے لیکن لگتا ہے، فلمیں دیکھ دیکھ کر تم لوگوں کے دماغ کافی خراب ہو چکے ہیں لیکن خیر...... فکر نہ کرو...... میرے شوہر اور بھائی بھی اندر سے یہاں آنے والے ہیں۔'' اس نے شاپنگ مال کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ آکر تم لوگوں کا دماغ ٹھیک کر دیں گے۔ انہیں تم جیسے لوگوں کا دماغ ٹھیک کرنا اچھی طرح آتا ہے۔''

علیزے کی اس بات سے وہ چاروں گویا بے حد محظوظ ہوئے۔ انہوں نے تقریباً ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔ ان کی آوازیں زیادہ بلند نہیں تھیں لیکن نہ جانے کیوں علیزے کے جسم میں ایک بار پھر سنسنی سی دوڑ گئی۔ شلوار سوٹ والا شاید اس کی بات سے کچھ زیادہ ہی محظوظ ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر بھوکی نظروں سے اس کا سرتاپا جائزہ لے کر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ ''ویسے کافی ہے ہوشیار...... ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اسے پتا ہی نہیں کہ ہم نے اسے آتے ہوئے دیکھا تھا...... اور یہ اکیلی آئی تھی۔''

گاڑی سے اتر کر آنے والے قدرے بھاری سے نوجوان نے ایک بار پھر ادا سے اپنی پی کیپ کو گھمایا اور مخمور سی آواز میں بولا۔ ''ہماری ہیروئن اکیلی آئی تھی اور اکیلی ہی چلی جاتی لیکن اس نے آکر ہمارا مزہ خراب کر دیا۔ ہم تو ایک کونے میں بیٹھ کر، چھپ کر، امن و سکون سے اپنا شغل میلہ کر رہے تھے......''

اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ علیزے نے اب دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں منرل واٹر کی بوتل تھی مگر اس میں منرل واٹر یقیناً نہیں تھا۔ پی کیپ والے نوجوان کے ہاتھ میں یہ بوتل نہ جانے کیوں علیزے کو پہلے نظر نہیں آئی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''فلموں میں ہیروئن آتی ہے تو مزہ دوبالا ہو جاتا ہے مگر ہماری ہیروئن نے آکر ہمارا سارا مزہ خراب کر دیا۔''

پسٹل کی دھمکی دینے والے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور کاغذ کا ایک مڑا تڑا، بھیگا ہوا ٹکڑا ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''ہاں...... بتاؤ بھلا، اسے کیا ضرورت تھی ہمیں نصیحتیں کرنے کی...... اور ہمیں جنگلی وغیرہ لکھنے کی...... ہم تو بچپن سے اماں ابا اور دوسرے بہت سارے بزرگوں کی نصیحتیں سن سن کر تنگ آئے ہوئے لوگ ہیں۔ دنیا میں خوار ہیں...... زندگی سے بیزار ہیں...... کم سے کم ایک خوب صورت لڑکی کو تو ہمارے بارے میں کوئی پیاری سی بات لکھنی چاہیے تھی۔'' اس نے غصیلے انداز میں کاغذ کی گولی سی بنا کر دور پھینک دی۔

علیزے کو یہ جاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا کہ غصے سے دور پھینکا جانے والا کاغذ اسی کا لکھا ہوا رقعہ تھا جسے وہ بڑی سی سیاہ گاڑی کے وائپر کے نیچے پھنسا کر گئی تھی اور کچھ دیر پہلے یہ سمجھ کر ڈھونڈ رہی تھی کہ شاید وہ ضائع ہو گیا ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ تو کچھ زیادہ ہی ''کارآمد'' ثابت ہو گیا تھا۔ جس وقت وہ رقعہ لکھ رہی تھی اور وائپر میں پھنسا رہی تھی، اس وقت وہ چاروں یقیناً کہیں چھپے ہوئے تھے اور اپنے ''شغل میلے'' میں لگے ہوئے تھے لیکن اس کی تمام حرکات و سکنات یقیناً دیکھ رہے تھے۔ علیزے کو اب اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔ بھلا کیا ضرورت تھی، اسے وہ رقعہ لکھنے کی؟ لیکن پھر اس کے اندر کوئی دوسری آواز ابھری کہ رقعے کا تو محض بہانہ تھا، جس قسم کے یہ لوگ نظر آرہے تھے، انہیں یہی حرکتیں کرنا ہوتی تھیں، جو وہ کر رہے تھے۔ تاہم ایک بار پھر علیزے کو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ وہ سوکھا سا لڑکا، جو ہاتھ پیچھے کیے کھڑا تھا، اس کے پاس پسٹل وغیرہ نہیں تھا۔ اس نے پسٹل کی صرف دھمکی دی تھی۔

علیزے نے ذرا بے خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا اور جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں اب تم لوگوں کی مزید بکواس نہیں سننا چاہتی۔ میں جا رہی ہوں۔ تم لوگ گاڑی ذرا پیچھے کرو۔''

اس نے گاڑی اسٹارٹ بھی کر لی۔ کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے گاڑی ہٹانے کی جو ''درخواست'' کی تھی، اس پر کسی نے ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی۔ ان کی توجہ کسی اور طرف مبذول ہو چکی تھی۔ علیزے نے بھی اس طرف دیکھا اور اسے قدرے حوصلہ ہوا۔ دراصل شاپنگ مال کے دروازے پر کھڑا ہونے والا پرائیویٹ گارڈ ان کی طرف آرہا تھا۔ علیزے نے شاپنگ مال میں داخل ہوتے وقت بے توجہی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر، میانہ قامت آدمی تھا جس کے جسم پر گہرے نیلے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی سی وردی تھی جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اس نے اپنی نہیں۔ بلکہ

کسی اور کی وردی پہنی ہوئی تھی۔ جس وقت علیزے نے اسے دیکھا تھا، اس وقت وہ شاپنگ مال کے اندر جانے والوں کو چیک کرنے کے بجائے ایک طرف کرسی پر بیٹھا تقریباً اونگھ رہا تھا۔ اب اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر علیزے کو ذرا حوصلہ ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ جانے کی وجہ سے بھی اسے کسی حد تک تحفظ کا احساس ہوا تھا، گوکہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر ان بدمعاش قسم کے نوجوانوں نے اپنی گاڑی ذرا بھی پیچھے نہ کی تو وہ اپنی گاڑی کیسے نکالے گی؟ وہ اپنی قیمتی گاڑی پر بُری طرح رگڑ لگوانے اور خوفناک قسم کا ڈینٹ ڈلوانے کے لیے فی الحال تیار نہیں تھی۔

قریب آتے آتے گارڈ کا انداز کچھ ہچکچاہٹ آمیز سا ہو گیا تھا۔ علیزے گردن ترچھی کیے قدرے اُمید بھری نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گارڈ بہر حال قریب آگیا۔ وہ ان چاروں کا جائزہ لیتے ہوئے علیزے کی گاڑی کی ڈرائیونگ سائڈ پر آ گیا۔ علیزے نے یہ بھی دیکھ لیا کہ وہ چاروں کچھ ایسی نظروں سے گارڈ کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ سرکس کے تماشائی ہوں اور کوئی مسخرہ ان کے سامنے اپنے مزاحیہ کرتب دکھانے آرہا ہو۔

''لے بھئی کالے خان! ہیرو اپنی ہیروئن کو تجھ جیسے اُچکے ولن سے بچانے کے لیے آگیا ہے۔'' گورے چٹے نوجوان نے استہزائیہ لہجے میں اس سوکھے سے نوجوان کو مخاطب کیا جس نے اپنے پاس پسٹل کی موجودگی کا دعویٰ کیا تھا۔ اس کی رنگت گہری سانولی تھی۔ شاید اس لیے اس کے ساتھیوں نے اس کا نام کالے خان رکھا ہوا تھا۔ یہ اس کا اصل نام یقیناً نہیں تھا۔

سوکھا نوجوان قدرے خفگی سے بولا۔ ''میں نے تجھے کتنی مرتبہ منع کیا ہے فیکے ...... مجھے کالے خان مت بولا کرو۔ کسی دن میں تیرا منہ اپنے منہ سے بھی زیادہ کالا کر دوں گا۔''

گورا نوجوان، جسے فیکے کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، بے ڈھنگے پن سے ہنسا اور پچکار کر بولا۔ ''غم نہ کر میری جان! ہم اب تجھے وحید مراد کے نام سے پکارا کریں گے حالانکہ اس سے وحید مراد کی روح کو اور اس کے چاہنے والوں کے دلوں کو بہت صدمہ پہنچے گا لیکن تیری خوشی کی خاطر ہم ان کی پروا نہیں کریں گے۔ فی الحال تو اس دوسرے ہیرو کا کچھ کر......'' اس نے حقارت آمیز انداز میں گارڈ کی طرف اشارہ کیا۔

گارڈ کافی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے، نہایت غصے اور ناگواری سے باری، باری چاروں کا جائزہ لے چکا تھا۔ اس نے کسی کی بات کا جواب دیے بغیر علیزے کی گاڑی کی کھڑکی پر ذرا جھکتے ہوئے پوچھا۔ ''میڈم. کیا مسئلہ ہے؟ کیا یہ لوگ آپ کو پریشان کررہے ہیں؟''

علیزے نے اپنی کھڑکی کا شیشہ تھوڑا سا نیچے کرلیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے پاتی، شلوار قمیص والا میانہ قامت اور خبیث سی شکل والا نوجوان استہزائیہ انداز میں بول اٹھا۔ ''تم سے کس نے کہہ دیا کہ ہم میڈم کو پریشان کررہے ہیں؟ ہم تو ان کا دل بہلا رہے ہیں۔ ہم تو ان کا اور بھی زیادہ دل بہلانا چاہتے ہیں لیکن تم خواہ مخواہ آکر کباب میں ہڈی بن گئے ہو۔''

وہ لوگ شاید اس لیے بھی اطمینان سے بات کررہے تھے کہ انہیں علیزے کے وہاں سے نکل بھاگنے کا اندیشہ نہیں تھا۔ انہوں نے اس کی گاڑی کو اس طرح پھنسا لیا تھا کہ وہ اسے تھوڑا سا آگے تو بڑھا سکتی تھی لیکن موڑ نہیں سکتی تھی۔ آگے کچھ فاصلے پر، ایک پختہ منڈیر سی بنی ہوئی تھی جو اس طرف پارکنگ ایریا کی حد بندی کا کام دے رہی تھی۔ اگر اس طرف یہ رکاوٹ نہ ہوتی تو علیزے سیدھے رخ اس طرف سے گاڑی نکال کر، کھلی جگہ سے گزرتی ہوئی سامنے سڑک پر پہنچ سکتی تھی۔

اس سے پہلے کہ علیزے کوئی جواب دیتی، جس نوجوان کے کان میں دھات کا چھلا تھا، اس نے شلوار قمیص والے خبیث صورت سے نوجوان کو مخاطب کیا۔ ''اوئے شوخے! تو ہیروئن کا دل نہ بہلا...... یہ جو ہیرو اس کی مدد کے لیے آیا ہے، اس کا کچھ کر...... اس کی بیلٹ میں تو گن بھی لٹکی ہوئی ہے۔''

گارڈ کا ہاتھ غیر ارادی سے انداز میں اپنی گن کے ہولسٹر پر چلا گیا۔ ہولسٹر بغیر فلیپ والا تھا۔ گارڈ چاہتا تو ایک لمحے میں گن نکال سکتا تھا۔ وہ پسٹل سے کچھ بڑے سائز کی گن معلوم ہوتی تھی۔

شکن آلود شلوار قمیص والا، جسے ''شوخے'' کی عرفیت سے مخاطب کیا گیا تھا، حقارت آمیز انداز میں دھیرے سے ہنسا اور بولا۔ ''ان بے چاروں کی گن کی کیا بات کرتا ہے ڈبو! ان کی گن میں تو اکثر گولیاں بھی نہیں ہوتیں۔ ان بے چاروں کو تو ایسے ہی، بس شریف شرفا قسم کے لوگوں کو ڈرانے کے لیے کھڑا کردیا جاتا ہے۔ یاد ہے، سکھر میں ہم نے بینک کے جس گارڈ کو گولی ماری تھی اور اس

کا ماؤزر چھینا تھا...... وہ ماؤزر خالی تھا۔ ایک بھی گولی نہیں تھی اس میں۔''

گارڈ گویا ان کی باتیں اب سُن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ سوالیہ سے انداز میں علیزے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ علیزے نے سیاہ گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حتی الامکان تحمل سے کہا۔ ''ان لوگوں سے کہو، اپنی گاڑی ذرا پیچھے کرلیں۔ بس...... مجھے اور کوئی پریشانی نہیں ہے۔''

''سُن لیا آپ لوگوں نے؟'' گارڈ نے باری، باری چاروں نوجوانوں کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی ایسا خاص پڑھا لکھا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن تمیز اور شائستگی سے بات کررہا تھا۔ اس کا ہاتھ اب گن پر تھا اور اس نے گن ہولسٹر سے تقریباً باہر نکال لی تھی لیکن اس کا رخ کسی کی طرف نہیں کیا تھا۔ چاروں بدمعاش قسم کے نوجوانوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان سب کے چہروں پر خباثت بھری مسکراہٹ تھی اور وہ یوں ایک ٹک گارڈ کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ ان کے سامنے کوئی دلچسپ تماشا پیش کررہا ہو۔

''کیا تم لوگوں کا گاڑی ہٹانے کا کوئی ارادہ نہیں؟'' گارڈ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ اس کی گن اب ہولسٹر سے پوری طرح باہر آگئی تھی لیکن اس کا رخ زمین کی طرف ہی تھا۔

''ہم جب گاڑی ایک بار آگے بڑھا لیتے ہیں تو پھر پیچھے نہیں ہٹاتے چن ماہی۔'' جینز اور سرخ پی کیپ والے گورے چٹے نوجوان نے جواب دیا۔ علیزے نے اسے گاڑی سے اُتر کر آتے دیکھا۔

علیزے یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ گارڈ کی گن میں گولیاں تھیں یا نہیں لیکن اس نے بہرحال گن اونچی کرنے کے لیے ہاتھ کو حرکت دی تھی۔ عین اسی لمحے، سوکھے سے سانولے نوجوان کا ہاتھ اس کی پشت سے ہٹ کر پلک جھپکتے میں سامنے آگیا اور تب علیزے کو معلوم ہوا کہ وہ اپنے پاس پسٹل موجود ہونے کا جو دعویٰ کررہا تھا، وہ غلط نہیں تھا، اس کے ہاتھ میں سچ مچ پسٹل موجود تھا۔ اس نے گارڈ کو گن والا ہاتھ اونچا کرنے کا بھی موقع نہیں دیا اور بلا تامل فائر کردیا۔ فائر کی گونج سے فضا مرتعش ہوکر رہ گئی لیکن کسی طرف سے کوئی ردِعمل دیکھنے میں نہ آیا۔

گولی گارڈ کی پیشانی میں لگی تھی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ پیچھے کو گرا اور ایک گاڑی کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا زمین پر بیٹھ گیا۔ اگر اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی نہ ہوتیں اور چہرہ خون میں تر نہ ہوتا تو یہی لگتا جیسے کوئی آدمی تھک ہار کر، گاڑی سے ٹیک لگا کر ستانے کے لیے بیٹھ گیا ہو۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کبھی وہ کسی انسان کو یوں اپنی آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھے گی۔ ایک لمحے کے لیے تو علیزے کا ذہن سُن ہوکر رہ گیا۔ اسے گویا یاد ہی نہ رہا کہ وہ کہاں تھی اور کیا کرنے وہاں آئی تھی۔ سوکھے سے سانولے نوجوان نے ایک فائر پر اکتفا نہیں کیا۔ اس نے دوسرا فائر کیا۔ اس بار گولی گارڈ کی آنکھ میں لگی۔ اس کی آنکھ غائب ہوگئی۔ پھٹی پھٹی دوسری آنکھ اس کے خون آلود چہرے پر یکایک ہی بہت ڈراؤنی معلوم ہونے لگی۔ سانولا نوجوان جسے کالے خان کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا، اسے شاید دو فائر کرکے بھی اطمینان نہ ہوا۔ اس نے تیسرا فائر بھی کیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نشانے بازی کی مشق کررہا تھا۔ تیسرے فائر سے گارڈ کے ہونٹ تقریباً غائب ہوگئے اور دانت ٹوٹ گئے۔ اس کا دہانہ خوفناک نظر آنے لگا۔

علیزے کو جھرجھری سی آگئی۔ اس کا ذہن جو اچانک سُن ہوگیا تھا، شاید اس جھرجھری کی وجہ سے یک دم بیدار ہوگیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کی حیثیت چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے جیسی تھی، اس کے باوجود اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ یہ نوجوان جنہیں وہ محض لفنگے اور چھوٹے موٹے ''وارداتیے'' سمجھ رہی تھی، اس کے اندازوں سے زیادہ سفاک، خطرناک اور بے خوف تھے۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سوکھے سے سانولے نوجوان نے گارڈ پر ایک فائر اور کردیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس پر نشانے بازی کی مشق کررہا ہو۔ گارڈ یقیناً پہلی ہی گولی سے مرچکا تھا کیونکہ وہ اس کی پیشانی میں لگی تھی۔ ''کالے'' نے اس پر مزید تین گولیاں تو ضائع ہی کی تھیں۔ شاید اسے ایک انسان پر گولیاں چلانے میں مزہ آرہا تھا۔

فیکے نے کالے کی توجہ علیزے کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ ''ابے کالے خان! اپنی ہیروئن کی بھی فکر کرلے۔ سالی کہیں بھاگ نہ جائے۔''

''بھاگے گی کیسے؟ چاروں طرف سے پھنسی ہوئی ہے۔'' کالا بے پروائی سے بولا۔ ''اور اگر بھاگے گی بھی...... تو ہم کیا سالے ایسے گئے گزرے ہیں جو اسے پکڑ بھی نہ سکیں؟ بھاگتے ہوئے شکار کو پکڑنے میں تو زیادہ مزہ آتا ہے۔ خاص طور پر جب شکار خوب صورت بھی ہو۔''

اس نے باقاعدہ چنخارا سالیا۔ تاہم اس کی نظر اب بھی گارڈ پر ہی تھی جس کا مردہ جسم اب گاڑی کے ساتھ رگڑ کھاتا ہوا، پہلو کے بل گر چکا تھا۔

علیزے کا ذہن یک لخت کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گیا تھا اور کسی الیکٹرانک آلے کی طرح کام کر رہا تھا۔ شاید یہ ایک قسم کی "شاک تھراپی" کا نتیجہ تھا۔ اس نے کسی ٹی وی پروگرام میں ایک ماہر نفسیات کو کہتے سنا تھا کہ بعض اوقات انسانی ذہن کو لگنے والا کوئی جھٹکا اس کی صلاحیتوں کو کئی گنا زیادہ تیز کرتا تھا۔ اسی امید پر پرانی طرز کے پاگل خانوں میں پاگلوں کو سر کی طرف بجلی کے جھٹکے لگائے جاتے تھے۔ علیزے نے ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں فیصلہ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چوہے کی طرح مارے جانے کی نسبت، اپنی سی جدوجہد کرنا بہتر تھا۔

اسے یاد آگیا تھا کہ اس کی گاڑی "فور وہیل ڈرائیو" تھی۔ اس نے گاڑی بالکل سیدھی آگے بڑھائی تھی، جس کی وجہ سے اس نے بڑی سی سیاہ ٹویوٹا کے ساتھ رگڑ نہیں کھائی۔ اس نے گاڑی کو دائیں یا بائیں موڑنے کی کوشش نہیں کی۔ آگے منڈیر نما چھوٹی سی دیوار تھی۔ ان چاروں کا خیال یہی ہوگا کہ اس طرف سے تو وہ کہیں نہیں جا سکتی تھی لیکن وہ گاڑی اسی طرف لے گئی تھی۔ جونہی اس کی گاڑی کے اگلے ٹائر منڈیر سے جا کر لگے، اس نے ایکسلریٹر پورا دبا دیا۔ اس نے آج تک اس گاڑی کی طاقت کو آزمایا نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ گاڑی منڈیر کو پھلانگ جائے گی یا نہیں، لیکن اس نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا تھا اور جس لمحے فیصلہ کیا تھا، اسی لمحے اس پر عمل کر ڈالا تھا۔

اسے یہ بھی اندیشہ تھا کہ گاڑی اگر منڈیر کو پھلانگ بھی گئی تو گاڑی کا نچلا حصہ منڈیر سے ٹکرا نہ جائے اور کوئی چیز ٹوٹ نہ جائے۔ تاہم وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔ اسے امید تھی کہ اس صورت میں بھی گاڑی اسے کچھ نہ کچھ دور تو لے ہی جائے گی۔ تب تک، شاید اسے مدد میسر آجائے۔ گاڑی نے اچھل کر منڈیر عبور کی تو اس کا دل بھی گویا اچھل کر حلق میں آگیا۔ گاڑی کے پچھلے وہیل نسبتاً آسانی سے منڈیر عبور کر گئے اور گاڑی کے نیچے سے کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز بھی نہیں آئی اور نہ ہی ایسا کوئی احساس ہوا۔ وہ تیزی سے گاڑی بھگاتی لے گئی۔ ہر لمحے اسے اندیشہ رہا کہ پیچھے سے گولی آئے گی اور عقبی شیشے کو توڑتی ہوئی شاید اس کی گردن یا سر میں پیوست ہو جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔

کوئی دھما کا سنائی نہیں دیا۔ اسے حیرت بھی ہوئی۔ اسے یہی امکان نظر آیا کہ اس کے اس طرح بھاگ نکلنے پر شاید وہ لوگ دم بخود رہ گئے تھے۔ حیرت کی شدت کے باعث شاید کالے کو فائر کرنا بھی یاد نہیں رہا تھا اور نہ اس کے پسٹل میں غالباً دو گولیاں تو باقی ہوں گی۔ یہ سوچتے کے دوران وہ کچا حصہ عبور کر کے سڑک تک پہنچ گئی۔ سڑک ذرا بلندی پر تھی لیکن کچی، گیلی زمین پر اس نے مہارت سے گاڑی چڑھالی۔ سڑک پر بھی بارش کی وجہ سے پھسلن تھی لیکن اس نے گاڑی کو پھسلنے سے بچائے رکھا۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ بدحواسی کو اپنے اوپر غالب نہ آنے دے۔

وہ ٹریفک کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے غیر ارادی سے انداز میں بائیں طرف مڑ گئی تھی۔ سڑک سنسان پڑی تھی اور اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی کی رسائی جہاں تک تھی، وہاں تک اسے آسمان سے برستا ہوا اور سڑک پر بہتا ہوا پانی دکھائی دے رہا تھا لیکن اسے احساس ہوا کہ ہر چیز اسے دھندلی دھندلی اور کچھ آڑی ٹیڑھی سی دکھائی دے رہی تھی۔ فوراً ہی اسے اس کی وجہ بھی سمجھ میں آگئی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے وائپر نہیں چلائے تھے۔ پانی کی دھاروں نے ونڈ اسکرین کو دھندلا رکھا تھا۔ اس نے وائپر چلائے تو سامنے کا منظر کافی صاف ہو گیا لیکن منظر تھا ہی کیا؟

اندھیرے کے دامن سے یکے بعد دیگرے اور وقفے وقفے سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوتی تھیں، درمیانی رفتار سے قریب آتی تھیں اور پھر سڑک کے دوسری طرف سے گزرتی چلی جاتی تھیں۔ علیزے کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ کسی گزرتی ہوئی گاڑی کے مسافروں سے مدد طلب کرنے کے لیے ان کے سامنے گاڑی لے جا کر روکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔ اس طرح حادثے کا خطرہ تھا اور پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر وہ محفوظ طریقے سے کسی گاڑی کو روکنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اس گاڑی سے نہ جانے کون لوگ برآمد ہو جائیں اور اس کے ساتھ وہی معاملہ ہو جائے کہ آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا۔

گزرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور خطرے کا احساس دلانے کا کوئی دوسرا طریقہ اس کی سمجھ

میں نہیں آ رہا تھا۔ خاص طور پر کوئی ایسا طریقہ جو ایک اکیلی عورت کے لیے واقعی فائدہ مند ثابت ہو سکتا۔ ابھی اسے یہ اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ بدمعاش نوجوان اس کے تعاقب میں آ رہے تھے یا نہیں؟ یہ امکان تو موجود تھا کہ ''کالے'' نے شاپنگ مال کے گارڈ پر جو فائر کیے تھے، ان کی آوازیں سُن کر اندر سے لوگ یا کوئی دوسرا گارڈ موقع پر پہنچ گیا ہو اور وہ خبیث نوجوان وہاں پھنس گئے ہوں۔ تاہم علیزے کو یہ امکان بے حد کمزور لگ رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ کسی کے ہاتھ میں اسلحہ دیکھ کر لوگ اس کے قریب نہیں جاتے تھے اور اس قسم کی صورتِ حال میں ملوث ہونے سے بچنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ چاروں نوجوان اپنی شکلوں اور انداز اطوار سے ہی ایسے خطرناک اور بے خوف دکھائی دیتے تھے کہ شریف شہری شاید مشکل سے ہی ان کے قریب جانے کی ہمت کرتے۔

علیزے کو عقب نما آئینوں میں، جھلملاتے چراغوں کی طرح دو تین گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں جو مختلف فاصلوں پر تھیں۔ سائڈ مررز پر بھی بارش کا پانی پڑ چکا تھا۔ ان میں ہیڈ لائٹس اچھلتی کودتی چنگاریوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ علیزے کو ذرا بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی ہیڈ لائٹس ان نوجوانوں کی بڑی سی سیاہ ٹویوٹا کی ہو سکتی تھیں یا نہیں؟

پھر اسے خیال آیا کہ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش تو کرے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے سڑک کے دونوں طرف اندھیرے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ شاپنگ مال کے جس طرف سے نکلی تھی، اس طرف سے، اس سے پہلے کبھی نہیں نکلی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا کہ اس طرف بھی کوئی سڑک موجود تھی اور اگر تھی تو وہ کہاں جاتی تھی۔ نکلتے وقت اس نے اپنی دانست میں فیروز پور روڈ کی طرف موڑی تھی اور اس کا خیال تھا کہ جو موڑ اس نے عبور کیے تھے، ان کے بعد اس کا رخ مزنگ چونگی کی طرف ہو جائے گا۔ ڈیفنس کی حدود سے شاید وہ نکل آئی تھی۔

ڈیفنس کی حدود میں وہ گاڑی روکنا بھی نہیں چاہ رہی تھی۔ وہاں اسے سناٹا ہی محسوس ہوا تھا لیکن ابھی تک اس کے سامنے کہیں رونق کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی کہیں روشنیاں نظر آئی تھیں۔ کہیں وہ رائے ونڈ کی طرف تو نہیں جا رہی تھی؟ اسے کہیں بھی کوئی شناسا چیز، کوئی دیکھی ہوئی عمارت نظر نہیں آ رہی تھی۔ خدایا...... وہ کس طرف نکل آئی تھی اور کہاں جا رہی تھی؟ ان سوالوں نے اسے وحشت زدہ کر دیا۔ اوپر سے دل کو یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ بدمعاش اس کا تعاقب نہ کر رہے ہوں۔ اسی اندیشے کی وجہ سے وہ گاڑی واپس موڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے رہی تھی اور رفتار بھی اس نے بارش اور گیلی سڑک کے باوجود حتی الامکان تیز رکھی تھی۔

ایک بار پھر اس نے عقب نما آئینے کا جائزہ لیا تو اس کے سینے میں پھڑکتے ہوئے دل کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئیں کیونکہ خطرے کا احساس یک لخت بڑھ گیا تھا۔ اب عقب نما آئینے میں صرف ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آ رہی تھیں اور اس گاڑی کی رفتار خاصی تیز معلوم ہوتی تھی۔ علیزے کی چھٹی حس نے اسے احساس دلایا کہ وہ انہی بدمعاشوں کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ وہ اسے لمحہ بہ لمحہ قریب آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے اپنی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں پہلے سے زیادہ توجہ سے سڑک کا جائزہ لیا۔ بارش کا پانی یوں تو دائیں بائیں نشیب کی طرف دھیرے دھیرے بہہ رہا تھا لیکن سڑک پر بھی اچھا خاصا پانی تھا اور جگہ جگہ کیچڑ بھی تھی۔ گاڑی کی رفتار مزید بڑھانا اسے خطرناک لگ رہا تھا، اس کے باوجود اس نے ایکسلریٹر کچھ اور دبا دیا۔ اسے ذرا سا اطمینان یہ تھا کہ اس کی گاڑی فور وہیل ڈرائیو تھی۔

عقب نما آئینے میں اسے اپنی اور پیچھے آنے والی گاڑی کے درمیان فاصلہ اب بھی بتدریج کم ہوتا لگ رہا تھا۔ کیا واقعی وہ گاڑی انہی بدمعاشوں کی تھی اور وہ اس کے تعاقب میں آ رہے تھے؟ وہ چاہ رہی تھی کہ اس کا دل اس سوال کا جواب نفی میں دے لیکن اس کے دل نے اس کی یہ خواہش پوری نہیں کی۔ اسی دوران ایک بار پھر اس کی نظر عقب نما آئینے کی طرف گئی تو اس نے پچھلی ہیڈ لائٹس میں سے ایک کے قریب، چھوٹا سا ایک شعلہ لپکتے دیکھا جو دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گیا لیکن اسی دوران اسے ہلکا سا ایک دھماکا بھی سنائی دیا۔

''اوہ...... میرے خدا......!'' وہ بے اختیار زیرِ لب بڑبڑائی اور جھرجھری سی لے کر رہ گئی۔

گاڑی کے شیشے پوری طرح بند تھے۔ دروازے مقفل تھے۔ سڑک پر تھوڑے بہت پانی کی موجودگی کی وجہ سے ٹائر کچھ آواز پیدا کر رہے تھے اور علیزے کو یہ بھی

اندازہ تھا کہ تیز رفتاری سے چلتی ہوئی گاڑی کے آس پاس ہوا شائیں شائیں کر رہی ہوگی، اس کے باوجود دھماکے کی آواز اس تک پہنچی تھی اور اس نے اندھیرے میں، اپنے عقب میں ایک شعلہ سا بھی لپکتے دیکھا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پچھلی گاڑی سے اس پر فائر کیا گیا تھا۔ گویا اب اس میں ذرا سا بھی شک نہیں رہ گیا تھا کہ پچھلی گاڑی ان بدمعاشوں ہی کی تھی اور اس میں شاید وہ چاروں ہی موجود تھے۔

وہ شاپنگ مال کے گارڈ کو سرعام گولی مار کر اطمینان سے نہ صرف نکل آئے تھے بلکہ اس کا تعاقب بھی کر رہے تھے اور اس پر فائر بھی کر رہے تھے۔ علیزے نے اس قسم کی خبریں تو بے شمار پڑھی تھیں اور ٹی وی پر بھی دیکھی تھیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک میں مجرم کس قدر بے خوف ہو چکے تھے لیکن آج اسے عملی طور پر اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ فائر کے دھماکے کے بعد اسے اپنی گاڑی کا کوئی شیشہ ٹوٹنے یا گولی، گاڑی کے کسی حصے سے ٹکرانے کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے ایمرجنسی نمبر پر فون کر کے پولیس کو اس صورت حال کی اطلاع دینے کی کوشش تو کی ہی نہیں تھی۔ اس کا ہینڈ بیگ اور خریدی ہوئی چیزوں کا شاپنگ بیگ پچھلی سیٹ پر پڑا تھا۔ فون ہینڈ بیگ میں تھا۔ اس وقت جن حالات میں وہ ڈرائیونگ کر رہی تھی، اسے یہ ممکن نظر نہ آیا کہ وہ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے، پچھلی سیٹ سے بیگ اٹھا کر، اس کی زپ کھول کر، اس میں سے فون نکال کر ایمرجنسی کال کر سکتی تھی اور کال کرنے کے لیے گاڑی روکنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ بدمعاشوں کی گاڑی اسے ویسے ہی لحہ بہ لحہ کچھ نہ کچھ قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں تھی۔ اسے راستوں کا کچھ زیادہ علم نہیں تھا۔

اسے صرف ڈیفنس کی کچھ خاص خاص سڑکوں اور اندرون شہر جانے والے راستوں کا پتا تھا۔ اگر وہ کسی طرح ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے، بیگ سے فون نکالنے، ایمرجنسی کال کرنے اور اپنی لوکیشن آن کرنے میں کامیاب ہو جاتی، تب بھی اسے امید نہیں تھی کہ پولیس، لوکیشن کی مدد سے اس تک پہنچنے کی کوشش کرے گی اور اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جائے گی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ پولیس تو شاید ابھی شاپنگ مال تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ جب وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوئی تھی تو اس نے دیکھا تھا کہ وہ بدمعاش، شاپنگ مال کے گارڈ کو سفاکی سے قتل کرنے کے بعد کتنے اطمینان سے کھڑے تھے اور پھر وہ اس کے تعاقب میں بھی آ گئے تھے۔ علیزے کا اندازہ یہی تھا کہ انہوں نے تو اس کے تعاقب میں روانہ ہونے کے لیے پارکنگ ایریا کی باؤنڈری لائن کا کام کرنے والی منڈیر پر سے گاڑی گزارنے کا خطرہ بھی مول نہیں لیا تھا بلکہ چکر کاٹ کر صحیح راستے سے اس سڑک پر آئے تھے جس پر علیزے نکل پڑی تھی۔

اپنے پریشان کن خیالات میں الجھی ہوئی علیزے نے اچانک دیکھا کہ سامنے سڑک دوراہے میں تبدیل ہو گئی تھی اور علیزے کو ان کے بارے میں بھی کوئی اندازہ نہیں تھا کہ کون سی سڑک کہاں جا رہی تھی۔ ایک سڑک کے موڑ پر آئرن اینگلز کے سہارے ایک بورڈ لگا ہوا تھا اور ٹوٹ کر کچھ اس طرح لٹک گیا تھا کہ اس کا رخ دوسری طرف ہو گیا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس پر کیا لکھا تھا۔ گاڑی روک کر اُترنے اور کچے میں اتر کر دوسری طرف جا کر بورڈ کو دیکھنے کی مہلت علیزے کو میسر نہیں تھی۔ پیچھے سے ایک فائر ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی سے اس بار بھی گولی گاڑی کو یا علیزے کو نہیں لگی تھی۔

پچھلی ہیڈ لائٹس کی روشنی عقب نما آئینوں میں علیزے کو کبھی تیز ہوتی محسوس ہوتی اور کبھی ہلکی۔ وہ ایک لمحہ بھی ہچکچاہٹ میں ضائع کیے بغیر حتی الامکان تیز رفتاری سے دوراہے پر بائیں جانب مڑ گئی۔ پچھلی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اس کے عقب نما آئینوں میں غائب ہو گئیں۔ نہ جانے کیوں علیزے کو احساس ہوا کہ اپنے تمام تر خوف اور گھبراہٹ کے باوجود وہ پچھلی گاڑی چلانے والے بدمعاش سے بہتر ڈرائیو کر رہی تھی۔ عقب نما آئینوں میں دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ بدمعاشوں کی گاڑی موڑ کاٹتے ہوئے شاید کچے میں اتر گئی تھی۔ اس نے ہیڈ لائٹس کو جھٹکوں سے اوپر نیچے ہوتے دیکھا تھا پھر وہ غائب ہو گئیں۔ علیزے نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ان بدمعاشوں کی گاڑی الٹ گئی ہو۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی دعا قبول ہوئی تھی یا نہیں لیکن کچھ ہی دیر بعد ایک نئی پریشانی کا احساس ہوا۔ اسے احساس ہوا کہ شاید اس نے اس طرف گاڑی موڑ کر غلطی کی تھی۔ شاید اس کے لیے آج کی رات بھیانک غلطیوں کی رات تھی۔ وہ سڑک آگے جا کر پھر ایک

دوراہے میں تبدیل ہوگئی۔ ایک سڑک تو سیدھی آگے جارہی تھی۔ دوسری اس کی نسبت ذرا چھوٹی سڑک تھی اور وہ دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ گوکہ اس طرف بھی اندھیرا ہی تھا لیکن نہ جانے کیوں علیزے کو محسوس ہوا کہ شاید ادھر کوئی آبادی تھی۔ لاہور کا کوئی قریبی قصبہ یا گاؤں ہوسکتا تھا۔ کوئی نواحی یا مضافاتی بستی ہوسکتی تھی۔

پھر علیزے کو احساس ہوا کہ شاید اس سے غلطی در غلطی ہوئی تھی۔ وہ پختہ سڑک کچھ ہی آگے جاکر نیم پختہ سڑک میں تبدیل ہوئی اور مزید کچھ آگے جاکر کچی پگڈنڈی بن گئی جس پر کیچڑ ہی کیچڑ اور جابہ جا گڑھے تھے۔ علیزے کو گاڑی کی رفتار بہت کم کرنا پڑی۔ اس نے بیک ویو مرر اور سائڈ مرز، تینوں میں ان ہیڈ لائٹس کو تلاش کیا جو اس کے تعاقب میں آرہی تھیں۔ وہ اسے دو ننھے چراغوں کی طرح ایک سائڈ مرر میں تھرتھراتی دکھائی دیں۔ سیاہ گاڑی یقیناً پیچھے سے نکل آئی تھی اور اس چھوٹی سڑک کے موڑ پر پہنچ چکی تھی۔ فاصلہ گوکہ کافی تھا لیکن بدمعاشوں کو یقیناً معلوم ہوچکا تھا کہ وہ کس طرف مڑی تھی۔

پھر اچانک ہیڈ لائٹس کی روشنی ایک بیریئر پر پڑی جس پر "اسٹاپ" کا ایک بیضوی سا بورڈ بھی لگا ہوا تھا۔ سرخ حروف میں اس پر انگریزی میں لفظ "اسٹاپ" لکھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں سروں پر دو چوکور ستون نظر آرہے تھے جو زیادہ اونچے نہیں تھے۔ ان دونوں ستونوں کے اطراف میں گھنے درخت تھے۔ ایسا لگتا تھا، جیسے وہ راستہ جنگل میں جارہا تھا لیکن اس میں داخلے کی جگہ پر بیریئر لگا دیا گیا تھا جو اس وقت اوپر اٹھا نہیں تھا بلکہ نیچے آیا ہوا تھا اور اس نے راستہ روکا ہوا تھا۔ اس سے اوپر، خاصی بلندی پر شاید اتنا ہی چھوٹا کوئی بورڈ لگا ہوا تھا لیکن ہیڈ لائٹس کی روشنی کی رسائی وہاں تک نہیں تھی، اس لیے علیزے دیکھ نہیں سکی کہ اس پر کیا لکھا تھا لیکن اسے بہت آگے، اندھیرے میں کچھ ہیولے سے نظر آئے تھے جو شاید نامکمل مکانوں یا کسی اور طرح کی تعمیرات کے تھے۔ غالباً وہ کوئی ہاؤسنگ اسکیم یا کسی اور طرح کا کوئی تعمیراتی پروجیکٹ تھا جس پر ان دنوں کام رکا ہوا تھا۔

پگڈنڈی کے دونوں طرف، دائیں بائیں خالی اور ناہموار زمین تھی اور شاید کچھ کھیت وغیرہ بھی تھے۔ لیکن علیزے، گاڑی ان دونوں سمتوں میں سے کسی طرف بھی لے جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ بدمعاش جب اس تک پہنچیں تو وہ کسی کھلی جگہ میں ہو۔ کھلی جگہ میں وہ ان خبیثوں کے لیے آسان شکار ثابت ہوسکتی تھی۔ اسے چھپنے کے لیے کسی جگہ کی تلاش تھی۔

ہیڈ لائٹس اب اسے بیک ویو مرر میں بھی اوپر نیچے ہوتی نظر آرہی تھیں۔ وہ بیریئر سے کچھ فاصلے پر رک چکی تھی لیکن پھر ایک گہرا سانس لیتے ہوئے وہ ایک خطرناک فیصلے پر پہنچ گئی۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ اس کی گاڑی کی اونچائی کے مقابلے میں بیریئر نیچا تھا، ظاہر ہے، وہ گاڑیوں کو روکنے کے لیے لگایا گیا تھا۔ اس کے باوجود علیزے نے جوا کھیلا۔ اس نے ایکسلریٹر ضرورت سے زیادہ دباتے ہوئے تیزی سے گاڑی آگے بڑھائی۔ اس کا خیال تھا کہ بیریئر خاصا کمزور ہے، وہ ٹوٹ جائے گا یا پھر گاڑی کی چھت کے ساتھ بُری طرح رگڑ کھاتے ہوئے، چھت کا بیڑا غرق کردے گا، لیکن گاڑی بہر حال اندر پہنچ جائے گی اور وہاں شاید وہ اپنے آپ کو ان غنڈوں سے بچانے کی کوئی تدبیر کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔

گاڑی دھماکے کی سی آواز کے ساتھ بیریئر سے ٹکرائی اور دوسرے ہی لمحے پوری ونڈ اسکرین چکنا چور ہوکر آدھی اندر اور آدھی باہر گر کر بکھر گئی۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا علیزے کے چہرے سے ٹکرایا۔ شیشے کے کچھ ٹکڑے علیزے کی گود میں بھی گرے تھے لیکن غنیمت تھا کہ اس کے ہاتھوں یا چہرے پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ گاڑی خود بخود ذرا سی دائیں بائیں کو گھومی لیکن پھر وہیں پھنس کر رہ گئی۔ وہ بیریئر جسے علیزے کمزور سمجھی تھی، نہ تو ٹوٹا اور نہ ہی ذرا بھی اوپر اٹھا، بس ایک لمحے کے لیے لرز کر رہ گیا۔

علیزے نے قسمت آزمائی کے لیے ایکسلریٹر مزید دبایا تو گاڑی کا انجن ہی بند ہوگیا۔ اس نے ہیڈ لائٹس آف کیں اور چابی اگنیشن میں گھمائی۔ انجن محض گھرگھرا کر رہ گیا۔ گاڑی میں صرف ایک لمحے کے لیے معمولی سا ارتعاش محسوس ہوا۔ ایسا ہی ارتعاش علیزے کو اپنے جسم میں بھی محسوس ہورہا تھا۔ اس نے اگنیشن سے چابی نکالی اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گاڑی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ اندھیرے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن دیکھے بغیر بھی اسے اندازہ تھا کہ گاڑی میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے وہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتی۔ اس وقت بڑی شدت سے اس کا دل چاہا کہ کاش، اس کے پاس بھی کوئی گن ہوتی اور وہ اسے چلانی بھی آتی۔ ویسے وقار کے پاس نائن ایم ایم کا ایک پسٹل اور اس کا لائسنس

بھی موجود تھا لیکن وہ بھی ہمیشہ گھر میں ہی پڑا رہتا تھا۔ بچوں کے ڈر سے زیادہ تر تو وقار اسے ایک ایسی کیبنٹ میں چھپا کر رکھتا تھا جو کپڑوں کی الماریوں کے اوپر بنی ہوئی تھی۔

علیزے نے کئی بار کسی خاص وجہ کے بغیر وقار سے فرمائش کی تھی کہ وہ اسے پسٹل استعمال کرنا سکھا دے، لیکن وقار نے ہر بار قدرے طنزیہ اور استہزائیہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا کہ آتشیں ہتھیار چلانا عورتوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس پر علیزے اسے یاد دلانے کی کوشش کرتی تھی کہ خواتین تو ایک زمانے سے پولیس اور فوج میں بھی خدمات انجام دے رہی تھیں لیکن وقار سنی اَن سنی کر دیتا تھا۔

علیزے نے ایک بار پھر تینوں عقب نما آئینوں میں دیکھا۔ اسے تعاقب کرنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کسی بھی آئینے میں نظر نہ آئیں۔ اس کی دھڑکنیں جو پہلے ہی کافی تیز تھیں، ایک قسم کی خوش گمانی سے کچھ اور تیز ہو گئیں۔ کیا ان کی گاڑی بند ہو گئی تھی، الٹ گئی تھی یا کہیں کچی اور دلدلی زمین میں پھنس گئی تھی؟ کاش وہ چاروں مر گئے ہوں یا کم از کم بے ہوش اور زخمی تو ہو گئے ہوں! وہ سوچے بغیر نہ رہ سکی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی خوش فہمی دم توڑ گئی۔ ونڈ اسکرین ٹوٹنے کی وجہ سے بارش کا پانی پھوار کے سے انداز میں اس کے چہرے تک پہنچ رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ بارش ابھی تک ہلکی ہی تھی، اس کے باوجود ہر طرف پانی اور کیچڑ نظر آ رہا تھا۔ اگر موسلا دھار ہوتی تو نہ جانے کیا عالم ہوتا۔

اس کی خوش فہمی یا خوش گمانی درحقیقت اس لیے دور ہوئی تھی کہ ٹوٹی ہوئی ونڈ اسکرین کی وجہ سے نہ صرف پھوار اندر آ رہی تھی بلکہ ہوا کے دوش پر اسے مدھم سی کچھ انسانی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ اس کے دل کو فوراً یقین ہو گیا کہ یہ آوازیں ان خبیثوں کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے جلدی سے اندھیرے میں ٹٹول کر وہ لیور کھینچا جس سے ڈکی کھل جاتی تھی۔ پھر اس نے چھت میں لگا ہوا ایک چھوٹا سا سوئچ آف کیا، تاکہ جب وہ گاڑی کا دروازہ کھولے تو کہیں روف لائٹ نہ جل اٹھے۔ روف لائٹ کی وجہ سے اس کی گاڑی کا ہیولا دور سے ان خبیثوں کو نظر آ سکتا تھا۔ علیزے سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ اگر اسے ابھی تک ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ابھی تک اس کے اعصاب اس کے قابو میں تھے۔

وہ آہستگی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بلی کی طرح بے آواز طریقے سے باہر آئی۔ اس نے پیچھے دیکھا تو اسے گاڑی کی ہیڈ لائٹس اب بھی کہیں نظر نہ آئیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ مصیبت ٹل گئی تھی۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ پیدل اسی طرف آ رہے تھے جہاں علیزے موجود تھی۔ وہ اتنی اونچی آواز میں باتیں کر رہے تھے کہ فاصلہ خاصا ہونے کے باوجود آواز علیزے تک پہنچ رہی تھی۔ تاہم الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس ٹارچ بھی تھی جس کی روشنی میں دیکھتے ہوئے اور تقریباً دوڑتے ہوئے وہ اسی طرف آ رہے تھے جہاں علیزے کی گاڑی کھڑی تھی۔ یقیناً انہیں بھی کسی وجہ سے اپنی گاڑی چھوڑنی پڑ گئی تھی ورنہ وہ علیزے تک پہنچ چکے ہوتے۔ غنیمت تھا کہ ان کی ٹارچ کی روشنی بھی فی الحال علیزے تک نہیں پہنچی تھی۔

ڈکی کا تالا کھل چکا تھا۔ علیزے نے اس کو ایک ہاتھ سے اوپر کیا اور دوسرا ہاتھ اندر لے جا کر اِدھر اُدھر پڑی چیزوں کو جلدی جلدی ٹٹولا۔ اسپیئر وہیل، پیٹرول کے لیے ایک کین، پانی کی ایک بوتل اور کچھ چھوٹا موٹا کاٹھ کباڑ ڈکی میں پڑا تھا۔ جلد ہی اس کا ہاتھ اس چیز پر پڑ گیا جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ مضبوط پلاسٹک کا ٹول باکس تھا۔ اس نے ڈکی میں رکھتے ہوئے ہی اسے کھولا۔ وہ کھٹکے سے بند ہوتا تھا اور چھوٹا سا لیور دبانے سے کھل جاتا تھا۔ علیزے نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ مقفل نہیں تھا۔ اس کی چابی نہ جانے کہاں تھی۔

اس نے ٹول باکس میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اوزاروں کو ٹٹولا۔ جلد ہی اس کا ہاتھ ایک ایسی چیز پر پڑ گیا جو اس کے خیال میں کسی نہ کسی حد تک ہتھیار کا کام دے سکتی تھی۔ وہ ایک بھاری رنچ تھا۔ علیزے نے رنچ، ٹول باکس سے نکال کر مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا پھر اس نے ٹول باکس بند کر کے، ڈکی سے نکال کر سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بغل میں دبا لیا۔ گاڑی کے پیچھے سے نکل کر وہ بیریئر کی طرف لپکی۔ آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لوگ کافی قریب آ چکے تھے۔ ان کی ٹارچ کی روشنی کا دائرہ اِدھر اُدھر ناچ رہا تھا۔

عین اس وقت، جب وہ جھک کر بیریئر کے دوسری طرف جانے لگی تھی، اچانک وہ ٹارچ کی روشنی کی زد میں آ گئی۔ روشنی کا دائرہ اسی لمحے اس پر ٹک گیا اور کوئی زور

سے چیخا۔ ’’وہ جا رہی ہے سالی......!‘‘ یہ غالباً اس سوکھے اور سانولے سے نوجوان کی آواز تھی جس نے علیزے کی آنکھوں کے سامنے شاپنگ مال کے گارڈ کو بلا تامل گولی ماردی تھی اور جسے اس کے ایک ساتھی نے ’’کالے‘‘ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

علیزے بیریئر کے نیچے سے نکل کر سیدھی ہوئی اور ناک کی سیدھ میں بھاگتی چلی گئی۔ اس نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ گھر سے نکلتے وقت اس نے ہلکے پھلکے اسپورٹس شوز پہن لیے تھے۔ اگر اس وقت اس کے پیروں میں کوئی فیشن ایبل قسم کی جوتیاں ہوتیں تو اس کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جاتیں۔ وہ شاید کسی نیم پختہ سی سڑک پر تھی جس پر کیچڑ اور کہیں کہیں چھوٹے موٹے گڑھے بھی تھے۔ اسے صحیح طور پر کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ پیچھے سے آتی ہوئی، ٹارچ کی مدھم اور متحرک روشنی میں تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا تھا۔

پھر نہ جانے کیوں یک دم ٹارچ بجھ گئی۔ جب تک ٹارچ روشن تھی، علیزے کو دھڑکا لگا رہا تھا کہ کسی بھی لمحے عقب سے گولی آئے گی اور اس کے جسم میں کہیں پیوست ہوجائے گی لیکن نہ جانے کیوں کالے نے فائر نہیں کیا تھا۔ علیزے کو یہ اندازہ تو ہو چکا تھا کہ اس کے پسٹل میں ایک میگزین خالی ہو چکا تھا۔ اس نے دعا کی کہ اس کے پاس مزید گولیاں نہ ہوں اور نہ ہی اس کے سوا کسی کے پاس کوئی دوسری گن ہو۔ اس کے عقب میں اب صرف اندھیرا ہی نہیں، گہرا سکوت بھی تھا۔

اس نے ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ وہ بیریئر سے کافی دور نکل آئی تھی۔ اس کا اندازہ اسے دور، مدھم سی روشنی دیکھ کر ہوا۔ وہ روشنی یقیناً اس کی گاڑی کی روف لائٹ کی تھی۔ تب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ وہیں رک کر، گاڑی کا دروازہ کھول کر، غالباً اطمینان سے گاڑی کی تلاشی لے رہے تھے۔ یہ سوچتے ہوئے علیزے کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئیں۔ اسے یاد آیا کہ وہ اپنا ہینڈ بیگ گاڑی میں ہی بھول آئی تھی جس میں اس کی نقد رقم کے علاوہ ڈرائیونگ لائسنس، شناختی کارڈ، کریڈٹ کارڈ، اے ٹی ایم کارڈ اور دوسری نہ جانے کتنی اہم اور غیر اہم چیزیں موجود تھیں۔

پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں بھاری رینچ، بغل میں ٹول باکس تھا، ان چیزوں کے ساتھ وہ ہینڈ بیگ نہیں سنبھال سکتی تھی اور فی الحال یہ چیزیں اسے ہینڈ بیگ سے زیادہ اہم محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے حیرت تھی

پانی مچھلی کے لیے منگوایا تھا، بے چاری پیاسی ہے۔

کہ ان لوگوں نے بیریئر سے آگے اس کا تعاقب جاری رکھنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ شاید انہیں اطمینان تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس تک پہنچ ہی جائیں گے، اسے تلاش کر ہی لیں گے۔ اب وہ جوگنگ کے انداز میں دوڑ رہی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ تیزی سے دوڑتے ہوئے وہ اندھیرے میں زیادہ زور سے کسی چیز سے نہ جا ٹکرائے۔ اندھیرے میں درختوں کے پتوں پر ہلکی بارش کی ٹپ ٹپ اور کبھی کبھی ہوا کی ہلکی سی سائیں سائیں کی آوازیں بھی علیزے کو مزید خوف زدہ کر رہی تھیں۔ اگر وہ دوڑ نہ رہی ہوتی تو شاید سرد ہوا بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتی۔ اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا نہیں تھا اور جو ہلکے پھلکے کپڑے تھے، وہ دھیرے دھیرے بھیگتے جا رہے تھے۔

اچانک ایک لمحے کے لیے، بے آواز طریقے سے ہلکی سی بجلی چمک اٹھی۔ اس ایک لمحے میں علیزے کو کسی حد تک اندازہ ہوا کہ وہ کس قسم کی جگہ پر تھی۔ وہ واقعی کوئی متروک ہاؤسنگ اسکیم معلوم ہوتی تھی لیکن اس کے آثار کافی آگے جا کر شروع ہوتے تھے جہاں کچھ مکانات کی بنیادوں پر پلرز کھڑے نظر آئے تھے لیکن شاید کسی پر چھت ڈالنے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ کام رکے ہوئے بھی شاید کافی عرصہ گزر گیا تھا۔ علیزے کو حیرت اس بات پر تھی کہ وہاں کسی قسم کے نگران یا چوکیدار کی موجودگی کے بھی کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہاں کسی قسم کا

بلڈنگ میٹریل بھی ان چند لمحوں کے دوران تو علیزے کو کہیں نظر نہیں آیا تھا جب بجلی چمکی تھی۔

اس دوران البتہ ایک اور احساس نے علیزے کی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی حرارت کچھ اور کم کر دی۔ اسے کچھ یوں لگا تھا جیسے اس کے دائیں بائیں پھیلے ہوئے درختوں کے درمیان کوئی درندہ، یا پھر شاید درندہ نما کوئی انسان...... اس کی نظروں سے اوجھل رہتے ہوئے، لیکن اس پر نظر رکھتے ہوئے اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا لیکن شاید اس کی چھٹی حس نے اسے یہ احساس دلایا تھا۔ اب اسے اندھیرے کے باوجود کچھ فاصلے تک کی چیزوں کے ایسے ہیولے سے دکھائی دینے لگے تھے جیسے کسی نے سیاہ رنگ بہت بڑے کینوس پر پھیلا کر اس پر کچھ اور گہرے سیاہ رنگ سے تصویریں بنائی ہوں۔ پانی اور کیچڑ اس کے جوگرز میں بھی چلا گیا تھا جس کی وجہ سے ہلکی سے پچ پچ کی آواز پیدا ہونے لگی تھی جبکہ وہ بلی کی طرح بے آواز قدموں سے دوڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔

جس پگڈنڈی نما سڑک پر وہ دوڑ رہی تھی، اس کے کنارے ایک جگہ اسے ایک کمرے کا سا ہیولا نظر آیا۔ اس نے رک کر، پہلے تو اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا، پھر ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا کہ کیا واقعی وہ کوئی کمرا تھا؟ چند لمحوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ درحقیقت وہ موٹے موٹے تختوں کا ایک چوکور انبار تھا جنہیں اوپر تلے ترتیب سے اس طرح رکھا گیا تھا کہ وہ اندھیرے میں ایک کمرا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ علیزے کو یہ بھی اندازہ ہوا کہ اس قسم کے تختے چھت بنانے کے لیے استعمال ہوتے تھے اور کنسٹرکشن کی اصطلاح میں اس طریقے کو غالباً شٹرنگ کہا جاتا تھا۔

اچانک علیزے کو ایک خیال آیا تو خوف زدہ انداز میں دھڑکتے ہوئے اس کے دل میں خوشی کی ایک مدھم سی لہر ابھری۔ اسے امید نظر آئی تھی کہ جس انداز میں تختے رکھے ہوئے تھے، ان کے درمیان چوکور سی کچھ جگہ خالی ہو گی۔ وہ گویا چھوٹا سا، اور چند فٹ گہرا، چوکور کنواں ہو گا۔ اگر قسمت اس کا ساتھ دیتی تو چھپنے کے لیے وہ ایک بہترین جگہ ثابت ہو سکتی تھی۔ اول تو کسی کو خیال ہی نہیں آ سکتا تھا کہ وہاں کوئی ایسی جگہ موجود ہو گی اور اگر خیال آ بھی جاتا تو شاید اس امکان کی طرف اس کا ذہن نہ جاتا کہ علیزے وہاں چھپی ہو گی۔

اس نے ٹول باکس اور رینچ سب سے اوپر والے تختے پر رکھا پھر دونوں ہاتھ اس پر ٹکا کر کھلاڑیوں والی پھرتی سے اس پر چڑھ گئی۔ کالج کے زمانے میں وہ ایتھلیٹ رہی تھی اور اس نے جوڈو کراٹے کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ وہ کراٹے کی ٹیم میں شامل تھی لیکن یونیورسٹی پہنچ کر سب کچھ چھوٹ گیا تھا اور شادی کے بعد سے اب تک اسے یاد بھی نہیں آیا تھا کہ وہ کبھی اس قسم کی سرگرمیوں اور اسپورٹس میں جوش و خروش سے حصہ لیا کرتی تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے جسم میں اب وہ پھرتی، لچک اور طاقت یا اس کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تھا یا نہیں؟ تاہم جس انداز میں وہ تختوں پر چڑھنے میں کامیاب ہوئی تھی، اس سے لگتا تھا کہ اب بھی وہ کچھ ایسی گئی گزری نہیں تھی۔

اوپر بیٹھ کر اس نے تختوں کے درمیان ذرا گہرائی تک ہاتھ گھمایا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں نیچے دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ تب وہ اس چھوٹے سے چوکور کنویں میں اتر گئی۔ ہاتھ ذرا اوپر کر کے اس نے رینچ اور ٹول باکس اتار لیا اور دونوں چیزوں کو پہلے ہی کی طرح سنبھال لیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ اندر سکڑ سمٹ کر اکڑوں بیٹھ بھی سکتی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے اور چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے اعصاب کو ذرا سکون پہنچانے کی کوشش کی۔

اس کے کان آوازوں پر لگے ہوئے تھے لیکن بارش اور ہوا کی ہلکی سی آوازوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ تختے ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان خالی جگہ بھی تھی جس سے باہر بھی دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے ایک جھری سے آنکھ لگا کر باہر دیکھا لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ تب وہ ذرا سے مطمئن ہو کر اکڑوں بیٹھ گئی اور آنکھیں بند کر کے گہری گہری سانسیں لینے لگی لیکن وہ کوشش کر رہی تھی کہ اس کی سانسوں کی بھی آواز نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کے دماغ میں چلتی ہوئی آندھیاں ذرا مدھم پڑنے لگیں اور اعصاب کافی حد تک قابو میں آنے لگے۔ رینچ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور ٹول باکس اس نے قریب ہی زمین پر رکھ کر اس کا ہینڈل ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ اب بھی اس شکار کی طرح چوکنا تھی جس کے پیچھے درندے لگے ہوئے ہوں۔

اچانک اس کے اعصاب کو ایک بار پھر جھٹکا سا لگا اور اس کی آنکھیں خود بخود یک دم کھل گئیں۔ اسے یوں لگا

دسمبر 2020ء کے لیے پُراثر تحریروں سے مرصع سال کا آخری شمارہ
گھر کے ہر فرد کے لیے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
افشاں آفریدی اور نایاب جیلانی کے قسط وار ناول اختتامی گھڑیاں سمیٹتے ہوئے
سعدیہ رئیس کا منی ناول میں انمول آخری منزل کی طرف گامزن
عورت کہانی میں پڑھیے فرحین اظفر کے ماہرانہ قلم سے لکھی چونکا دینے والی تحریر
سینئر رائٹرز عطیہ ہدایت اللہ، عالیہ حرا، سعدیہ ہما شیخ اور روحیلہ خان کی دل پذیر تحریریں
غزالہ عزیز کے دلکش قلم کا شاہکار...... مکمل ناول...... یقین کا سفر
شمع ہدایت میں
اختر شجاعت کا پُرروح مقالہ
حضور اکرم ﷺ کے پُرنور معجزات
شائستہ زرین لائی ہیں
ایک اور اچھوتے عنوان کے تحت
مختلف آرا پر مبنی سروے
صداکار، اداکار آصف الیاس سے خوب صورت ملاقات
اس کے علاوہ
عائشہ مصطفیٰ، خولہ سعید جاوید، فرح ریاض چیمہ،
سمیرا سرفراز و دیگر باصلاحیت لکھاریوں کی پُرکشش کاوشیں......
آپ جیسے باذوق قارئین کے مطالعے کے لیے شعر و شاعری، خوش ذائقہ، حسن نکھار لیے،
معلومات سے پُر تراشے اور گوشہ ظرافت جیسے خوب صورت سلسلے......

تھا جیسے قریب ہی کہیں سرگوشیوں میں بات کرنے کی کوشش کی جارہی تھی لیکن آوازیں سرگوشیوں سے کسی حد تک بلند ہوگئی تھیں۔ علیزے کے جسم میں گویا بجلی دوڑ گئی۔ وہ اس طرح اٹھ کھڑی ہوئی کہ ٹول باکس میں اوزاروں کی وجہ سے بھی کوئی آواز پیدا نہ ہونے پائے۔ اس نے ایک جھری سے آنکھ لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی اور ایک لمحے کے لیے اس کا دل ڈوب سا گیا مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ایک بار پھر اپنے آپ کو سمجھایا کہ اسے ہمت نہیں ہارنی تھی اور آخری سانس تک ان درندوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ رینچ پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی اور وہ ہاتھ اس نے پشت پر کرلیا جس میں رینچ موجود تھا۔

اسے باہر تاریکی میں چند تاریک ہیولے نظر آئے تھے۔

''تمہیں یقین ہے، وہ یہیں چھپی ہے؟'' اپنی دانست میں تو کسی نے سرگوشی ہی کی تھی لیکن آواز علیزے کی سماعت تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی سماعت ویسے بھی اس وقت شاید کچھ زیادہ حساس ہوچکی تھی۔ اس سرگوشی کی آواز بھی درحقیقت کچھ ایسی تھی جیسے لکڑی پر آہستگی سے ریگ مال رگڑا گیا ہو۔

''ابے ہاں...... میں نے خود دیکھا تھا۔'' دوسرے نے قدرے جھنجلاہٹ سے جواب دیا۔ ''آخر میں درختوں کی آڑ لے کر اس کا پیچھا کررہا تھا اور تمہیں شاید اب بھی یقین نہیں ہے کہ میری نظر چیتے کی نظر ہے۔''

''ابے چپ کر چیتے کی اولاد...... وہ دیکھ...... اپنا شیر کا بچہ اوپر چڑھ گیا ہے۔'' دوسری سرگوشی ابھری۔

اس لمحے علیزے کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کس شیر کے بچے کی، کہاں چڑھنے کی بات کررہا تھا کیونکہ اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ جب وہ دوڑتی ہوئی ادھر آرہی تھی تو اس کی چھٹی حس نے اسے احساس دلایا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب کررہا تھا لیکن اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ ان لوگوں نے بڑی ہوشیاری کی تھی کہ اپنے ایک ساتھی کو اس کے تعاقب میں روانہ کردیا تھا اور باقی تین بدمعاشوں نے اطمینان سے اس کی گاڑی کی تلاشی لی تھی جو ساتھی اس کے تعاقب میں آیا تھا، اس نے یقیناً اسے تختوں کے انبار کے درمیان چھپتے دیکھ لیا تھا اور اب اس کے تینوں ساتھی بھی اس سے آن ملے تھے۔

ابھی خطرے کے اس احساس سے وہ سنبھل نہ پائی تھی کہ اچانک اس چھوٹے سے چوکور کنویں میں روشنی پھیل گئی۔ روشنی علیزے کے عقب سے آئی تھی۔ وہ جال میں پھنسی ہوئی ہرنی کی طرح تیزی سے گھومی۔ رینچ والا ہاتھ اب بھی اس کی پشت پر تھا۔ باہر اس نے ان بدمعاشوں میں سے کسی کو کھرکھراتی سی سرگوشی میں کہتے سنا تھا۔ ''اپنا شیر کا بچہ اوپر چڑھ گیا ہے۔'' اس جملے کا مطلب اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ جس طرف وہ جھری سے جھانک کر دیکھ رہی تھی، ادھر یقیناً تین بدمعاش موجود تھے۔ ان کا چوتھا ساتھی اس دوران دوسری طرف سے اسی طرح تختوں پر چڑھ چکا تھا جس طرح علیزے چڑھی تھی اور اب وہ ٹارچ روشن کرکے اندر کا جائزہ لے رہا تھا۔

علیزے گھومی تو ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ گوکہ اب ٹارچ کی روشنی کچھ کمزور پڑ چکی تھی، اس کے باوجود ایک لمحے کے لیے علیزے کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کافی دیر سے اندھیرے میں تھی۔ اب ہلکی روشنی بھی اسے بہت تیز لگ رہی تھی۔ ٹارچ کے عقب میں گوکہ کافی حد تک اندھیرا ہی تھا، اس کے باوجود اسے ایک دو سیکنڈ بعد بدمعاش کی شکل نظر آگئی جس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ یہ گوکہ ان چاروں منحوسوں میں قدرے خوش شکل اور گورا چٹا تھا لیکن اس وقت علیزے کو اس کی شکل بھی کافی بھیانک نظر آئی۔ فلموں میں بعض مخصوص قسم کی سچویشنز میں کیمرے کے ذریعے ولن کے چہرے کو کچھ اس طرح پکچرائز کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ خوفناک اور بگڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ علیزے کو اس وقت وہ چہرہ کیمرے کے بغیر بھی کچھ ایسا دکھائی دے رہا تھا۔ یہ وہ نوجوان تھا جسے علیزے نے بڑی سی سیاہ گاڑی سے اُتر کر آتے دیکھا تھا اور جسے اس کے ساتھیوں نے ''فیکا'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس وقت اس کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے وہ علیزے کو اور بھی بھیانک دکھائی دیا۔

''ابے ہاں...... یہ سالی تو واقعی یہاں موجود ہے۔'' اس نے سر تھوڑا اونچا کرکے اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی۔ ''یہ کیسی بلی خود چوہیا کی طرح اس چوہے دان میں پھنسی ہوئی ہے۔ کتنا اچھا ہوا، ہمیں اس کو ڈھونڈنے میں زیادہ خوار نہیں ہونا پڑا۔'' اس نے ایک بار پھر سر جھکا کر، باچھیں کچھ اور پھیلا کر، بھوکے درندے کے انداز میں علیزے کو گھورا اور اپنے موٹے موٹے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ابے...... تو کیا وہاں اوپر بیٹھا تقریر جھاڑ رہا ہے۔ ہماری اتنی پیاری جانِ تمنا کے لیے بلی اور چوہیا جیسے

الفاظ استعمال کر رہا ہے۔" باہر سے آواز آئی۔ یہ غالباً اس سانولے اور سوکھے سے نوجوان کی آواز تھی جس نے علیزے کی آنکھوں کے سامنے سفاکی سے شاپنگ مال کے گارڈ کو قتل کیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو ہماری پیاری سی ہیروئن ہے۔ اس کا تو نام بھی بڑا پیارا ہے...... علیزے...... حالانکہ شادی شدہ ہے مگر لگتی نہیں...... اس کے میاں کا نام وقار ہے۔ سالے نے نام بھی کیا چھانٹ کر رکھا ہے۔ خیر...... کوئی بات نہیں...... صبح تک سالے کا سارا وقار مٹی میں مل چکا ہوگا۔" اس کا انداز کسی حد تک خود کلامی کا سا ہو گیا تھا۔

پھر اس نے نہ جانے کس تصور کے تحت چٹخارا سا لیا اور تختوں پر چڑھے ہوئے نوجوان کو ڈانٹنے کے سے انداز میں بولا۔ "ابے تو کیا لنگور کی طرح اوپر چڑھا بیٹھا ہے...... باہر نکال نا ہماری جانِ تمنا کو...... ہم کیا ساری رات یہیں کھڑے رہیں گے۔"

اس کے منہ سے اپنا اور وقار کا نام سن کر علیزے کے رگ و پے میں خوف کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اس کے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ گاڑی سے اس کا ہینڈ بیگ نکال چکے تھے اور اس کا ڈرائیونگ لائسنس، شناختی کارڈ وغیرہ ان کے ہاتھ لگ چکا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ تو غالباً اب اس کے گھر کے ایڈریس سے بھی آگاہ ہو چکے تھے۔

تختوں پر چڑھا ہوا فیکا گویا اپنے ساتھیوں کو ترسانے کے لیے بولا۔ "کیا کرو گے میری سیکسی بلی کو باہر نکلوا کر؟ یہ یہیں اپنے پنجرے میں اچھی لگ رہی ہے۔"

"ابے سالے، اتنا معصوم کیوں بن رہا ہے؟ کیا تجھے اندازہ نہیں کہ ہم کیا کریں گے؟" باہر ایک بار پھر اس سانولے، سوکھے سے نوجوان کی آواز ابھری جسے شاپنگ مال کے سامنے اس کے ایک ساتھی نے "کالے" کے نام سے پکارا تھا۔

"کیا کرو گے؟" فیکے نے ایک بار پھر چھیڑنے کے سے انداز میں پوچھا۔

"اس کے کپڑے پھاڑ دیں گے پھر اسے بارش میں دوڑائیں گے۔ ٹارچ سے روشنی ڈالیں گے۔ کتنا مزہ آئے گا۔ انگریزی فلموں میں بھی کبھی ایسا سین نہیں بنا ہوگا جو ہم بنائیں گے۔ آج کی رات بڑی زبردست گزرے گی۔" یہ کہتے ہوئے کالے نے ایک بار پھر گویا چٹخارا سا لیا۔

علیزے کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔ درحقیقت وہ دو متضاد سی کیفیتوں کا شکار تھی۔ ان لوگوں کی باتیں سن کر اس کے جسم میں خوف کی ایک سرد سی لہر بھی مسلسل دوڑ رہی تھی۔ دوسری طرف غصے کی شدت سے اس کی کنپٹیوں میں دھمک سی بھی ہو رہی تھی۔

اوپر بیٹھے فیکے نے ترحم آمیز سی آواز نکالی اور مصنوعی غصے سے اپنے ساتھیوں کو ملامت کی۔ "کتنے ظالم ہو تم لوگ...... میری سیکسی بلی کے ساتھ اتنا بُرا سلوک کرنا چاہتے ہو؟ اس سے تو بہتر ہے، میں خود ہی اندر اتر جاؤں۔ اپنی بلی کے پاس پہنچ جاؤں۔ جگہ تو کافی تنگ ہے لیکن تمہیں پتا ہے، بلا، بلی تو تنگ جگہوں میں بھی گزارا کر لیتے ہیں۔"

"ابے کھوتے کے بچے! بکواس بند کر......" کالے نے اسے ڈانٹا۔ "کیوں ٹائم ضائع کر رہا ہے اور ہمارے صبر کا امتحان لے رہا ہے۔ جلدی سے اسے باہر نکال۔" کالے نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔ اس کے لہجے سے واقعی بے صبری عیاں تھی۔

فیکے نے اب شاید کالے کی ہدایت پر عمل کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اس نے غالباً علیزے کے بال مٹھی میں جکڑ کر اسے اوپر اٹھانے کے لیے اپنا بایاں ہاتھ نیچے کیا اور خود بھی ذرا نیچے کو جھک گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی جس کی روشنی میں وہ اب علیزے کو سرتاپا دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ علیزے کا ہاتھ اب بھی پشت پر تھا اور فیکا شاید دیکھ نہیں سکا تھا کہ اس کے ہاتھ میں بھاری رنچ تھا۔ البتہ اس کی بغل میں دبا ہوا ٹول باکس فیکے کو نظر آ گیا۔

وہ اس کے بالوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گیا اور استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "اس ڈبے میں کیا اٹھائے پھر رہی ہو میری جان؟ کوئی خاندانی خزانہ ہے کیا؟"

علیزے نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس کے چہرے پر نظر جمائے ہوئے تھی جو اسے بگڑا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی سے نظر بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فیکے نے دوبارہ اس کے بالوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر ایک گڑیا کی طرح اسے اوپر اٹھائے گا۔ اس کا ہاتھ ابھی علیزے کے بالوں تک نہیں پہنچا تھا کہ علیزے کا ہاتھ حرکت میں آ گیا۔ اس نے اپنی دانست میں اپنے جسم کی پوری طاقت استعمال کرتے ہوئے رنچ اس کے چہرے پر پھینک کر مارا۔ اپنی بساط

کے مطابق اس نے طاقت کے ساتھ ساتھ کچھ تکنیک بھی استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔
رینچ چھوٹے سے ایک میزائل کی طرح فیکے کے چہرے سے ٹکرایا اور اس کی ایک آنکھ کے حلقے کی ہڈی کو غالباً توڑتا ہوا اندر گھس گیا۔ فیکے کی دردناک چیخ سے پہلے علیزے نے ہڈی ٹوٹنے کی آواز سنی۔ شاید فیکے کی آنکھ کا پورا حلقہ، رخسار اور ناک کی ہڈیوں سمیت ٹوٹ گیا تھا اور رینچ کا وہ حصہ جس سے نٹ بولٹ یا پائپ وغیرہ کو پکڑا جاتا تھا آنکھ میں گھس گیا تھا اور اس کا ہینڈل یوں باہر رہ گیا تھا کہ اسے دیکھ کر خوف آرہا تھا۔ علیزے گو کہ صرف ایک لمحے کے لیے ہی اسے دیکھ پائی تھی لیکن اس ایک جھلک سے ہی اسے جھرجھری آگئی تھی۔
دوسرے ہی لمحے وہ ایک دلدوز چیخ کے ساتھ پیچھے کو گرتے ہوئے، علیزے کی نظر سے اوجھل ہوگیا۔ ٹارچ نہ جانے کہاں جا گری اور منظر ایک بار پھر تاریک ہوگیا۔ فیکے کے تینوں ساتھی دوسری طرف تھے۔ فیکا ان کی مخالف سمت میں گرا تھا۔ علیزے ان کے بیچ میں، تختوں سے بنے ہوئے چھوٹے سے چوکور کنویں میں تھی۔ آوازوں سے اسے اندازہ ہوا کہ فیکے کی دلدوز چیخ سن کر اس کے ساتھی بوکھلا گئے تھے۔ ٹارچ کی روشنی غائب ہونے سے ان کی بوکھلاہٹ کچھ اور بڑھی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر یقیناً اسی طرف کو لپکے تھے، جدھر ان کے خیال میں فیکا گرا تھا۔ ان کی آوازوں سے علیزے کو اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کدھر آگئے تھے۔
اس نے جلدی سے ٹول باکس اس طرف، سب سے اوپر والے تختے پر رکھا، جدھر ایک لمحہ پہلے تک وہ تینوں موجود تھے۔ پھر دونوں ہاتھ اونچے کر کے، اس تختے پر جما کر وہ اچھلی اور واقعی کسی بلی کی طرح پھرتی سے اوپر چڑھ کر اس طرف کود گئی کیونکہ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ان تینوں کی گھبراہٹ زدہ آوازیں دوسری طرف سے آرہی تھیں۔ فیکے کی شدید اذیت بھری چیخ کے بعد اس کی کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ ”شاید وہ مر گیا ہو......“ علیزے نے سوچا اور امید بھرے انداز میں، دل ہی دل میں دعا کی کہ وہ چیخ اس کی زندگی کی آخری چیخ رہی ہو۔
اس نے ٹول باکس آہستگی سے تختوں سے اٹھایا اور اسے بغل میں دبا کر ایک بار پھر اندھیرے میں اندازاً پگڈنڈی نما نیم پختہ سڑک پر بھاگنے لگی۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ نہ تو اس کے قدموں کی آواز پیدا ہو اور نہ ہی ٹول باکس میں سے کھڑکھڑاہٹ کی آواز ابھرے۔ وہ ٹول باکس کو تو ”خاموش“ رکھنے میں کامیاب تھی لیکن اس کے جوتے اب بھی کیچڑ میں پچ پچ کر رہے تھے۔ ان کے اندر اب پانی کے علاوہ شاید کیچڑ بھی جا چکی تھی۔
بھاگتے بھاگتے اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ ٹھیک طرح دیکھ تو نہیں سکتی تھی لیکن اسے اندازہ ہوا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ لکڑی کے تختوں کے جس چوہے دان میں وہ پھنستے پھنستے رہ گئی تھی، اس کے قریب اسے کمزور سی متحرک روشنی نظر آئی۔ اس روشنی کے آس پاس چند لمحوں کے لیے کچھ ہیولے سے بھی دکھائی دیے۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ اپنے ساتھی فیکے کا جائزہ لے رہے تھے جس کی آنکھ کے راستے لوہے کا رینچ نہ جانے کتنی گہرائی تک پیوست ہوگیا تھا۔ علیزے نے جلدی سے ادھر سے دھیان ہٹا کر سامنے دیکھنا شروع کر دیا اور ایتھلیٹس کے انداز میں دوڑنا جاری رکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک بھیگی ہوئی تھی لیکن اس کا گلا بُری طرح خشک تھا۔ اسے تھوک نگلنے میں بھی دشواری ہورہی تھی۔ وہ دوڑ ضرور رہی تھی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جارہی تھی اور آگے اسے کوئی محفوظ پناہ گاہ میسر آنے کا امکان تھا یا نہیں؟
وہ جس راستے پر دوڑ رہی تھی، اس کے دونوں طرف وہ جس حد تک دیکھ سکتی تھی، اس سے اسے یہی اندازہ ہورہا تھا کہ وہاں درخت نہیں تھے۔ اس لیے اب یہ امکان بہت کم ہوگیا تھا کہ کوئی درختوں کی آڑ لے کر اس کا تعاقب کر رہا ہوگا۔ چند لمحے بعد اسے اپنے سامنے کچھ ہیولے سے نظر آنا شروع ہوگئے۔ یہ ہیولے پگڈنڈی نما سڑک کے ایک طرف تھے۔ چند قدم اور آگے پہنچ کر علیزے کو اندازہ ہوا کہ وہ مکانات کے ڈھانچے تھے۔ ان چند مکانات کی صرف بنیادیں بھری گئی تھیں اور پلرز کھڑے کیے گئے تھے۔ کسی پر چھت ڈالنے کا عمل شاید شروع ہونے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔
کچھ آگے جا کر اسے ایک مکان کی شٹرنگ لگی ہونے کا اندازہ ہوا۔ اس کے قریب پہنچ کر، اِدھر اُدھر گھوم کر اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر اسے اندازہ ہوا کہ اس مکان کی چھت ڈالنے کے لیے صرف تختے لگائے گئے تھے اور انہیں سہارا دینے کے لیے نیچے لکڑی کی بلیاں لگی ہوئی تھیں لیکن چھت بنانے کے لیے تختوں پر کسی قسم کا میٹریل ڈالنے کی نوبت نہیں آئی تھی کیونکہ تختوں کے درمیان

ملک بھر میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ملنے میں اگر دشواری ہے تو مندرجہ ذیل نمبرز پر ہمارے نمائندوں سے رابطہ کیجیے۔

شہر	نمبر	شہر	نمبر	شہر	نمبر
کراچی	03002680248	گجرات	03016215229	منڈی بہاؤالدین	03460827027
لاہور	03004009578	وزیرآباد	03456892591	سیالکوٹ	0524568440
ملتان	03006301461	لالہ موسیٰ	03216203640	میرپور AK	03460397119
حیدرآباد	03213060477	خان پور	03337472654	اٹک سٹی	057210003
سرگودھا	03447475344	کوہاٹ	03325465062	دیپالپور	03004059957
پشاور	03005930230	ساہیوال	03446804050	لیہ	03002373988
کوئٹہ	03337805247	پاک پتن	0300694678	قصبہ ڈنگہ	03083360600
فیصل آباد	03006698022	مظفرآباد	03469616224	عارف والا	03008758799
راولپنڈی	03335205014	بورے والہ	03347193958	لورالائی	03023844266
نواب شاہ	03003223414	وہاڑی	03136844650	کوٹلہ ارب علی خان	03016299433
سکھر	03009313528	تونسہ شریف	03346712400	جلالپور پیروالا	03338303131
رحیم یارخان	03009672096	ڈیرہ غازی خان	03336481953	ہری پور	03321905703
بہاولپور	0622730455	بہاولنگر	03336320766	چکوال	03348761952
گوجرانوالہ	03316667828	بنوں شہر	03329776400	وہوا	03346383400
جہلم	03235777931	رائے ونڈ	03004719056	حافظ آباد	03006885976
سیالکوٹ	03008711949	ہڑپہ	03317400678	کوہاٹ	03325465062
جھنگ	0477626420	ڈیرہ اسماعیل خان	03349738040	ایبٹ آباد	0992335847
بھکر	03337979701	چشتیاں	03348761952	چوکی	03454678832
منڈی بہاؤالدین	0331-7619788	منچن آباد	0301-7681279	مانسہرہ	0333-5021421
ڈسکہ	0300-9463975	سمبڑیال	0333-8604306	کوٹ رادھا کشن	03004992290
ٹوبہ ٹیک سنگھ	03006969881	حجرہ شاہ مقیم	0315-6565459		

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیز III ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی فون: 35895313

E-mail:jdpgroup@hotmail.com

جھریوں سے بارش کا پانی ٹپک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس ہاؤسنگ اسکیم پر ابتدا میں ہی اور قطعی اچانک کام روک دیا گیا تھا۔

علیزے نے اندر گھس کر اندازہ لگایا کہ لکڑی کی بلیوں کے درمیان چھپ کر کھڑے ہونے کے لیے کونے کھدروں والی دو تین جگہیں مناسب تھیں۔ وہاں بارش سے بھی کافی حد تک بچا جاسکتا تھا۔ اندھیرے میں وہ کسی حد تک دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اور کسی حد تک ہاتھوں سے ٹٹولتے ہوئے، اپنے اندازے کے مطابق وہ ایک مناسب جگہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ وہ وہاں لکڑی کی بلیوں کے درمیان ایک بُت کی طرح ایستادہ ہو گئی مگر وہ ایک ایسا بت تھا جو گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔

جب اس کے اعصاب کو تھوڑا سا سکون ملا اور سانسیں ذرا معمول پر آئیں تو اس نے ٹول باکس کو بغل سے نکالا اور اسے کھول کر بلیوں کے درمیان پھنسا کر، اس میں موجود اوزاروں کو ٹٹولنے لگی۔ اسے کسی ایسی چیز کی تلاش تھی جو بطور ہتھیار استعمال ہو سکے اور زیادہ سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکے۔ اس وقت یہ اسے اپنی خوش قسمتی محسوس ہوئی کہ اسے ٹول باکس میں ایک اور رینچ مل گیا۔ یہ اتنا بڑا اور بھاری تو نہیں تھا جیسا وہ استعمال کر چکی تھی لیکن اس کے مقصد کے لیے یہ بھی کافی کارآمد معلوم ہوتا تھا۔ اس کا دستہ کسی موٹی، نکیلی سلاخ کی طرح تھا۔ اس طرف سے اسے کسی کے جسم میں گھونپا بھی جاسکتا تھا۔

اس کا دوسرا سرا، جسے ایک طرح سے اس کا سر بھی کہا جاسکتا تھا، وہ بھی خاصا خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ علیزے نے ٹول باکس کو بند کر کے اس رینچ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور کان لگا کر سننے لگی کہ باہر کوئی آہٹ تو نہیں ابھر رہی تھی۔ اسے یہ بات اب کافی حد تک یقینی محسوس ہونے لگی کہ گن ان میں سے صرف کالے کے پاس موجود تھی اور شاید اب اس کے پاس بھی نہیں رہی تھی یا پھر اس کے پاس گولیاں ختم ہوگئی تھیں کیونکہ جب سے وہ پیدل اس کے تعاقب میں آرہے تھے، تب سے انہوں نے اس پر کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ اگر وہ اب غیر مسلح تھے، تب بھی ان کی بے خوفی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ انہیں گویا دنیا کی کوئی پروا نہیں تھی اور ان کے جو ارادے تھے، وہ ہر حال میں ان پر عمل کر گزرنا چاہتے تھے۔

آگے کیا ہونے والا تھا؟ اس انتظار میں علیزے کے اعصاب ایک بار پھر چٹخنے لگے تھے اور پھر اسی عالم میں اسے گھر، بچوں اور وقار کی یاد آگئی۔ اس کا دل بھر آیا۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ اسے صرف اپنے بچوں سے ہی نہیں، وقار سے بھی محبت تھی۔ جس محبت کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی...... شاید مر گئی تھی...... وہ زندہ تھی اور دل کے کسی گوشے میں چھپی بیٹھی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ اس کے شوہر اور بچوں کو اس کے واپس نہ آنے پر تشویش تو ضرور ہوگی لیکن شاید ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اس وقت وہ کہاں تھی اور کس صورتِ حال سے دوچار تھی۔

اس نے سر جھٹک کر سرِدست ان خیالات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی۔ اس وقت اسے بالکل چوکنا رہنا تھا۔ اپنی تمام تر توجہ ان درندوں کی طرف رکھنی تھی جو اس کے تعاقب میں تھے۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر ان کا ساتھی فیکا مر گیا ہوگا تو ان کا غیظ وغضب اور بھی بڑھ چکا ہوگا اور اب وہ اس کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ کرنے کے منصوبے بنا رہے ہوں گے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب علیزے پہلے جتنی خوف زدہ نہیں تھی۔ زندگی اور موت کی اس جنگ میں اب وہ شاید خوف کی انتہائی حد سے بھی گزر آئی تھی۔

اسے نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کے پاس اب ٹارچ موجود تھی یا نہیں...... اور اگر موجود تھی تو وہ کارآمد رہ گئی تھی یا نہیں۔ اس کے سامنے لکڑی کی بلیوں کا جو ایک جال سا بنا ہوا تھا، اسے امید تھی کہ دور کہیں کسی بھی چیز سے روشنی کی گئی تو اسے ان بلیوں کے درمیان جھریوں سے کسی نہ کسی حد تک ضرور نظر آجائے گی۔ وہ جہاں سے بھاگ کر آئی تھی، وہاں اسے مکمل اندھیرا محسوس ہو رہا تھا اور بارش کی ہلکی سی ٹپ ٹپ کے سوا کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے کان آوازوں کی طرف لگے ہوئے تھے اور اپنے دل کی دھڑکنوں کی وجہ سے اسے اپنی کنپٹیوں میں دھمک سی محسوس ہو رہی تھی۔

اسی عالم میں اسے خاصی دیر گزر گئی۔ انتظار کے باوجود اسے نہ تو کوئی آواز سنائی دی اور نہ ہی کہیں مدھم سی بھی روشنی دکھائی دی۔ انتظار سے اس کے اعصاب چٹخنے لگے تھے۔ یہ ایک عجیب انتظار تھا۔ کبھی اس کا دل چاہتا کہ وہ لوگ سامنے آجائیں، جو بھی ہونا ہوگا، دیکھا جائے گا اور کبھی وہ سوچتی کہ وہ لوگ چلے گئے ہوں تو اچھا ہے۔ ہلکی بارش جو کافی دیر سے جاری تھی، اب مزید ہلکی ہوگئی تھی۔

لگتا تھا، کچھ دیر میں بند ہو جائے گی۔

عین اس وقت جب وہ لکڑیوں کے اس ''جال'' سے نکلنے کا ارادہ کر رہی تھی، اچانک اسے ایک آواز سنائی دی اور وہ اپنی جگہ سے اچھلتے اچھلتے رہ گئی۔ وہ محض ہلکی سی ''کررڑ'' کی آواز تھی لیکن رات کے اس خوفناک سناٹے میں اسے کچھ یوں لگا تھا جیسے قریب ہی کہیں دھماکا ہو گیا ہو۔ ایک لمحے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ کیسی آواز تھی۔ شاید پلاسٹک کی کوئی خالی بوتل کسی کے پاؤں تلے آ گئی تھی۔

کہیں قریب سے ہی ہوا کے دوش پر کوئی سرگوشی علیزے تک پہنچی۔ ''ابے...... دیکھ کے چل...... اندھا ہو گیا ہے کیا؟''

''اس اندھیرے میں تو کوئی بھی اندھا ہو سکتا ہے۔'' جوابی سرگوشی میں کھردرا پن اور سخت ناگواری تھی۔ ''اسی لیے کہہ رہا تھا، ٹارچ جلا لے۔''

''ابے سالے...... بھول گیا کیا؟ ٹارچ ٹوٹ چکی ہے۔'' پہلی آواز نے ناگواری سے سرگوشی کی۔

تب دوسرا گالی دے کر بولا۔ ''میں موبائل کی ٹارچ کی بات کر رہا ہوں۔''

تب تیسرے نے سرگوشی کی۔ اس نے بھی بات کا آغاز گالی سے کیا تھا۔ ''یہ تو طے ہو گیا تھا کہ اب ہم راستے میں کوئی لائٹ نہیں جلائیں گے۔ وہ حرام زادی بڑی تیز چیز ہے۔ اگر اس نے کچھ دور سے بھی روشنی دیکھ لی تو وہ ہم پر حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار رہے گی۔ وہ آسانی سے قابو میں آنے والی نہیں ہے۔ سالی نے ایک کو تو مار دیا ہے۔ اب ہم میں سے کسی کو مرنا نہیں ہے...... اس سالی کو مارنا ہے۔''

''لیکن مارنے سے پہلے......'' کسی نے گویا کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

''ابے ہاں...... وہ تو یاد ہے۔'' پہلے نے ذرا غصے اور جھنجلاہٹ سے کہا۔ ''یونہی تھوڑی مار دیں گے سالی کو...... اتنی خجل خواری اٹھائی ہے...... ایک یار ہمارا جان سے چلا گیا ہے...... اب باقی رات تو عیش سے گزرنی چاہیے...... یادگار ہونی چاہیے آج کی رات...... ایک ساتھی کی قربانی دی ہے ہم نے......!''

''کاش گولیاں ختم نہ ہوئی ہوتیں۔'' کسی نے بے آواز سی آہ بھری۔

''سالے! تو ہی کوئٹہ سے یہاں تک حاتم طائی کی طرح بے فکری سے گولیاں خرچ کرتا آ رہا تھا۔ اچھا بھلا پتا تھا کہ رات کے وقت، بارش میں تیرا چاچا کہیں اسلحے کی دکان کھول کر نہیں بیٹھا ہوگا۔'' دوسرے نے جھاڑ پلائی۔

''اچھا، اب اپنی بک بک بند کر اور اپنا دھیان اسے ڈھونڈنے پر رکھ۔'' پہلے نے سخت بدمزگی سے کہا۔

وہ کہیں آس پاس ہی تھے اور حرکت میں تھے۔ ان کی سرگوشیاں ہوا کے دوش پر علیزے کی سماعت تک پہنچ رہی تھیں۔ بارش بند ہو چکی تھی، اس کی ٹپ ٹپ معدوم ہو چکی تھی۔ شاید اس لیے علیزے قدرے آسانی سے سرگوشیاں سُن پا رہی تھی۔ ویسے بھی اس وقت اس کی حسیات کچھ زیادہ ہی تیز ہو چکی تھیں۔ اسے کافی حد تک اندازہ ہو رہا تھا کہ کون سی سرگوشی ان میں سے کون سے بدمعاش کی تھی لیکن اس وقت اس کا دھیان اس بات پر زیادہ تھا کہ کون کیا کہہ رہا تھا۔ وہ الفاظ اور لہجوں پر زیادہ توجہ دے رہی تھی جن سے ان کے عزائم کا پتا چل رہا تھا۔

اچانک ایک سرگوشی سن کر اس کے جسم میں ایک بار پھر سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ''ابے...... وہ یہیں کہیں آس پاس ہے۔ مجھے اس سالی کی خوشبو آ رہی ہے۔'' یہ سرگوشی پہلے سے زیادہ مدھم تھی، اس کے باوجود علیزے کو اندازہ ہو گیا کہ یہ بات کرنے والا ''کالا'' تھا۔

اس لمحے علیزے کو اپنی وہ امپورٹڈ پرفیوم زہر لگنے لگی جو اس نے گھر سے نکلتے وقت نہایت فراخ دلی سے اپنے جسم اور لباس پر چھڑکی تھی۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔ یوں تو وہ گھر میں بھی کوئی نہ کوئی عمدہ پرفیوم لگائے ہوتی تھی لیکن گھر سے نکلتے وقت تو وہ خوشبو کا اچھا خاصا ''چھڑکاؤ'' ضرور کرتی تھی۔ اسے خود تو اپنے وجود سے خوشبو امنڈنے کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ دوسروں کو اس کی طرف سے کافی خوشبو آتی ہو گی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس وقت بھی کافی دیر گزر جانے اور بارش میں بھیگی ہونے کے باوجود اس کے وجود سے ایک الگ سی خوشبو آس پاس پھیل رہی ہو گی۔ اس وقت یہ خوشبو اس کے دردناک انجام کی کئی وجوہ میں سے ایک وجہ بن سکتی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ جس طرح ایک بار پہلے اس نے ان لوگوں کی آمد کا احساس ہوتے ہی اپنی سانس روک لی تھی، اسی طرح کاش وہ اس وقت اپنی خوشبو کو بھی پھیلنے سے روک سکتی۔

یک دم چاروں طرف گہرا سناٹا پھیل گیا۔ سرگوشیاں معدوم ہو گئیں۔ دھیمی ہوا سے درختوں کے پتوں

میں پیدا ہونے والی خفیف سی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، حالانکہ علیزے ''ہمہ تن گوش'' سے بھی آگے کی کسی منزل پر تھی کہ شاید کسی طرف سے کوئی آہٹ ہی سنائی دے جائے پھر اسے ایک خفیف سی آہٹ سنائی دے ہی گئی۔ شٹرنگ والا حصہ زمین سے ذرا بلندی پر تھا۔ بنیاد بھری جانے کی وجہ سے ایک بڑا چبوترا سا بن گیا تھا جس پر لکڑی کی بلیوں کا ایک چھوٹا سا ''جنگل'' سا پھیلا ہوا تھا۔ کوئی اس چبوترے پر چڑھا تھا اور اس کے پیروں تلے لکڑی کے چھوٹے موٹے ٹکڑے یا دوسرا کچرا نہایت خفیف سی آواز میں چرچرایا تھا۔

علیزے کے کشیدہ اعصاب کچھ اور تن گئے۔ نکیلے ہینڈل والے رینچ پر اس کی گرفت کچھ اور مضبوط ہوگئی۔ اس بار اس کا ارادہ رینچ کو کسی اور انداز میں استعمال کرنے کا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ پہلے والا طریقہ اس مرتبہ بھی کارگر ثابت ہوتا۔ اسی اثنا میں اسے ایک بار پھر کچرا کسی کے پیروں تلے چلے جانے کی نہایت خفیف سی آواز دوبارہ سنائی دی۔ پھر یہ آواز تیسری مرتبہ ابھری۔ علیزے کو اندازہ ہوگیا کہ باری باری وہ تینوں درندے چبوترے نما جگہ پر چڑھ آئے تھے۔ انہیں یقیناً اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کا شکار یہیں کہیں دبکا ہوا ہے۔

پھر اچانک چبوترا نما جگہ کے ایک کنارے پر روشنی ہوگئی۔ روشنی ہلکی ہی تھی لیکن اتنی دیر سے اندھیرے میں رہنے کے بعد علیزے کو وہ بھی خاصی تیز محسوس ہوئی تھی۔ دراصل کسی نے موبائل آن کیا تھا جس سے اس کی اسکرین روشن ہوگئی تھی۔ شاید اس کا ارادہ اب موبائل کی ٹارچ آن کرنے کا تھا لیکن علیزے کو اسکرین کی مدھم سی روشنی میں ہی ان تینوں کے 'ستے ہوئے' وحشت زدہ سے چہرے دکھائی دے گئے جو اس وقت کسی ڈراؤنی فلم کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔ علیزے کے سامنے بہت سی آڑی ٹیڑھی لکڑیاں موجود ہونے کی وجہ سے وہ ابھی اسے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن موبائل کی ٹارچ آن ہونے کے بعد ذرا سی کوشش سے وہ اسے تلاش کر سکتے تھے۔ علیزے نے فیصلہ کیا کہ اس سے پہلے ہی حرکت میں آجانا بہتر تھا۔

وہ لکڑیوں کے پیچھے سے ہٹی اور چبوترا نما حصے کے دوسری طرف سے کچی زمین پر کود گئی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ موبائل فون ''کالے'' کے ہاتھ میں تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ فون علیزے کا اپنا ہی رہا ہو۔ بہرحال ''کالا'' فون کی ٹارچ روشن کر چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ لوگ علیزے کو دیکھ تو نہیں سکے لیکن انہیں اندازہ ہوگیا کہ وہ لکڑیوں کے پیچھے سے نکل کر دوسری طرف کودی ہے۔

ان میں سے کسی نے علیزے کو موٹی سی گالی دی اور کوئی ہیجان زدہ انداز میں چلّایا۔ ''وہ سالی ادھر بھاگی ہے......''

علیزے کہیں نہیں بھاگی تھی۔ اس نے تاثر دیا تھا کہ وہ دوڑ پڑی ہے لیکن درحقیقت وہ مکان کی چبوترا نما بنیاد کے ایک کونے پر اکڑوں بیٹھ گئی تھی۔ یوں گویا وہ آڑ میں چھپ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا وہ تینوں اس کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے آئیں گے تو اسی کونے پر، یا پھر دوسرے کونے پر نمودار ہوں گے۔ یہ شاید اس کی خوش قسمتی تھی کہ موبائل فون کی ٹارچ کی روشنی خاصی کمزور پڑ گئی تھی۔ شاید اس کی بیٹری ڈاؤن ہو رہی تھی۔ علیزے نے اب ٹول باکس کا ہینڈل مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ دو بھاری چیزیں ٹول باکس سے نکل جانے کے باوجود اس کا وزن اب بھی کافی تھا اور پلاسٹک کی جس شیٹ سے وہ بنا ہوا تھا، وہ لکڑی ہی کی طرح سخت اور مضبوط تھی۔

وہ تینوں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے، کونے پر نمودار ہوئے۔ موبائل کی روشنی سے علیزے کو پہلے ہی ان کی آمد کا اندازہ ہوگیا تھا لیکن ان میں سے شاید کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کونے پر چھپی ہوئی تھی۔ جیسے ہی پہلا ہیولا کونے پر نمودار ہوا، علیزے تیزی سے اٹھی، اس کا بایاں ہاتھ پوری قوت سے حرکت میں آیا اور ٹول باکس اس ہیولے کے چہرے پر پڑا۔ ٹول باکس میں اوزاروں کی کھڑکھڑاہٹ کے علاوہ اس ضرب کی جیسی آواز علیزے کو سنائی دی، اس سے اسے اندازہ ہوا کہ اس نوجوان کا پورا چہرہ چپٹا ہوگیا ہوگا، ناک، منہ برابر ہوگیا ہوگا۔ اس کے منہ سے عجیب سی چیخ نکلی جسے شاید چیخ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی سی آواز تھی۔ وہ الٹ کر پیچھے جاگرا۔

علیزے نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ٹول باکس استعمال کرتے ہی دوسرے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے ہوئے رینچ کا نکیلا ہینڈل چھری کی طرح دوسرے نوجوان کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ اسے اپنی طاقت پر خود بھی حیرت ہوئی۔ رینچ اپنے ہیڈ تک اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ علیزے نے فوراً ہی رینچ کو چھوڑ دیا۔ وہ نوجوان رینچ کو اپنے پیٹ میں ہی لیے، دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھتے ہوئے ایک دل دوز چیخ کے ساتھ اوندھا

گرا۔ علیزے خود حیران تھی کہ اس میں اس طرح کے وار کرنے کی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔

پھر اسے احساس ہوا کہ یہ نفرت اور غصے کی طاقت تھی۔ اسے ان لوگوں کے انداز و اطوار، حرکتیں، تکبر اور سفاکی دیکھ کر شدید غصہ آیا تھا اور بے پناہ نفرت محسوس ہوئی تھی جو شاید اندر ہی اندر آتش فشاں کی طرح کھول رہی تھی۔ انہوں نے علیزے کی آنکھوں کے سامنے ایک بے چارے غریب سیکیورٹی گارڈ کو بلا تامل، نہایت سفاکی سے قتل کر دیا تھا۔ وہ بے چارہ ایک انجانی خاتون کو مشکل میں دیکھ کر اس کی مدد کے لیے آیا تھا۔ پھر انہوں نے گویا علیزے کو ایک نہایت حقیر، کمزور، بے دست و پا اور ایک ایسی مخلوق سمجھ کر اس کے ساتھ درندوں سے بدتر سلوک کرنا چاہا تھا جس کا، ان کے خیال میں بس ایک ہی مصرف تھا۔ شاید صرف اسی احساس نے رفتہ رفتہ خوف کو کہیں پیچھے چھوڑ دیا تھا اور اس کی نفرت، غصے اور جھنجلاہٹ کو اس کی طاقت بنا دیا تھا۔

ایسی طاقت تو اس نے نوجوانی میں، کالج کے زمانے میں بھی اپنے رگ و پے میں محسوس نہیں کی تھی جب وہ کالج کی جوڈو کراٹے کی ٹیم میں شامل تھی اور جوڈو کراٹے کے مقابلوں میں حصہ لیا کرتی تھی لیکن وہ تو گویا اس زمانے کو بالکل بھول ہی چکی تھی۔ اسے تو یوں لگتا تھا جیسے یہ دس گیارہ برس پہلے کی نہیں، بلکہ صدیوں پہلے کی بات تھی۔ کالج سے نکلنے کے بعد تو اس نے جوڈو کراٹے کا کوئی معمولی سا داؤ بھی کہیں نہیں آزمایا تھا اور اس کا خیال یہی تھا کہ وہ سب کچھ بھول بھال چکی ہے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ان بھولے بسرے دنوں کی کچھ نہ کچھ، بچی کھچی طاقت اور پھرتی ابھی اس کے وجود میں باقی تھی مگر وہ ایک دبی ہوئی چنگاری کی طرح تھی جو نفرت اور غصے کی ہوا پا کر شعلہ بن گئی تھی۔

جس نوجوان کے پیٹ میں اس نے نکیلی سلاخ نما دستے والا رنچ گھونپا تھا، اوندھا گرتے ہی وہ یوں ہاتھ پاؤں پٹخنے لگا جیسے قسائی کے ہاتھوں ذبح ہونے والے بکرے کی جان نکل رہی ہو۔ شاید اوندھا گرنے کی وجہ سے رنچ کا ہینڈل اس کے جسم میں اور بھی زیادہ گہرائی تک اُتر گیا ہو۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ اس کی نوک اس بدمعاش کی کمر سے باہر نکل آئی ہو۔ علیزے نے اس دوران ملگجے اندھیرے میں دیکھ لیا کہ اب جو صرف ایک نوجوان باقی رہ گیا تھا، وہ سوکھا سا وہی گہری سانولی رنگت والا نوجوان

تھا جسے اس کے ساتھی ''کالے'' کے نام سے مخاطب کررہے تھے۔
علیزے کے اندازے کے مطابق، جسمانی طور پر اپنے ساتھیوں میں کمزور ترین ہونے کے باوجود اسے ''سردار'' یا ''باس'' کی حیثیت حاصل تھی۔ شاید وہ ان سب سے زیادہ خطرناک تھا لیکن علیزے کا ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ اس کی ساری ''خطرناکی'' گن کی مرہونِ منت تھی۔ شاید وہ انتہائی بے خوفی سے، بے دھڑک اور اندھا دھند گن استعمال کرتا تھا...... اور گن اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ دوسرے ہاتھ میں موبائل تھا جس کی ٹارچ کی روشنی علیزے کے اردگرد لرز رہی تھی۔ علیزے کو اس ایک لمحے کے اندر اندر یہ بھی اندازہ ہوگیا کہ کالے کی گن میں واقعی گولیاں ختم ہو چکی تھیں اور اس کے پاس دوسرا کلپ نہیں تھا ورنہ اب تک وہ نہ جانے کتنے فائر کرچکا ہوتا۔ تاہم اس نے گن کو شاید اس لیے ابھی تک ہاتھ میں دبوچا ہوا تھا کہ دیکھنے والا اس سے خوف زدہ ہوسکتا تھا۔ دوسرے وہ بوقتِ ضرورت گن کو اچھی خاصی ضرب لگانے کے کام تو آسکتی تھی۔
مگر اس وقت اپنے دو ساتھیوں کو اچانک ایسے خوفناک انداز میں ڈھیر ہوتے دیکھ کر یقیناً اس کے ہوش اڑ گئے تھے۔ وہ تینوں تو اپنی دانست میں اس وقت اس فاختہ کی طرح سہمی ہوئی ایک عورت کا تعاقب کررہے تھے۔ یہ چند سیکنڈ کے اندر، اندر کیا ہوگیا تھا؟ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ علیزے نے بے یقینی کے انہی مختصر سے لمحوں سے فائدہ اٹھایا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اب وہ کسی کے منہ پر سپر کک رسید کرنے پر قادر تھی یا نہیں لیکن اس وقت قسمت آزمائی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔
عین اسی لمحے کالا سنبھل کر اپنی گن کو نال کی طرف سے پکڑ کر، غالباً ہتھوڑی کی طرح علیزے کے چہرے پر رسید کرنے کے ارادے سے بڑھا تھا۔ اس کے حلق سے کسی درندے کی ہلکی سی غراہٹ جیسی آواز بھی نکلی تھی۔ وہ شاید ایک بار پھر علیزے کے چہرے پر یا سر پر گن کا دستہ رسید کرنے میں کامیاب ہوجاتا لیکن اسے ایک لمحے کی تاخیر ہوچکی تھی۔ اس وقت تک علیزے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ایڑی کے بل ذرا سا گھوم چکی تھی اور اس کی ایک ٹانگ مشینی انداز میں حرکت میں آچکی تھی۔ اس کا نشانہ بالکل درست رہا۔ اس کے مضبوط جوگر میں چھپے ہوئے پاؤں کی سُپر کک سیدھی کالے کے چہرے پر پڑی۔ جس قسم کی آواز کے ساتھ کالا اچھل کر، ذرا پیچھے جاکر چاروں خانے چت گرا، اس سے علیزے کو امید نظر آئی کہ اگر اس کا جبڑا ٹوٹا نہیں ہوگا تو اپنی جگہ سے بُری طرح ہل ضرور گیا ہوگا۔
فون اور گن، دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے نکل کر اِدھر اُدھر جاگریں۔ اچھی بات یہ ہوئی کہ فون اس طرح گرا تھا کہ اس کی روشنی آسمان کی طرف جارہی تھی لیکن اس کی وجہ سے تھوڑی سی جگہ میں موجود چیزوں کو ملگجے اندھیرے میں دیکھا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی اب علیزے کی آنکھیں اندھیرے میں بھی کسی نہ کسی حد تک دیکھنے کے قابل ہوگئی تھیں۔ کالے کے دونوں ہاتھ اس کے چہرے پر تھے اور وہ ساکت نظر آرہا تھا۔ شاید اس کا سر کسی پتھر یا کسی اور چیز سے ٹکرایا تھا۔ علیزے کو اسے ساکت دیکھ کر بھی اطمینان نہ ہوا۔ اسے اپنا ٹول باکس قریب ہی پڑا نظر آگیا۔
علیزے نے وہ اٹھایا اور محتاط انداز میں کالے کے قریب چلی گئی۔ اس نے ملگجے اندھیرے میں دیکھا، کالے کی آنکھیں کھلی تھیں اور جسم میں خفیف سی حرکت بھی تھی۔ شاید وہ اٹھنا چاہ رہا تھا لیکن اس سے اٹھا نہیں جارہا تھا۔ علیزے نے ٹول باکس کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑا اور کالے کے قریب بیٹھ کر یوں اس کے سر پر پے در پے پوری قوت سے کئی ضربیں لگائیں جیسے سیمنٹ کے بلاک یا کسی بڑی اینٹ سے اس کا سر کچلنے کی کوشش کررہی ہو۔ ہر ضرب پر اس کے جسم کو عجیب سے انداز میں جھٹکا لگتا لیکن پھر ایک ضرب ایسی بھی لگی جس کے بعد اس کا جسم بالکل ساکت ہوگیا۔ علیزے نے ایک ضرب اور لگائی لیکن اس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی۔ اس کا پورا چہرہ خون میں تر تھا۔ علیزے کو اندازہ ہوا کہ اس کی کھوپڑی کئی جگہ سے چٹخ چکی تھی۔
اس نے ٹول باکس وہیں پھینکا اور جلدی سے موبائل فون اٹھالیا جس کی ٹارچ ابھی تک روشن تھی۔ یہ دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا کہ وہ اس کا اپنا فون تھا۔ اسی کی روشنی میں اسے کچھ دور پڑا اپنا ہینڈ بیگ بھی مل گیا۔ اس نے ہینڈ بیگ بغل میں دبایا، فون کی ٹارچ آف کی اور اندھیرے میں جس طرح آئی تھی، اسی طرح واپس دوڑ پڑی۔ اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا کہ ان بدمعاشوں میں سے کوئی اٹھ کر اس کے تعاقب میں آسکتا تھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ وہ چاروں مرچکے تھے پھر بھی

اس نے احتیاطاً ٹارچ بجھادی تھی۔ وہ موبائل کی بیٹری بھی بچانا چاہتی تھی۔

اسے واپس گاڑی تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گاڑی ابھی تک اسی طرح بیریئر میں پھنسی کھڑی تھی لیکن اب اس کے ایک طرف کے دونوں دروازے کھلے تھے۔ اندر جھانک کر اس نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ گاڑی کی چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کے سلسلے میں اس کا ارادہ ایک بار پھر قسمت آزمائی کا تھا لیکن اس سے پہلے وہ گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی۔ بارش تھم چکی تھی لیکن ہوا اب کچھ اور سرد ہو چکی تھی۔ اس ہوا کو لمبی لمبی سانسوں کے ذریعے پھیپھڑوں میں بھرنے سے علیزے کو قدرے سکون اور فرحت کا احساس ہو رہا تھا۔

ہر طرف ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ علیزے نے محسوس کیا کہ شاید یہ سکوتِ مرگ تھا۔ آخر وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مصیبت کے وقت میں پڑھی جانے والی چند آیتیں اسے یاد تھیں لیکن اب تک وہ انہیں بھولے ہوئے تھی۔ اب، جبکہ اصل مصیبت ٹل چکی تھی تو اسے آیتیں یاد آ گئی تھیں۔ اس نے آیتیں پڑھنے کے بعد اگنیشن میں چابی گھمائی۔ دو تین مرتبہ گھمانے پر انجن میں صرف ہلکی سی گھرر گھرر کی آواز پیدا ہوئی۔ اس نے قسمت آزمائی جاری رکھی۔ گھرر گھرر کی آواز میں ذرا تیزی آتی چلی گئی اور آخرکار گاڑی اسٹارٹ ہو ہی گئی۔ وہ بے اختیار ایک طویل اور گہری سانس لے کر رہ گئی۔

قدرے طمانیت بھرے انداز میں سیٹ کے پشتے سے سر ٹکا کر اس نے ہولے ہولے، نہایت احتیاط سے ایکسلریٹر دبا دبا کر انجن کو ذرا گرم کیا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ انجن بند نہیں ہوا۔ اسے اب آگے جانے کی نہیں، بلکہ گاڑی کو ریورس کر کے بیریئر کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کرنا تھی۔ اس کی یہ کوشش کامیاب رہی اور تھوڑی بہت اٹکنے کے بعد بہرحال گاڑی بیریئر کے نیچے سے نکل آئی۔ جس طرح انجن بیدار ہوا تھا، اسی طرح خود علیزے کے رگ و پے میں بھی گویا ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے ہیڈ لائٹس آن کیں اور گاڑی کو کافی پیچھے لے جا کر تیزی سے واپسی کے لیے گھمایا۔

واپسی کے راستے پر تھوڑا سا آگے جا کر اس نے گاڑی روک دی۔ اس کے آگے اب ونڈ اسکرین نہیں تھی۔ سرد ہوا کے تھپیڑوں نے اس کے جسم میں سرد سی لہریں دوڑا دی تھیں لیکن اس کے گاڑی روکنے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ گاڑی روکنے کی وجہ تو یہ تھی کہ اسے اچانک یاد آیا تھا، اس کا موبائل فون اس کے پاس واپس آ چکا تھا اور آج اسے پہلی بار صحیح معنوں میں احساس ہوا تھا کہ موبائل فون آج کے دور کے انسان کی زندگی کا کتنا اہم حصہ تھا۔ اس کے بغیر آج کا انسان ادھورا تھا۔

اس نے فون آن کیا تو دیکھا کہ وقار کی کئی کالز آئی ہوئی تھیں اور یہ کالز ریسیو بھی کی گئی تھیں۔ یقیناً انہی خبیثوں نے ریسیو کی ہوں گی اور نہ جانے وقار سے کیا باتیں کی ہوں گی۔ اس نے کال بیک کرنے کے لیے نمبر پنچ کیا تو اس کی دھڑکنیں ایک بار پھر تیز ہو چکی تھیں۔ وقار نے کال ریسیو کر لی لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس نے ''ہیلو'' بھی نہیں کہا۔ وہ یقیناً یہی سمجھ رہا تھا کہ انہی بدمعاشوں میں سے کوئی اسے کال کر رہا تھا اور جب علیزے نے لرزاں سی آواز میں دھیرے سے ''ہیلو'' کہا تو وقار یک دم ہی دیوانوں کی طرح چیخ اٹھا۔ ''علیزے! تم کہاں ہو؟''

وحشت، پریشانی اور تشویش کی شدت سے اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ جس طرح پہلی ہی بیل پر وقار نے کال ریسیو کر لی تھی اور پھر علیزے کی آواز سُن کر وہ چلایا تھا، اس پر علیزے حیران رہ گئی تھی۔ پہلے تو اس کے لیے یہی حیرت کی بات تھی کہ وقار اس وقت پوری طرح بیدار تھا۔ علیزے کا خیال تو یہی تھا کہ وہ کام ختم کر کے بیڈروم میں خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا ہوگا۔

حیرت سے گم صم ہونے کے باعث وہ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی تو وقار بے تابی سے دوبارہ چلایا۔ ''علیزے! تم کہاں ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم، میں کہاں ہوں۔'' وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ پھر اس نے الٹا، وقار سے سوال کر لیا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں شاپنگ مال پر ہوں۔'' وقار نے گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں اب بھی بے تابی تھی۔ ''تم خیریت سے تو ہو؟''

ایک عرصے سے علیزے کو یہ توقع نہیں رہی تھی کہ کسی بھی قسم کے حالات میں، وقار کے لہجے میں اس کے لیے تشویش اور پریشانی ہو سکتی ہے۔

''میں......؟ ہاں...... میں ٹھیک ہوں......'' علیزے نے دھیمے لہجے میں اٹک، اٹک کر جواب دیا پھر

پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ ''لیکن تم شاپنگ مال کیسے پہنچ گئے؟''
''ظاہر ہے جب تم دیر تک گھر واپس نہیں پہنچیں تو میں پریشان ہو گیا۔ تمہیں فون کیا تو کال ریسیو نہیں ہوئی۔ بچے الگ پریشان تھے۔ وہ ڈونٹس بھول گئے تھے اور صرف تمہیں واپس بُلانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں گاڑی لے کر گھر سے نکل پڑا۔ بچے بھی ضد کر کے ساتھ ہو لیے۔ وہ اس وقت بھی میرے ساتھ ہیں۔ میرا تو خیال تھا کہ شاپنگ مال بند ہو چکا ہو گا لیکن یہاں تو ہجوم لگا ہوا تھا۔ ایک گارڈ کی لاش پڑی تھی۔ پولیس بھی آئی ہوئی تھی۔ صرف ایک آدمی نے مال کے اندر سے دیکھا تھا کہ یہاں کیا ہوا تھا۔ اسی نے باقی سب کو اور پولیس کو بتایا۔ مجھے جب پتا چلا کہ کس حلیے کی خاتون، کس قسم کی گاڑی میں یہاں سے بھاگی ہے، تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ تمہارے سوا کوئی نہیں ہو سکتی...... اور جب مجھے پتا چلا کہ گارڈ کو قتل کرنے والے چار انتہائی بدمعاش اور خطرناک قسم کے آدمی تمہارے پیچھے گئے ہیں تو فکر اور پریشانی سے میرا جو حال ہوا، وہ میں بتا نہیں سکتا۔ کچھ دیر پہلے میں نے یہاں سے پھر کئی بار تمہارا نمبر ٹرائی کیا لیکن ہر بار شاید انہی بدمعاشوں نے کال ریسیو کی۔ اتنی بے ہودہ اور گندی باتیں کر رہے تھے کہ میں بتا نہیں سکتا۔ کاش، میں ان تک پہنچ سکتا اورنہیں شوٹ کر سکتا۔''

پھر جیسے اس کا ذہن اصل مسئلے کی طرف واپس آیا۔ ''لیکن اب وہ بدمعاش کہاں ہیں؟ تم کہاں ہو؟ کیا تم ان کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئی ہو؟ یہ تمہارا فون تو ان کے پاس تھا۔ تمہیں کیسے واپس ملا؟'' اس نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

''بدمعاش تو شاید دوسری دنیا میں ہوں...... لیکن میں نے بتایا نا کہ مجھے نہیں پتا، میں اس وقت کہاں ہوں...... میں اندھا دھند، جس طرف رخ ہوا، گاڑی بھاگتی چلی گئی...... لیکن مجھے یاد ہے کہ میں کہاں کہاں سے آئی ہوں...... کہاں کہاں سے، کس کس طرف گاڑی موڑی تھی۔ مجھے سب یاد ہے...... میں واپس آ جاؤں گی مگر اس سے پہلے میں تمہیں صرف اپنی خیریت کی اطلاع دینا چاہتی تھی۔''

''ایک پولیس موبائل تمہاری تلاش میں نکلی ہوئی ہے۔'' وقار نے بتایا۔ اب اس کا لہجہ قدرے پُرسکون محسوس ہوا۔ ''ایک پولیس موبائل ابھی یہاں بھی کھڑی ہے۔ کافی پولیس والے بھی ہیں۔ گارڈ کی لاش اٹھائی جا چکی ہے۔ ٹی وی چینلز کی بھی دو تین گاڑیاں آ گئی ہیں۔''

''مجھے ابھی تک راستے میں کوئی پولیس موبائل تو کیا، عام راہ گیر بھی دکھائی نہیں دیا...... بہرحال...... میں آ رہی ہوں۔'' اس کا گلا بالکل خشک تھا۔ اسے بولنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ حلق سے عجیب، بیٹھی بیٹھی سی آواز نکل رہی تھی۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ ''میں اپنے موبائل پر لوکیشن آن کرتی ہوں اور یہاں سے اپنی یادداشت کے سہارے واپس روانہ ہوتی ہوں۔ تم وہاں سے پولیس موبائل کو ساتھ لے کر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرو۔ شاید پولیس والوں کی گاڑی میں تو کوئی ٹریکر ٹائپ آلات بھی ہوں۔ تم لوگ اگر راستے میں ہی کہیں مجھے مل جاؤ تو اچھا ہے۔ میں یہاں مزید رکنا نہیں چاہتی۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... تم لوکیشن آن کر کے روانہ ہو جاؤ، میں اس طرح کرنے کی کوشش کرتا ہوں جس طرح تم نے کہا ہے۔'' وقار نے کہا اور فوراً فون بند کر دیا۔

علیزے نے فون بند کر کے لوکیشن آن کی اور فون ڈیش بورڈ پر رکھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اسے معلوم تھا کہ آتے وقت وہ جہاں بائیں ہاتھ پر مڑی تھی، وہاں اب اسے دائیں ہاتھ پر مڑنا تھا اور جہاں وہ دائیں ہاتھ پر مڑی تھی، وہاں اب اسے بائیں ہاتھ پر مڑنا تھا۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ ایک جگہ نشیب میں کسی گاڑی کے پہیے اس کی ہیڈ لائٹس کی زد میں آئے جو آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے تجسس پر قابو نہ رکھ سکی۔ بے اختیار اس کا پاؤں بریک پر پڑ گیا۔ اس نے سائڈ پر گاڑی روکی، اِدھر اُدھر دیکھا، ہر طرف سناٹا، ویرانی اور اندھیرا تھا۔ ونڈ اسکرین نہ ہونے کی وجہ سے ہوا اسے اپنی گاڑی کے اندر سرسراتی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ گاڑی سے اتری اور دبے پیروں سڑک کے دوسری طرف یوں بڑھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی اس کے قدموں کی آہٹ سن لے گا۔ دوسری طرف پہنچ کر اس نے نشیب میں دیکھا۔ اس نے اپنی گاڑی اس طرح کھڑی کی تھی کہ ہیڈ لائٹس کی تھوڑی بہت روشنی وہاں تک پہنچتی رہے۔ اس کا اندازہ درست ہی تھا۔ موڑ وہاں سے قریب ہی تھا اور نشیب میں وہی بڑی سی سیاہ گاڑی الٹی پڑی تھی جو آج کی رات علیزے کے لیے مصیبتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔ اس کی تو صرف ونڈ اسکرین ہی نہیں، کھڑکیوں کے شیشے بھی ٹوٹ گئے تھے۔ چھت پچک گئی تھی۔ موڑ کاٹتے

وقت وہ یقیناً بہت بُری طرح الٹی تھی لیکن ان چاروں خبیثوں کا شاید کچھ نہیں بگڑا تھا اور وہ دندناتے ہوئے اس کے تعاقب میں آ گئے تھے۔ ساری تباہی شاید اس بڑی اور مضبوط گاڑی نے اپنے اوپر ہی سہہ لی تھی، بدبخت مسافروں کو کوئی گزند پہنچنے نہیں دی تھی۔

وہ ایک طویل اور قدرے اطمینان بھری سانس لے کر واپس اپنی گاڑی میں آن بیٹھی اور ایک بار پھر ڈرائیو کرنے لگی۔ اب اسے اپنا سفر کچھ زیادہ مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ جلد ہی اسے شہری آبادی کے آثار کھائی دینے لگے۔ پندرہ بیس منٹ کے سفر کے بعد اسے یوں لگا جیسے وہ شاپنگ مال سے زیادہ دور نہیں تھی اور عین اسی وقت اسے سامنے، کچھ دور، ایک موڑ سے یکے بعد دیگرے کئی ہیڈ لائٹس نمودار ہوتی دکھائی دیں۔ علیزے اتنی ہیڈ لائٹس دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو خوف زدہ ہو گئی لیکن دوسرے ہی لمحے یہ دیکھ کر اس نے قدرے اطمینان کی سانس لی کہ ان میں سب سے آگے والی گاڑی کی چھت پر لال نیلی روشنیوں والی بتی گھوم رہی تھی اور وہ گاڑی کچھ اونچی بھی معلوم ہوتی تھی۔ شاید وہ پولیس موبائل تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی تصدیق بھی ہو گئی کیونکہ سڑک کے کنارے لگے کھمبوں پر لائٹس آن ہو گئی تھیں۔ بارش تھمے کافی دیر ہو گئی تھی، شاید اس لیے لائٹ آ گئی تھی۔ علیزے کو اندازہ ہوا کہ وہ شہری آبادی کی حدود میں آ چکی تھی۔

شاید علیزے کی گاڑی کو دیکھ کر پولیس موبائل اسی کی سائڈ پر ہو گئی اور اس کے پیچھے پیچھے دوسری گاڑیاں بھی اسی طرف ہو گئیں۔ اب چند گاڑیوں کا وہ قافلہ اور علیزے کی گاڑی آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ علیزے نے رفتار کم کر دی اور ڈرائیونگ میں کچھ اور محتاط ہو گئی۔ چند لمحے بعد اس کی گاڑی اور پولیس موبائل آمنے سامنے رک گئیں۔ موبائل کے پیچھے دوسری گاڑیاں بھی رک گئیں۔ موبائل کے دروازے کھلے۔ اس کے کیبن اور پچھلے حصے سے بیک وقت پانچ چھ پولیس والے اتر کر علیزے کی گاڑی کی طرف لپکے۔ وہ کلاشنکوفیں اٹھائے ہوئے تھے۔ سب سے آگے غالباً ایک انسپکٹر تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور وہ اسے یوں لہرا رہا تھا جیسے اسے علیزے کی گاڑی سے کسی دہشت گرد کے برآمد ہونے کی توقع تھی اور وہ فوری طور پر اسے گولی مارنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

علیزے پر یکدم اتنی تھکن طاری ہو گئی تھی کہ اس کا گاڑی سے اُترنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے ہمت کر کے کسی نہ کسی طرح گاڑی سے اتر جانا ہی بہتر سمجھا۔ اسے پولیس والوں سے خوف محسوس ہوا تھا کہ وہ کسی غلط فہمی میں، یا اپنی کسی احمقانہ سوچ کے تحت فائرنگ نہ شروع کر دیں۔

وہ گاڑی سے اتری تو اس نے دیکھا کہ پولیس موبائل کے پیچھے والی گاڑیوں سے بھی کئی افراد اتر کر اس کی طرف دوڑے آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں مائیک تھے اور چند لوگ کیمرے اور ٹرائی پوڈ وغیرہ اٹھائے ہوئے تھے۔ تب ہی علیزے کو پولیس موبائل کے پیچھے کھڑی، وین ٹائپ گاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی ڈشیں بھی لگی دکھائی دیں اور اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ ٹی وی چینلز کے لوگ تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شاپنگ مال سے پولیس وقار کے کہنے پر علیزے کی تلاش میں روانہ ہوئی تو میڈیا کے جو لوگ وہاں موجود تھے، وہ بھی پولیس کے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے۔

پھر علیزے کو وقار بھی نظر آ گیا۔ وہ سب سے پیچھے تھا لیکن اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ساتھ دونوں بچے بھی تھے۔ بچے نہ تو اتنے چھوٹے تھے کہ وہ دونوں کو بیک وقت گود میں اٹھا کر دوڑ سکتا اور نہ ہی اتنے بڑے تھے کہ دوڑنے میں اس کی رفتار کا ساتھ دے سکتے۔ اس لیے وہ دوڑنے کے انداز میں، چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔

پولیس والوں نے یوں علیزے اور اس کی گاڑی کو گھیر لیا جیسے وہی ان کی مطلوبہ مجرم ہو۔ علیزے کے خیال میں اس پولیس پارٹی کا لیڈر وہی انسپکٹر تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ وہ اب بھی متلاشی انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پستول کو حرکت دیے جا رہا تھا۔

''کہاں ہیں وہ لوگ؟'' آخر اس نے علیزے پر نظر جما کر متوحش سے انداز میں پوچھا۔

''کون لوگ؟'' علیزے نے تھوک نگل کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''وہی...... جن سے آپ ڈر کر بھاگی تھیں...... اور جو آپ کے پیچھے روانہ ہوئے تھے؟'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے، وہ مر چکے ہیں۔'' علیزے نے گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے جواب دیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے گرد اب باقاعدہ ایک ہجوم ہو چکا تھا۔ کئی کیمروں کا رخ اس کی، اور پولیس انسپکٹر کی طرف تھا۔ کچھ مائیک بھی تھے، جنہیں اس کے منہ کے زیادہ سے زیادہ قریب لانے

کی کوشش کی جا رہی تھی۔ پولیس والے میڈیا کے لوگوں کو پیچھے دھکیلنے اور خود آگے آنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن بظاہر وہ پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی کو دھکم پیل کا احساس نہ ہو۔

"مر چکے ہیں؟" انسپکٹر نے بے یقینی سے دہرایا۔ "کس نے مارا انہیں؟"

"میں نے....." علیزے نے دھیمے لہجے میں گویا اقرارِ جرم کیا پھر جلدی سے اپنی صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولی۔ "لیکن یہ مجبوری تھی..... میں انہیں نہ مارتی تو وہ نہ جانے میرا کیا حشر کرتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے میڈم....." انسپکٹر اپنے چاروں طرف موجود لوگوں کو ایک نظر دیکھ کر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "لیکن..... میرا مطلب ہے..... آپ نے انہیں کیسے مارا؟ کیا آپ کے پاس کوئی گن وغیرہ تھی؟"

"نہیں..... گن تو ان کے پاس تھی۔" علیزے نے سادگی سے جواب دیا۔

انسپکٹر کے ہاتھ سے گویا اس کی اپنی گن گرتے گرتے بچی۔ اس نے بے وقوفوں کی طرح چاروں طرف دیکھا۔ شاید اسے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ میڈیا والوں کے چہروں پر بھی بے یقینی تھی۔ ایک رپورٹر تو مائیک تھامے استہزائیہ انداز میں مسکرا بھی رہا تھا۔

"تو..... وہ لوگ اب کہاں ہیں..... میرا مطلب ہے..... ان کی لاشیں کہاں ہیں؟" انسپکٹر نے اٹک اٹک کر پوچھا۔ اس کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ علیزے سے کیا سوال کرے۔

"مجھے نہیں معلوم، ان کی لاشیں کہاں ہیں..... میرا مطلب ہے..... مجھے نہیں پتا، اس جگہ کا نام کیا ہے..... اور وہ کون سا علاقہ ہے..... لیکن اگر آپ چاہیں تو میں آپ لوگوں کو وہاں تک لے جا سکتی ہوں..... راستہ مجھے یاد ہے..... اسی لیے میں واپس بھی پہنچ گئی ہوں..... ورنہ شاید واپسی کے سفر میں بھی بھٹک جاتی۔" علیزے نے بھی اٹک اٹک کر جواب دیا۔

اس دوران وقار پولیس اور ٹی وی چینلز کے لوگوں کو بے خوفی اور قدرے غصے سے دھکیلتا ہوا علیزے کے سامنے آ گیا۔ وہ نہ صرف خود علیزے کے قریب آیا تھا بلکہ بچوں کو بھی اپنے ساتھ علیزے تک لے آیا تھا۔ دونوں بچے علیزے سے لپٹ گئے۔ وہ روہانسے ہو رہے تھے۔ علیزے نے جھک کر انہیں کچھ اور زیادہ زور سے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔

ان میں سے ایک روتے ہوئے بولا۔ "سوری مما..... ہم آئندہ کبھی کوئی فرمائش نہیں کریں گے..... کبھی آپ کو رات میں باہر جانے نہیں دیں گے۔"

پھر علیزے کو احساس ہوا کہ وقار نے اس کا بازو اتنے زور سے پکڑا ہوا تھا کہ اسے درد محسوس ہونے لگا تھا۔ اس نے سیدھی ہوتے ہوئے وقار کی طرف دیکھا تو اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ وقار کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ علیزے نے اس سے پہلے کبھی وقار کو روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

"علیزے..... میری جان..... تم ٹھیک تو ہونا.....؟ کسی نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا؟" وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ اس سے گویا بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔

"نہیں..... مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچا..... بس..... گاڑی کی ونڈ اسکرین ٹوٹ گئی ہے۔" علیزے نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں جواب دیا پھر گویا ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "وقار! تم میرے لیے رو رہے ہو؟"

"نہیں، میں تو گاڑی کی ونڈ اسکرین کے لیے رو رہا ہوں۔" وقار گویا اپنے آنسوؤں کو بھول کر جلے بھنے سے انداز میں بولا۔

"وقار..... کہیں میں خوشی سے مر نہ جاؤں۔" علیزے نے ڈوبتی سی آواز میں کہا اور وقار کے بازوؤں میں جھول گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔

وقار نے گھبرا کر اس کی نبض وغیرہ چیک کی، پھر سر گھما کر چاروں طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا۔ "میری مسز بے ہوش ہو گئی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ جس آزمائش سے گزر کر آئی ہیں اب اس کے اثر سے ان کے اعصاب جواب دے گئے ہیں۔ انہیں اسپتال لے جانا پڑے گا۔"

انسپکٹر اپنا پستول ہولسٹر میں رکھتے ہوئے متاسفانہ انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "آزمائش واز مائش کی بات نہیں ہے جی۔ آپ نے سنا نہیں..... وہ کہہ رہی تھیں کہ میں کہیں خوشی سے مر نہ جاؤں..... وہ تو شکر ہے، انہوں نے صرف بے ہوش ہونے پر گزارا کر لیا ہے۔ ویسے..... آپس کی بات ہے..... لوگوں کو صدمے سے بے ہوش ہوتے تو دیکھا تھا۔ آج پہلی بار کسی خاتون کو خوشی سے بے ہوش ہوتے دیکھا ہے۔" پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اپنے کسی ماتحت سے کہا۔ "اوئے نواز! ایمبولینس کے لیے فون کر....."

❖❖❖

سلگتے خواب

یعقوب بھٹی

خواب دیکھنے والی آنکھوں کو خوابوں کی کڑی قیمت ادا کرنا پڑتی ہے... آزادی سے دُور... دورِ غلامی میں شب و روز بِتانے والے... دشمن کی انتقامی کارروائیوں اور سازشی حربوں سے ہر دم نبرد آزما رہتے ہیں... انقلاب پسندوں اور آزادی کے جنونی متوالوں کی جدوجہد اس وقت تک جاری و ساری رہتی ہے... جب تک ان کے قدم مقدس سر زمینِ وطن کی خاک کو نہ چھولیں... خون کے نذرانے پیش کرنے والے ایسے ہی سرفروشوں کی لہو رنگ داستانِ لازوال... آزاد فضائوں میں سانس لینے کی بے تاب تمنائوں نے انہیں مصائب و آلام کی کٹھن گھڑیوں سے گزرنے کے باوجود ثابت قدم بنا رکھا تھا...

دہکتی آگ کے شعلوں میں گھری وادی......

اونچے چناروں میں کھوئی کہانی کے سنسنی خیز موڑ

ایلس ہیلز اور اس کے میڈیا گروپ کا جموں و کشمیر کا دورہ مکمل ہو چکا تھا۔

ایلس کا تعلق بین الاقوامی الیکٹرک میڈیا گروپ سے تھا۔ جموں و کشمیر کی صورتِ حال سے بین الاقوامی برادری کو مطمئن کرنے کے لیے بھارتی وزارتِ خارجہ نے اس میڈیا گروپ کی خدمات حاصل کی تھیں۔

بظاہر تو یہ میڈیا گروپ غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کا علمبردار تھا مگر باخبر لوگ جانتے تھے کہ یہ میڈیا گروپ سفید

کوسیاہ اور سیاہ کو سفید دکھانے میں بڑی پیشہ ورانہ مہارت رکھتا ہے۔

منہ مانگے معاوضے کے بدلے اس گروپ کی میڈیا ٹیم اپنی رپورٹ مکمل کر چکی تھی۔ مہذب دنیا کو مقبوضہ کشمیر کی صورتِ حال کا صرف وہی رخ دکھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو بھارتی حکومت چاہتی تھی۔

ایلس ٹیم انچارج تھی۔ وہ تیس سال کی لمبی، تڑنگی اور پُرکشش خدوخال کی حامل تھی۔ اس وقت وہ سرینگر میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں تھی۔ اپنا سامان وہ پیک کر چکی تھی۔ علی الصباح ان کی نیودہلی کے لیے پرواز تھی جہاں سے شام سات بجے ایک اور پرواز سے اس ٹیم کو اپنے ملک لوٹ جانا تھا۔

ایلس نے کمرے کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سامنے مشہورِ زمانہ ڈل جھیل اپنی وسعت اور فطری خوب صورتی کے ساتھ عیاں تھی۔ جھیل میں تیرتے شکارے، کشتیوں میں قائم دکانیں اور رہائشی ہوٹل۔ بظاہر ہر طرف سکوت نظر آتا تھا مگر اس سکوت کے نیچے طوفان پلتے محسوس ہوتے تھے۔ جبر کی غیر مرئی زنجیر صاف محسوس ہوتی تھی جس نے اس ساری فطری خوب صورتی کو گہنا دیا تھا۔ ستے چہروں والے مقامی افراد...... جن کی آنکھوں سے ہراس جھلکتا تھا۔ ایلس اس جبر اور ہراس سے آنکھیں چراتی آئی تھی۔ اس ''چوری'' کے سبب دل میں بے کلی نے مستقل ڈیرے ڈال لیے تھے۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس جنت نظیر وادی کے اسّی لاکھ سے زائد مکین نو لاکھ قابض بھارتی فوج کے ہاتھوں یرغمال بن چکے ہیں اور جبر کے سائے میں اپنے شب و روز گزارنے پر مجبور ہیں۔

ایلس نے گہرا سانس لے کر دل کی بے کلی کو دبانے کی کوشش کی اور سوچوں کا رخ اپنے بوائے فرینڈ کیری اوبرائے کی طرف موڑ دیا۔ واپسی پر بونس کی بھاری رقم کے ساتھ اس نے کیری کے ساتھ کریبین جزائر میں طویل چھٹیاں گزارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

چمکتا سورج، سفید ریت، شفاف پانیوں والے ساحل اور کیری کی مضبوط بانہیں۔ اس نے آنکھیں موند کر خود کو نشے میں ڈبونے کی کوشش شروع کر دی۔

میڈیا گروپ کی طرف سے دیا جانے والا ٹاسک تو اس نے بخوبی پورا کر دیا تھا مگر کسی ''اور'' کی طرف سے دیے جانے والے ٹاسک کو پورا کرنے سے وہ قاصر رہی تھی۔

حفاظت کی غرض سے سر پر مسلط حفاظتی دستے کے سبب وہ اپنی مرضی سے ایک قدم بھی دوسرے ٹاسک کی طرف نہیں بڑھا سکتی تھی۔ جواب دہی کی فکر دامن گیر تھی مگر وہ مطمئن تھی کہ اس کی مجبوری کو سمجھ لیا جائے گا۔

☆☆☆

علی ڈار شکارے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ پچیس، چھبیس سال کا مضبوط کاٹھی کا کشمیری نوجوان تھا۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اس کی گہری نظریں ڈل جھیل کے پار ہوٹل سرینگر کی چار منزلہ عمارت کا جائزہ لے رہی تھیں۔

زعفرانی چائے ذائقے میں اپنی مثال آپ تھی۔ چائے کا ڈسپوزایبل کپ اس نے کچھ دیر پہلے ایک تیرتے ہوئے چائے خانے سے خریدا تھا۔

کشتی کا ملاح ایک ضعیف العمر کشمیری مسلمان تھا۔ اندر کو دھنسی دھندلی آنکھیں، بے ترتیب سر اور چہرے کے سفید بال، مدقوق جسم۔ پہلی نظر میں وہ ایک ایسا شخص نظر آتا تھا جس پر موت سایہ فگن محسوس ہوتی تھی۔ اس کی دھندلی آنکھوں میں جھانکنے پر آپوں آپ ہی دل میں القا سا ہوتا تھا کہ ان آنکھوں سے کوئی بہت بڑا خواب نوچ لیا گیا ہے۔

علی کی طرح وہ بزرگ بھی حسبِ روایت کشمیری چغے میں ملبوس تھا۔ چائے کا کپ ہونٹوں کے قریب لاتے ہوئے علی نے آہستگی سے کہا۔

''بابا! ہوٹل کی طرف۔''

بابا نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا مگر چند لمحوں میں ہی شکارے کا رخ تبدیل ہو گیا تھا۔

علی کی گہری نظریں گردوپیش پر تھیں۔ قابض افواج کی موٹر بوٹس وسیع و عریض جھیل میں گشت پر رہتی تھیں۔ یہ گشت عموماً ویران حصوں تک ہی محدود رہتا تھا مگر یہ شترِ بے مہار بوٹس سیاحوں کے رونق میلے والے حصے کی طرف بھی کبھی کبھار آنکلتی تھیں۔

جھیل میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ اس ''دنیا'' پر نظر رکھنے کا کام قابض افواج مقامی غداروں سے لیتی تھی۔ جنہیں ''ہوم گارڈ'' کا خوشنما نام دیا گیا تھا۔

علی کو زیادہ خطرہ انہی نام نہاد ہوم گارڈز سے تھا جنہوں نے اس جھیل میں اپنی کاروباری سرگرمیوں کے تحفظ کی خاطر اپنے ضمیر کو بیچ دیا تھا۔

''کیا خبر ہے بابا؟'' علی نے کھلے پانی میں آتے ہی مبہم سوال کر دیا۔

''چھ افراد ہیں۔ صبح پانچ بجے فوجی انہیں ہوٹل سے ائرپورٹ لے جائیں گے۔'' بابا کی آواز اتنی مدھم تھی کہ پوری کوشش سے ہی علی سن پایا تھا۔

بابا نے مزید کہا۔ ''سادہ لباس میں چھ کمانڈوز ان کے ساتھ ہی مقیم ہیں۔ ہوٹل کی پارکنگ میں بھی ایک مشین گن بردار گاڑی آن ڈیوٹی رہتی ہے۔''

علی بظاہر چائے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے جھیل کی قدرتی خوب صورتی میں ڈوبا تھا مگر کان بابا کی طرف لگے ہوئے تھے۔

بابا کے خاموش ہوتے ہی علی نے کہا۔ ''ہوٹل کی طرف ہماری پوزیشن کیا ہے؟''

''رضا، حمران اور آیت اپنی جگہ مضبوط کر چکے ہیں۔ رضا کچن میں، حمران پارکنگ میں اور آیت روم سروس۔ تینوں ہی چھوٹے ہتھیاروں سے لیس ہیں۔''

علی نے سب سے اہم سوال کیا۔ ''رابطے کا ذریعہ کیا ہے؟''

''صرف ہونٹ اور کان۔''

علی نے ہونٹ بھینچ لیے۔ تحریک ہتھیاروں کی طرح اس شعبے میں بھی کمزور تھی۔ صرف غیر معمولی جذبے اور خون سے ہی آزادی کی اس کمزور سی تحریک کو سینچا جا رہا تھا۔ بیرونی امداد کا ہر راستہ قابض افواج اور عیارانہ ڈپلومیسی کے سبب بند تھا۔

عیارانہ ڈپلومیسی پوری طرح سے کامیاب تھی۔ امداد دینے کے خواہش منداس وجہ سے بے حد مجبور تھے کہ ایسی کسی کوشش کو فوراً ''اسلامک دہشت گردی'' سے جوڑنے کے لیے نام نہاد مہذب دنیا تیار بیٹھی تھی اور یہ بہت بڑا المیہ تھا۔ مظلوم کشمیری پیلٹ گنز، ٹینک، توپوں، مشین گنوں کا مقابلہ محدود تعداد میں فوجی مال خانوں سے چوری ہونے والے اور مہنگے ترین داموں ملنے والے اسلحے، پتھروں اور اپنے جذبۂ آزادی سے سرشار سینوں سے کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ ان کا مقابلہ جاسوسی کے ایک بہت بڑے نیٹ ورک سے بھی تھا۔ ہزاروں شکاری کتے حریت پسندوں کی خوشبو سونگھتے پھر رہے تھے۔

بابا نے کہا۔ ''تمہارا انتظار ہو رہا تھا۔ جو کرنا ہے تم ہی کو کرنا ہے۔ آیت کی رپورٹ ہے کہ ان لوگوں میں سب سے اہم ایلس نام کی ایک لڑکی ہے۔ غالباً ٹیم انچارج ہے۔ ساری بیٹھکوں میں وہی نمایاں رہتی ہے۔ وقت محدود ہے۔ ہوٹل والوں کو جو منصوبہ دینا ہے، وہ بھی جلد دو اور جو کچھ اور چاہیے وہ بھی بتاؤ۔ بھرپور کوشش کی جائے گی تمہیں سب مہیا کر دیا جائے۔''

علی نے کہا۔ ''فی الحال مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔'' اس کا دماغ ایک منصوبے کے خدوخال میں الجھا ہوا تھا۔

بابا ویسے ہی خاموش ہو جاتا۔ ایک چھوٹا سا شکارا ان کی طرف آ رہا تھا۔ اس شکارے میں فروٹ کی دکان سجی تھی۔ قریب آتے ہی نوجوان کشمیری دکان دار نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی اور بڑے مہذبانہ انداز میں کہا۔

''صاحب! تازہ اور صاف پانی سے دُھلے ہوئے پھل حاضر ہیں۔ چاہیں تو فروٹ چاٹ بھی بنا کر دے سکتا ہوں۔''

علی نے ہاتھ میں تھامے چائے کے کپ میں جھانکا۔ کپ نصف کے قریب بھرا ہوا تھا۔ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ''چاٹ ہی مناسب رہے گی۔ بشرطیکہ میری چائے تم لے لو۔''

''کیوں نہیں صاحب!'' نوجوان کے مشاق ہاتھ تیزی سے رواں ہو گئے۔

بابا چپو تھامے لاتعلق سا بیٹھا تھا۔

ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ڈسپوزایبل پلیٹ مختلف پھلوں کے نفاست سے کٹے ہوئے ٹکڑوں سے بھر گئی۔ نوجوان نے ان پر مسالا چھڑکا۔ ٹوتھ پک سیب کے ٹکڑے میں پیوست کی اور پلیٹ علی کو تھما دی۔

علی نے پلیٹ لیتے ہوئے چائے کا کپ نوجوان کو پکڑا دیا۔ ''کتنے ہوئے پیسے؟''

''نوّے روپے صاحب!'' نوجوان نے دانت نکالے۔

علی نے سو روپے کا نوٹ اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''باقی رکھ لو۔''

نوجوان نے باچھیں پھیلاتے ہوئے نوٹ اپنے چغے کی اندرونی جیب میں منتقل کیا اور علی پر گہری سی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ایک کشمیری کو ڈل کی سیاحت کرتے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ غالباً باہر سے آئے ہیں؟''

''باہر سے تو نہیں۔ میں بارہ مولا میں رہتا ہوں۔ تعلیم مکمل کرنے کے لیے طویل عرصہ پونا میں رہا ہوں۔ ڈل دیکھے عرصہ بیت گیا تھا۔ سوچا دیکھ آؤں۔'' علی نے تفصیل سے کہا۔

نوجوان نے حسبِ عادت پھر دانت چمکائے اور بابا

کی طرف متوجہ ہوا۔ ”شاہ بابا! آپ کا کیا حال ہے؟“
بابا نے روکھے سے انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہوں۔“
نوجوان شکارے کا رخ موڑ کر کسی اور گاہک کی تلاش میں نکل گیا۔
اس کے دور جاتے ہی بابا کی اضطرابی آواز اُبھری۔ ”یہ کُتا ہے۔ دعا کرو خیریت رہے۔“ کتے کی اصطلاح غدار کے لیے استعمال ہوتی تھی۔
علی بھی اضطراب کا شکار ہو گیا۔ بابا نے تیزی سے چپّو چلائے اور سرینگر ہوٹل کے خدوخال نمایاں تر ہوتے گئے۔ جھیل کی طرف ہوٹل کا عقب تھا۔ کمروں کی کھڑکیاں جھیل کی طرف کھلتی تھیں۔ جھیل کے کنارے سے لے کر ہوٹل تک کی زمین ہوٹل ہی کی ملکیت تھی۔ اس طرف سبزہ زار تھا جس پر جگہ جگہ لان چیئرز پھیلی تھیں۔ ایک جیٹی بھی تھی۔ جہاں ہوٹل کی ملکیت شکارے اور موٹر بوٹس لنگر انداز تھیں۔ سبز گھاس اور پھولوں کے قطعوں کے درمیان سفید لان چیئرز بڑی بھلی لگ رہی تھیں مگر ویرانی بھی منہ چڑا رہی تھی۔ سیاحوں کی آمد نہ ہونے کے برابر تھی اور غیر ملکی سیاح تو اب قسمت سے ہی نظر آتے تھے۔
نئے الیکشن کے بعد سے تو حالات اور بھی ابتر تھے۔ قابض افواج کے نئے دستوں کی روز کی بنیاد پر آمد جاری تھی۔ پوری وادی ایک نئے خوف میں جکڑی ہوئی تھی۔ کسی انہونی کے خوف سے دل لرز رہے تھے۔
علی کے دماغ میں پنپتے منصوبے میں تیزی سے رنگ بھرنے لگے تھے۔ اس نے بابا کو شکارا واپس موڑنے کے لیے کہا۔
انہوں نے رخ موڑا ہی تھا کہ قابض افواج کی سیاہ بوٹ ڈل کے پانی کو چیرتی ہوئی تیزی سے ان کی طرف آتی نظر آئی۔ بوٹ میں نصب مشین گن دور ہی سے چمکتی نظر آرہی تھی۔
بابا نے زہریلے انداز میں کہا۔ ”کتے کی زبان حلق سے باہر آہی گئی ہے۔“
علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں۔ میری پوزیشن مضبوط ہے۔ انہیں مطمئن کر لوں گا۔“
لمحوں میں موٹر بوٹ ان کے قریب پہنچ گئی۔ بوٹ میں سبز دھبّے دار وردیوں اور بلٹ پروف جیکٹوں میں ملبوس چار سیاہ رو اہلکار سوار تھے۔ ان کا تعلق تامل رائفلز سے تھا۔
بابا نے شکارا روک دیا۔
مشین گن پر تعینات اہلکار نے مشین گن کا رخ شکارے کی طرف کر دیا تھا۔
شکارے کے ساتھ لگتے ہی ایک درشت چہرے والے اہلکار نے علی پر نگاہیں گاڑیں۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں مہاشے؟“
علی نے نرمی سے کہا۔ ”کیا ہو سکتا ہے جناب! ذرا ڈل میں آوارہ گردی ہو رہی ہے۔“
درشت چہرے والا اہلکار جو سینئر تھا، رمزیہ انداز میں بولا۔ ”ایک کشمیری......ڈل کی سیاحت کر رہا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ الٹے بانس بریلی کو۔“
محاورے کے استعمال پر اس کے دیگر ساتھیوں نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ دوسرے اہلکار نے کہا۔ ”اسے ذرا کیمپ کی بھی آوارہ گردی کروا دیتے ہیں۔ مجھے تو شکل سے ہی آتنگ وادی لگ رہا ہے۔“
علی نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے جناب۔ میں محبِ وطن انڈین ہوں۔ پڑھائی کے سلسلے میں کشمیر سے دور رہا ہوں۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر ذرا سیر و تفریح کو نکلا ہوں۔“
سینئر نے کہا۔ ”آئی ڈی کارڈ دکھا۔“
علی نے پرس میں سے کارڈ نکال کر سینئر کو تھماتے ہوئے کہا۔ ”میرا تعلق بارہ مولا کی ڈار فیملی سے ہے۔ ہماری فیملی کی اپنے ملک انڈیا کے لیے خدمات سے زمانہ واقف ہے۔ آتنگ وادی ہمیں نشانہ بنانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ الٹا آپ کے لوگ مجھے آتنگ وادی سمجھ رہے ہیں۔ میرے لیے یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔“
کارڈ اور علی کی لفاظی کام آگئی۔ سینئر مطمئن نظر آنے لگا۔ اس نے علی سے دو، تین سوال اس کی فیملی سے متعلق کیے اور پھر کارڈ اسے واپس کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”سیر و تفریح کے لیے حالات مناسب نہیں ہیں۔ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے، بہتر ہے گھر واپس چلے جاؤ۔“
”اس آگاہی کے لیے آپ کا شکریہ۔ میں صبح ہی بارہ مولا لوٹ جاتا ہوں۔“
سینئر اب بابا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تیری طرف خاموشی ہی خاموشی ہے۔ کوئی خبر نہیں دے رہا۔ کہیں آتنگ وادیوں سے تو نہیں مل گیا تو؟“
بابا نے چپّو چھوڑ کر ہاتھ باندھے۔ ”کیسی بات کرتے ہو مائی باپ۔ میں تو روزگار کے ان دشمنوں کا سب سے بڑا مخالف ہوں۔ کسی لونڈے، لپاڑے پر شک ہوتے ہی آپ

کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔''
سینئر نے بابا پر نظریں جمائیں۔ ''ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرنا...... نہیں تو......''
بابا نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا مائی باپ۔''
سینئر نے اثبات میں سر ہلایا۔ موٹر بوٹ اسٹارٹ ہوئی اور واپس مڑ گئی۔
بابا نے اطمینان کا گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''شکر ہے۔ ورنہ یہ آسانی سے ٹلنے والے نہیں تھے۔''
علی کی نظریں تیزی سے دور ہوتی موٹر بوٹ پر جمی تھیں۔
علی واپس رہائشی شکارے پر لوٹ آیا۔ بابا اسے چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ علی مخروطی شکل کے رہائشی کمرے میں لیٹ گیا۔ کھڑکیوں پر اس نے پردے کھینچ دیے تھے۔ اس کا ذہن تیزی سے رواں تھا۔ دو گھنٹوں کے اندر، اندر اس نے ایک قابلِ عمل منصوبہ بنا لیا تھا۔
تحریک سے وابستہ میزبان نے اس کے کہنے پر بابا کو بلا لیا۔ باقی کے معاملات تیزی سے طے ہوئے اور ہر کوئی اپنے کام پر لگ گیا۔

☆☆☆

رات کے بارہ بجتے ہی رضا اور آیت حرکت میں آ گئے۔ حمدان بیک اَپ کے لیے پارکنگ میں چوکس تھا۔ غیر ملکی مہمانوں اور ان کی حفاظت پر مامور کمانڈوز کے لیے پورا فلور مخصوص تھا۔ ویسے بھی ہوٹل کے زیادہ تر کمرے خالی ہی پڑے ہوئے تھے۔
مہمانوں اور کمانڈوز کو کھانا سرو کرنے کی ذمّے داری آیت کی تھی۔ وہ چھریرے جسم کی خوش شکل لڑکی تھی۔ اس ڈیوٹی کے دوران اسے کمانڈوز کی چھیڑ چھاڑ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ سب اس کی روح پر زخموں کی صورت نقش ہو رہا تھا۔
رات کے کھانے میں آیت نے مہمانوں اور کمانڈوز کو ایک بے رنگ و بو خواب آور دوا دے دی تھی جس کے بعد وہ سبھی گہری نیند میں غرق ہو چکے تھے۔
ہوٹل کے کچن سے چائے اور لوازمات کی ٹرالی تھام کر رضا مہمانوں والے فلور کی طرف بڑھا۔ مدد کے لیے آیت اس کے ساتھ تھی۔ یہ روٹین ورک تھا۔ اس لیے کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہ ہوا۔
وہ مطلوبہ فلور تک آرام سے پہنچ گئے۔ یہاں سپروائزر آن ڈیوٹی تھا۔ وہ، انہیں دیکھ کر حیران ہوا۔
''چائے کون پیے گا۔ یہاں تو ہر طرف خاموشی ہے؟''
''آرڈر ہے۔'' آیت نے کندھے اچکائے۔
رضا ٹرالی چھوڑ کر حرکت میں آنے کے لیے تیار تھا۔ جیسے ہی سپروائزر نے رخ موڑا، اس پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ رضا کا ایک ہاتھ اس کے منہ پر آیا۔ دوسرے پل وزنی پسٹل جو کپڑے میں لپٹا ہوا تھا، اس کی کنپٹی پر پڑا اور پھر چراغوں میں روشنی نہ رہی۔
رضا نے اسے بازوؤں میں سنبھال کر آرام سے راہداری میں بچھے دبیز قالین پر لٹا دیا۔ اس دوران آیت کے ہاتھوں میں بھی پسٹل نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بجلی کی سی پھرتی سے کمانڈوز والے کمرے کا بھی جائزہ لے لیا تھا۔ زود اثر دوا نے ان لوگوں کو دروازے اندر سے بند کرنے کا بھی موقع نہیں دیا تھا۔
رضا اور آیت نے لمحوں میں مہمانوں کا بھی جائزہ لے لیا۔ سبھی انٹاغفیل پڑے تھے۔
رضا بولا۔ ''فلور کا دروازہ اندر سے بند کر دو۔ ہمارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔ ہماری کارروائی زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکے گی۔''
آیت اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔
رضا دوڑتا ہوا کمانڈوز والے وسیع و عریض کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے کی کھڑکی کھول کر اس نے جیب سے چھوٹی مگر طاقتور ٹارچ نکالی اور مخصوص سگنل دے کر ٹارچ آف کر دی۔
کمرے میں مُرداروں کی طرح پڑے بھارتی سورماؤں پر اس نے نفرت انگیز نظر ڈالی۔ وہ بے ترتیب کپڑوں کے مانند پورے کمرے میں بکھرے پڑے تھے۔ ان کے ہتھیار البتہ ایک کونے میں ترتیب سے رکھے تھے۔
جدید ترین مختصر سائز کی MI رائفلیں دیکھتے ہی رضا کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ ندیدوں کے مانند رائفلوں پر جھپٹا۔ ایمونیشن، بریٹا پسٹل، دستی بم، کمانڈو خنجر وہاں بہت کچھ تھا۔ اپنا پسٹل پوشیدہ کر کے اس نے ایک MI سنبھال لی۔ طاقتور ہتھیار کے لمس نے سینے میں مچلتے طوفان کو دوچند کر دیا۔ دل میں آئی کہ مرداروں کی طرح پڑے بھارتی سورماؤں کو چھلنی کر دے مگر اپنی کیفیت پر اس نے قابو پا لیا۔ وہ اس مشن کا لیڈر نہیں تھا۔

☆☆☆

آسمان پر بادلوں کا راج تھا۔ ڈل پر تاریکی نے اپنے پَر پھیلا رکھے تھے۔ یہ تاریکی آزادی کے متوالوں کے لیے بڑی سازگار تھی۔

علی اور تحریک کا ایک کارکن مامون مکمل سیاہ لباس میں تاریکی کا ہی حصہ لگ رہے تھے۔ وہ ایک چھوٹے شکارے پر بے حد خاموشی سے سرینگر ہوٹل کے عقبی سبزہ زار تک پہنچے تھے۔ دونوں اس وقت جیٹی کی سیڑھیوں کے نیچے دبکے ہوئے تھے۔

منصوبے کے مطابق تو ان کی واپسی شکارے پر خاموشی سے ہونی تھی مگر بیک اپ کے طور پر مامون کے مشاق ہاتھوں نے ہوٹل کی ایک طاقتور موٹر بوٹ کو اپنے تابع بنالیا تھا۔

جیسے ہی دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں ٹارچ کا مخصوص سگنل نظر آیا، ان دونوں کے سینے جوش سے بھر گئے۔ ہوٹل والے ان کے ساتھی اپنے حصے کا کام مکمل کر چکے تھے۔

دونوں برق رفتاری سے حرکت میں آئے۔ ہوٹل کی عمارت تک کا فاصلہ انہوں نے تیزی سے طے کیا۔ گراؤنڈ فلور کی بالکونی سبزہ زار سے محض پانچ فٹ کی بلندی پر تھی۔ وہ بالکونی میں کود گئے۔ اس بالکونی والا کمرا ابھی ویران پڑا ہوا تھا۔

مامون نے حلق سے ایک شب بیدار پرندے کی آواز نکالی۔ یہ پرندہ جھیل کے اطراف میں عام پایا جاتا تھا۔ فوراً ہی ایسی آواز اوپر والی منزل کی بالکونی سے بھی اُبھری تھی۔

☆☆☆

سگنل کور کا صوبے دار بشورام، ڈل جھیل میں پٹرولنگ بوٹ، پر ڈیوٹی پر تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس نے سامنے سرینگر ہوٹل کی عقبی کھڑکی میں سے ٹارچ چمکتی دیکھی تھی۔ اس کے بعد سے اس کے دماغ میں کچھ کھٹک سا رہا تھا۔ کوئی کوندا سا تھا جو دماغ کی طرف لپکتا تھا اور پھر درمیان سے ہی رخ بدل لیتا تھا۔

بشورام نے اس کھٹک سے توجہ ہٹانے کے لیے دماغ کو مصروف کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کی ریٹائرمنٹ میں چند ماہ ہی رہ گئے تھے۔ اس کا ارادہ گریجویٹی کی رقم سے ٹریکٹر خرید کر آبائی زمین پر خود کھیتی باڑی کا تھا۔

تصور کے گھوڑے نے جست بھری۔ بشورام اپنے آبائی گاؤں میں درختوں کے نیچے بچھی چارپائی پر لیٹا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ گندم کے گوشے سنہری مائل ہو رہے تھے۔ سامنے کچی پگڈنڈی پر نوجوان بیٹا نئے نکور ٹریکٹر پر جیسے اڑا چلا آرہا تھا۔ ہر طرف شانتی اور امن ہی امن تھا۔ یہ نہیں کہ ہر پل دھڑکا لگا رہے کہ ابھی کسی طرف سے آتنک وادی حملہ آور ہو جائیں گے یا ابھی دستی بم پاس آ کر گرے گا اور سب خواب ادھورے رہ جائیں گے۔

بشورام یکلخت سیدھا ہو کر بیٹھا۔ جتنی تیزی سے وہ اپنے آبائی گاؤں کھتالی گیا تھا، اتنی ہی تیزی سے واپس ڈل جھیل میں ہچکولے لیتی بوٹ پر لوٹ آیا تھا۔ دماغ کی طرف لپکنے والے کوندے نے اس دفعہ رخ نہیں بدلا تھا۔ لاشعور سے آکر سیدھا شعور سے ٹکرایا تھا اور کاسۂ سر میں ادھم مچا دیا تھا۔

سروس کے ابتدائی دنوں میں اس نے ”متروک کوڈ ورڈز“ کا ایک کورس امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ کچھ دیر پہلے سرینگر ہوٹل کی عقبی کھڑکی پر چمکنے والی روشنی نے ایک متروک لائٹ ورک کوڈ ”جیک ولسن“ کی زبان میں کہا تھا۔ ”آجاؤ، سب اچھا ہے۔“

بشورام جانتا تھا کہ ہوٹل میں کچھ خاص غیر ملکی مقیم ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے یونٹ کو چوکس رہنے کی ہدایت تھی۔

بشورام حلق کے بل چلّایا۔ ”سامنے ہوٹل میں کوئی گڑبڑ ہے۔“

☆☆☆

حمدان، چھریرے جسم کا نوجوان لڑکا تھا۔ اس کے جسم پر پارکنگ بوائے کی میلی سی وردی تھی۔ انڈر گراؤنڈ پارکنگ ایریا میں گنتی کی چند گاڑیاں تھیں۔ اکثریت ہوٹل کے لوڈرز اور پسنجر گاڑیوں کی تھی۔ ان میں سب سے اہم ایک ہیوی مشین گن بردار فوجی جیپ تھی۔

اس وقت حمدان لوہے کی ایک کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا مگر درحقیقت اس کی تمام تر توجہ سامنے کھڑی فوجی جیپ پر تھی جس کی فرنٹ سیٹ پر لیفٹیننٹ رینک کا نوجوان آفیسر منہ پر کیپ رکھے سو رہا تھا۔ ڈرائیور باہر کھڑا سگریٹ پھونکتے ہوئے دونوں گنرز سے گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ چاروں ہی حمدان کے لیے آسان نشانہ تھے۔

اچانک پارکنگ کی پُرسکوت فضا جیپ میں نصب وائرلیس سے اُبھرنے والی ایک چیختی ہوئی آواز سے مرتعش

ہوگئی۔'' الفا، مہمانوں کی خبر لو۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ ان کے محافظ جواب نہیں دے رہے اوور!''

یہ الفاظ نہیں گویا بم تھا جو قابض فوجیوں کے درمیان آکر گرا تھا۔ وہ ہڑبڑا گئے۔ سوئے ہوئے نوجوان آفیسر نے ہڑبڑاہٹ کی کیفیت میں اٹھنے کی کوشش کی تو اس کا سر جیپ کی چھت سے جا ٹکرایا۔ حمدان کا ہاتھ خودبخود ہی پسٹل کی جانب رینگ گیا تھا۔ اس کے ساتھی نہ صرف حرکت میں آچکے تھے بلکہ کامیابی کی طرف قدم بھی بڑھا چکے تھے۔

حمدان کی آنکھیں لہورنگ ہوئیں۔ بازو میں فولادی سختی ابھری اور فضا گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔

پہلی گولی ڈرائیور کی پیشانی پر لگی۔ منہ میں سگریٹ دبائے وہ الٹ کر جیپ کے ٹائر سے جا ٹکرایا۔ دوسری دو گولیوں نے بلٹ پروف جیکٹس میں ملبوس دونوں گنرز کی پیشانیاں بھی چھید دیں۔ محض آٹھ، نو فٹ کے فاصلے سے نشانہ خطا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

نوجوان آفیسر فائرنگ ہوتے ہی اپنی جگہ پر دبک گیا۔

حمدان برق رفتاری سے جیپ تک پہنچا۔ وہ جانتا تھا کہ نوجوان آفیسر کے اوسان بحال ہوگئے اور وہ جیپ میں مورچا بند ہوگیا تو بڑی مشکل ہوجائے گی مگر جیپ کا دروازہ کھولتے ہی اس کا اندیشہ ہوا ہوگیا۔ نوجوان آفیسر اوندھے منہ سیٹوں پر پڑا کانپ رہا تھا۔

حمدان کے وجود میں نفرت کا رنگ اور زہریلا ہوگیا۔ نہتے کشمیریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑنے والے ہتھیار کے سامنے کانپنے لگ جاتے تھے۔ اس نے قریب سے نوجوان آفیسر کی کھوپڑی میں گولی اتار دی۔

پارکنگ کی بند فضا بارود کی بُو سے بھر گئی تھی۔

حمدان نے آفیسر کی لاش گھسیٹ کر جیپ سے نیچے پھینک دی۔ جیپ کے اندر اور باہر خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔

اچانک فضا ریپیٹر کی مہیب آواز سے گونج اٹھی۔ چھرے مینہ کی طرح جیپ پر برسے تھے۔ حمدان نیچے گر گیا۔ اس کی خوش قسمتی کہ وہ چھروں کی زد میں نہیں آیا تھا۔

جیپ پر مسلسل ریپیٹر کا فائر آرہا تھا۔ حمدان جانتا تھا کہ ریپیٹر سے ہوٹل کے گارڈز مسلح ہوتے ہیں۔ یہ کوئی ہوٹل کا گارڈ ہی تھا۔

وہ رینگتا ہوا جیپ کے نیچے سے دوسری طرف آگیا۔ اس دوران میں اس کی وردی قابض فوجیوں کے خون سے لتھڑ گئی تھی۔ ڈرائیور کی خودکار رائفل بھی وہ ساتھ لے گیا تھا۔ فائرنگ سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ فائرنگ کرنے والا گارڈ کچن کے پارکنگ میں کھلنے والے دروازے کے آس پاس ہی ہے۔

جیپ کا وائرلیس مسلسل چیخے جارہا تھا۔'' کہاں مر گئے ہو الفا! جواب کیوں نہیں دے رہے اوور!''

ریپیٹر والے گارڈ کی طرف خاموشی تھی۔ وہ یقیناً کوئی دلیر شخص تھا اور اب اپنی پوزیشن مضبوط کررہا تھا۔ حمدان جانتا تھا کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ پٹرولنگ پر تعینات دستے ہوٹل کی طرف چل پڑے ہوں گے۔ کچھ ہی دیر میں ہوٹل بھوکے بھیڑیوں کے نرغے میں آنے والا تھا۔

حمدان کو اس وقت تک ان بھیڑیوں کو روکنا تھا جب تک اس کے ساتھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوجاتے۔

اس نے جیپ کے ٹائر کی اوٹ میں رہتے ہوئے سر اٹھایا۔ کئی گاڑیوں کے اوپر سے کچن کا فولادی دروازہ نظر آرہا تھا۔ جو بند پڑا ہوا تھا۔ گارڈ کا بھی کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ یقیناً وہ ہوٹل کی عمارت کا بوجھ اٹھائے درجن بھر سے زائد ستونوں میں سے کسی کے پیچھے پوزیشن لیے ہوئے تھا۔

اچانک حمدان کی نگاہ ریپیٹر سے نکلنے والے کارتوسوں کے خولوں پر پڑی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ گارڈ کس ستون کے پیچھے پوزیشن لیے ہوئے ہے۔

ایک تدبیر کو آزماتے ہوئے اس نے اپنا پسٹل ایک طرف اچھال دیا۔ وزنی پسٹل ایک گاڑی کی باڈی سے پُرشور انداز میں ٹکرایا تو گارڈ نے اس جانب فائر جھونک دیا۔

گارڈ کی پوزیشن واضح تر ہوچکی تھی۔ ریپیٹر کے فائر کی بازگشت میں حمدان نے اپنی جگہ چھوڑی۔ دوڑتے ہوئے وہ فضا میں اچھلا۔ ایک لوڈر کے بونٹ سے تھرو لے کر وہ فرش پر تیزی سے اسکڈ کرتا چلا گیا۔ جب تک گارڈ سنبھلتا، حمدان اس کے قدموں میں تھا۔ سبز رنگ کی نیم فوجی دستوں جیسی وردی میں ملبوس لمبا چوڑا گورکھا چوکیدار جب تک ریپیٹر کا رخ اپنے قدموں کی طرف کرتا، حمدان کی انگلی ٹریگر دبا چکی تھی۔

ناف پر لگنے والے برسٹ نے گورکھا گارڈ کو اچھال کر دور پھینک دیا۔ وہ جاں کنی کی کیفیت میں تڑپنے لگا۔

حمدان تیزی سے جیپ میں گھسا۔ چیختے چلاتے وائرلیس سیٹ کو اس نے کھینچ کر باہر پھینک دیا۔ چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے سلف مارا اور پہلے گیئر میں ہی جیپ کو اڑا

دیا۔ طاقتور انجن گرجا اور جیپ ایک گاڑی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

حمدان نے خود پر قابو رکھتے ہوئے جیپ کو سنبھالا اور اسے پارکنگ سے باہر لے آیا۔ باہر آتے ہی اس نے رفتار بڑھا دی۔ لمحوں میں جیپ تنگ مگر پختہ راستے کو پاٹتے ہوئے ایک گھماؤ تک پہنچ گئی۔ یہ خاصی بلند جگہ تھی۔ یہاں سے ہوٹل کا عقب اور ہوٹل کی طرف آنے والی پختہ سڑک دونوں ہی حمدان کے نشانے پر تھے۔ اس نے جیپ کو تھوڑا سا ترچھا کر کے ایک چٹان کی اوٹ میں کر دیا۔ سڑک کی توسیع کی غرض سے اس چٹان کو توڑا گیا تھا۔ جس کے سبب اس کے درمیان خلا سا بن گیا تھا جو اس وقت حمدان کے لیے ایک زبردست مورچے کا کام دینے والا تھا۔

حمدان نے رائفل کندھے پر لٹکائی اور باہر نکل آیا۔ یہی وقت تھا جب نیچے گہرائی میں ہوٹل کی طرف آنے والی سڑک پر متعدد گاڑیوں کی روشنیاں چمکیں اور انجنوں کی غراہٹ اس کے حساس کانوں سے ٹکرائیں۔ وہ اچھل کر جیپ کے عقبی حصے میں چڑھ گیا۔ دونوں گنرز کی لاشیں ایک دوسرے کے اوپر پڑی تھیں۔ اس نے لاشوں کو ایک طرف دھکیلا۔ تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ حسب توقع جیپ کے فرش پر ہیوی مشین گن کے دو اضافی ایمونیشن بکس پڑے ہوئے تھے۔ ایک بکس مشین گن کے ساتھ انچ تھا۔ اس نے مشین گن کا لاک ہٹا کر اسے مختلف سمتوں میں گھما کر دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔ اس کی پشت پر موجود وزنی چٹان کے سبب اس کا عقب محفوظ تھا۔ بلندی نے اس کی فائر پاور میں بے حد اضافہ کر دیا۔ بھرپور اعتماد اور بلند حوصلے کے ساتھ وہ آنے والے خونی بھیڑیوں کا شکار کرنے کے لیے تیار تھا۔ جیب سے ٹارچ نکال کر اس نے قریب ہی رکھ لی تھی۔

☆☆☆

علی، آیت، رضا اور مامون نے بڑی احتیاط کے ساتھ ایلس کے بے حس و حرکت وجود کو نیچے اتار لیا تھا۔

بھارتی سورماؤں کے ہتھیار انہوں نے بانٹ لیے تھے۔ اضافی رائفلیں اور ہتھیار آیت کے کندھوں پر تھے جبکہ ایلس کو رضا نے کسی بوری کے مانند اپنے کندھے پر ڈال رکھا تھا۔

وہ ابھی سبزہ زار پر ہی تھے کہ گولیاں چلنے کی مدھم آوازیں ان کی سماعت سے ٹکرائیں۔ ”لگتا ہے کچھ زیادہ جلدی ہی داستان کھل گئی ہے۔“ سنگین ترین لمحات میں بھی علی کی آواز پُرسکون تھی۔ آیت نے اس کی تائید کی۔ ”یہی ہوا ہے۔ حمدان حرکت میں آچکا ہے۔ یہ فائرنگ یقیناً اسی کی طرف سے ہوئی ہے۔ پارکنگ میں تعینات پارٹی کو اس نے بے خبری میں دبوچ لیا ہے۔“

علی نے کہا۔ ”واپسی کے لیے شکارا نامناسب ہے۔“ پھر اس کا روئے سخن مامون کی طرف ہوا۔ ”بوٹ اسٹارٹ کرو مامون! فائرنگ کی آواز سنتے ہی پٹرولنگ بوٹس کا رخ ہوٹل کی طرف ہو چکا ہوگا...... ہری اَپ۔“

مامون نے تمام تر احتیاط بالائے طاق رکھی اور جیٹی کی طرف دوڑ لگا دی۔ جب تک باقی لوگ جیٹی تک پہنچتے، وہ طاقتور موٹر بوٹ کو اسٹارٹ کر چکا تھا۔ اس دوران ہوٹل کی طرف سے فائرنگ کی آواز ان تک پہنچتی رہی تھی۔

بوٹ میں بیٹھتے ہی علی نے کہا۔ ”پٹرولنگ بوٹ کے لیے ہم بے حد آسان ٹارگٹ ہیں۔ ہم پر فائر آتے ہی سب لوگ پانی میں کود جائیں۔ مغوی کو بوٹ میں ہی چھوڑ دیا جائے۔ زندگی ہوئی تو اگلی ملاقات رحمان بابا کے گھر پر ہو گی۔“

آنے والے وقت کی گمبھیرتا سبھی کے چہروں پر نظر آنے لگی تھی۔ جواب میں سب خاموش رہے تھے۔

مامون نے تمام تر لائٹس بند رکھتے ہوئے بوٹ آگے بڑھا دی۔ بوٹ کا رخ جھیل کے قریب ترین کنارے کی طرف تھا۔ یہ کنارہ ہوٹل کی طرف آنے والے پہاڑی راستے کے دوسری طرف پھیلی مسلم آبادی تک جاتا تھا۔

ہوٹل کی طرف سے فائرنگ کی آواز کو تھمے دیر ہو گئی تھی۔ رضا نے طے شدہ معاملات کے مطابق ٹارچ نکال کر اس کا رخ ہوٹل کی طرف آنے والے راستے کی طرف کر کے مخصوص سگنل دیا۔ جس کا جواب چند لمحوں میں ہی آ گیا۔ خاصی دور بلندی پر ٹارچ مخصوص انداز میں چمکی تھی۔

رضا خوشی سے چلّایا۔ ”کشمیر کا شیر، دشمن کی ہیوی مشین گن کے ساتھ اس کا راستہ روکے ہوئے ہے، وہ، ہم لوگوں کو بھی کور دے گا۔“

اس خبر نے سب کے سینے جوش سے بھر دیے۔ آیت خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے بے اختیار آزادی کا مخصوص نعرہ بلند کر دیا۔ جس کا جواب دینا سب پر فرض تھا۔ اگلے ہی لمحے ڈل جھیل کی تاریک فضا آزادی کے پُرجوش نعروں سے گونج اٹھی تھی۔

ٹھیک اسی وقت ہیوی مشین گن کی گھن گرج بلند ہوئی۔ ان لوگوں نے آتشیں لکیروں کو برق کے مانند گہرائی

میں اترتے دیکھا۔ حمدان ہوٹل کی طرف آنے والے پٹرولنگ دستوں کو سرپرائز دینے میں کامیاب رہا تھا۔ یقیناً خونی بھیڑیوں کے غول میں بھگدڑ مچ گئی ہوگی۔

مامون ممکن تیز رفتاری سے بوٹ کو اڑائے جارہا تھا۔ سبھی ہتھیار سنبھالے چوکس تھے۔ وہ کنارے سے ابھی دور ہی تھے۔ جب پٹرولنگ بوٹ ان کی نظروں میں آئی۔ اس کا رخ ہوٹل کی طرف تھا اور اس کے اوپر نصب سرچ لائٹ تیزی سے اِدھر اُدھر حرکت کررہی تھی۔ کوئی لمحہ جاتا تھا، ان کی بوٹ سرچ لائٹ کی زد میں آنے والی تھی۔

سبھی کی MI کا رخ پٹرولنگ بوٹ کی طرف تھا مگر وہ موثر رینج سے ابھی دور تھی۔ اس سے پہلے کہ ان کی بوٹ سرچ لائٹ کی زد میں آتی، پٹرولنگ بوٹ حمدان کی زد میں آگئی۔ ہیوی مشین گن دھماکے سے گرجی۔ بلندی سے آتشیں لکیریں مینہ کے مانند پٹرولنگ بوٹ پر برسیں اور لمحوں میں ہی پٹرولنگ بوٹ آگ کا گولا بن گئی جس نے ڈل کے ایک حصے کو روشن کردیا تھا۔ آزادی کے متوالوں کی بوٹ ایک دفعہ پھر نعروں سے گونج اٹھی تھی۔

ہوٹل کی طرف آنے والا راستہ میدانِ جنگ کا منظر پیش کرنے لگا تھا۔ دوطرفہ زبردست فائرنگ نے ہر طرف خوف وہراس پھیلا دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ بہ خیریت کنارے پر پہنچ گئے۔ بوٹ ان کا ''نقشِ پا'' تھی اس لیے بوٹ کو کھلا چھوڑ دیا گیا۔ ڈل کی لہریں اسے بہا کر کہاں سے کہاں لے جاتیں۔

رضا نے کنارے پر کھڑے ہو کر حمدان کو اپنی کامیابی اور اسے واپس آنے کا سگنل دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لوگ چھوٹی چھوٹی گلیوں والے اس گنجان آباد علاقے میں داخل ہوچکے تھے۔

فائرنگ کی خوفناک آوازوں نے علاقے کے مکینوں کو ایک نئے خوف میں مبتلا کردیا تھا۔ وہ اپنے اپنے بستروں میں مزید دبک گئے تھے۔

کسی کی نظروں میں آئے بغیر وہ لوگ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ایک چوراہے پر پہنچ گئے۔ مامون نے رہنمائی کے فرائض انجام دیے تھے۔

چوراہے پر ایک ڈھابا نما ہوٹل تھا جس کے بڑے سے تندور کے پاس کھڑی ضعیف العمر عورت تاریکی کا ہی حصہ نظر آرہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اس عورت نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''ادھر آجاؤ میرے بچو!'' اس نے تندور کا ڈھکن ہٹادیا۔

ایک، ایک کر کے وہ لوگ ایلس ہیلو سمیت تندور میں اتر گئے۔ یہ تحریکِ آزادی کے محفوظ ترین سیف ہاؤسز میں سے ایک تھا۔

☆☆☆

سرینگر میں قابض افواج کے ملٹری ہیڈ کوارٹر کے ایک الگ تھلگ گوشے میں بنی عمارت میں اہم ہنگامی اجلاس جاری تھا۔

داخلی سلامتی کے ذمے دار تین مختلف اداروں کے اسسٹنٹ سیکریٹری کے عہدوں کے حامل افراد سر جوڑے بیٹھے تھے۔ چوتھا شخص جو اس اجلاس کی صدارت کررہا تھا، اس کا تعلق وفاقی وزارتِ داخلہ سے تھا۔ سندیپ ٹھاکر نام کا یہ شخص ایک گھاگ آفیسر تھا اور اس وقت خاصا برہم تھا مگر اپنے تاثرات وہ بڑی کامیابی سے چھپائے ہوئے تھا۔ وہ دوپہر کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے سرینگر پہنچا تھا۔ گفتگو اور الزام تراشیوں کا ایک سیشن ہوچکا تھا۔ پہلے تو تینوں اداروں کے نمائندوں نے خود کو گزشتہ شب کے واقعے سے بری الذمہ قرار دیا تھا اور اس کی ذمے داری دوسرے ادارے پر ڈالی تھی۔ جوابی وار کے بعد رفتہ رفتہ تینوں نمائندے اکٹھے ہو گئے تھے اور انہوں نے واقعے کا ذمے دار قابض افواج کو ٹھہرایا تھا۔ فوج کا کوئی نمائندہ اپنے دفاع کے لیے موجود نہیں تھا۔ دلائل دے کر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے تیواری لال نامی آفیسر نے کہا۔

''مہمانوں کی حفاظت کی تمام تر ذمے داری مقامی فوجی ہیڈ کوارٹر کی تھی۔ مہمانوں کے ساتھ رہائش پذیر بلیک کیٹ کمانڈوز، پارکنگ میں تعینات پٹرول جیپ، ڈل میں دندناتی پٹرولنگ بوٹس...... یہ سب مل کر بھی مٹھی بھر آتنگ وادیوں کو نہیں روک سکے۔ الٹا گیارہ بندے کھیت ہوئے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی آتنگ وادیوں نے بے ہوش پڑے کمانڈوز کو زندہ کیسے چھوڑ دیا۔ ان کی گردنیں کٹ جاتیں تو ایک بہت بڑا طوفان بہت سوں کی نوکریاں بہا کرلے جاتا۔''

اس کی الجھن دور کرتے ہوئے دوسرے آفیسر ارجن نائر نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ''یہ موسلے آتنگ وادی ہمارے مقابلے میں خود کو بڑے بلند آدرش کا مالک ظاہر کرتے ہیں۔ عورتوں، بچوں اور نہتے دشمنوں کو اپنا نشانہ نہیں بناتے۔''

اس بات پر سبھی کے چہروں پر زہر آمیز اور تمسخر کی آمیزش والی مسکراہٹیں دوڑ گئی تھیں۔

سندیپ ٹھاکر نے کونین جیسے الفاظ کو شہد بھرے انداز میں کہا۔ ''آپ لوگوں کے دلائل سننے کے بعد میں تو رپورٹ میں آپ کے اداروں کو بری الذمہ ہی لکھوں گا۔''

یہ سنتے ہی تینوں کے چہرے کھل اٹھے۔

سندیپ ٹھاکر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس سے پہلے میں مقامی ہیڈ کوارٹر سے کسی کو بلاؤں گا تو وہ کہے گا...... ہوٹل کے ملازمین کی چھان بین ہماری ذمّے داری نہیں تھی۔ ہمارے پاس ایسے کسی آتنگ وادی حملے کی پیشگی انٹیلی جنس رپورٹ نہیں تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ، اس سارے معاملات کا ذمّے دار معاف کیجیے گا آپ کے اداروں کو ٹھہرائے گا تو بتائیں میں رپورٹ میں واقعے کے ذمّے داروں کا تعین کر کے خطا کار کس کو ٹھہراؤں گا۔'' اس نے خاموش ہو کر باری، باری تینوں کے چہروں کی طرف دیکھا جہاں لمحہ بھر پہلے نظر آنے والی چمک تیزی سے معدوم ہو گئی تھی۔

ہمیش خان نامی آفیسر نے پہلے تو سامنے پڑی بوتل سے دو گھونٹ پانی پیا۔ پھر اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرے خیال میں تو ہیڈ کوارٹر سے کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہیے کہ فوج کے ساتھ ساتھ ہم سب بھی اس واقعے کے ذمّے دار ہیں۔'' چھوٹے سے کمرے میں گمبھیر خاموشی در آئی۔ کسی نے بھی ہمیش خان سے اختلاف نہیں کیا تھا۔

سندیپ ٹھاکر کی آنکھوں میں فاتحانہ چمک نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''اب تک کی سب سے معقول بات آپ نے کی ہے۔ ہم سب ہی اس واقعے کے ذمّے دار ہیں۔''

ارجن نائر اور تیواری لال نے بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلا اور اس کے ہمنوا ہو گئے۔

سندیپ ٹھاکر نے نظر کی عینک لگا کر ایک فائل کھولی اور چند منٹ کے لیے اس میں محو ہو گیا۔ باقی تینوں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے جہاں گمبھیرتا تیزی سے بڑھتی جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے فائل بند کی اور عینک اتارتے ہوئے بولا۔ ''یہ فائل مجھے ائرپورٹ پر دی گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر میں زیادہ توجہ سے میں اسے نہیں دیکھ پایا تھا۔ یہ فائل ایک انٹیلی جنس رپورٹ پر مشتمل ہے جو ہمارے سب سے معتبر وفاقی انٹیلی جنس کے محکمے کی طرف سے براہِ راست پردھان منتری آفس کو بھیجی گئی ہے۔''

تینوں کی نظریں اس فائل پر جم سی گئیں۔

سندیپ ٹھاکر کے لہجے میں سنسناہٹ نمایاں ہوئی۔ ''معتبر ترین انٹیلی جنس رپورٹ کے مطابق آتنگ وادیوں کا ایک اعلیٰ تربیت یافتہ گروپ وادی میں لانچ ہو چکا ہے۔ ان کی تربیت کہاں اور کن ہاتھوں میں ہوئی، اس پر فی الحال کام ہو رہا ہے۔''

''میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ گزشتہ شب کی کارروائی میں ممکنہ طور پر اسی نئے گروپ کا ہاتھ ہے۔ اس کے علاوہ اس رپورٹ میں.... سب سے پریشان کن خبر سے آگاہ کیا گیا ہے، وہ اس گروپ کے ساتھ لانچ ہونے والے چار افغانی ہیں جو ہتھیار سازی میں مہارت رکھتے ہیں۔ جو معمولی ساز و سامان سے چھوٹے ہتھیار بنانے کی بھرپور اہلیت رکھتے ہیں۔'' لمحاتی وقفے کے بعد اس نے مزید کہا۔ ''آپ لوگ جانتے ہیں کہ ہم کامیاب ڈپلومیسی اور اربوں ڈالرز جھونک کر بڑی کامیابی سے آتنگ وادیوں کی جدید اسلحے تک رسائی کے ننانوے فیصد راستے بلاک کر چکے ہیں اور باقی ایک فیصد بھی بلاک کرنے کی کوشش میں شب و روز مصروفِ عمل ہیں۔ اگر یہ افغانی مقامی آتنگ وادی تحریک کے لیے کوئی اسلحہ ساز فیکٹری لگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور تحریک چھوٹے ہتھیاروں میں خود کفیل ہو جاتی ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں ہماری افواج کے لیے یہ کتنا کٹھن چیلنج ہو گا۔''

اس دہلا دینے والے اندیشے نے حقیقی معنوں میں تینوں اسسٹنٹ سیکریٹریز کو متفکر کر دیا تھا۔ کشمیر کا بچہ بچہ آزادی مانگ رہا تھا، ہاتھوں میں پتھر اور آنکھوں میں آگ لیے وہ قابض افواج کے سامنے سینہ سپر تھا۔ اس کے ہاتھ میں پتھر کی جگہ خود کار رائفل آ جاتی تو یقیناً بھارتی سورماؤں کے لیے موت کا پیغام بن جاتا۔

سندیپ ٹھاکر کی زبان رواں تھی۔ ''اب یہ ہماری ذمّے داری ہے کہ ان چاروں افغانیوں کو وادی کے طول و عرض میں سے کھوج نکالیں اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے سے پہلے انہیں کسی برقی بھٹی میں جھونک دیں۔ اس کے علاوہ اس نئے گروپ کو بھی کسی بڑی کارروائی سے پہلے نرکھ کا راستہ دکھا دیں۔''

تینوں نے بھرپور انداز میں اس عزم کا اعادہ کیا۔

سندیپ ٹھاکر نے کہا۔ ''اب میں سب سے اہم خبر آپ لوگوں کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں۔''

تینوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
سندیپ ٹھاکر نے ڈرامائی وقفہ دے کر کہا۔ ''راجدھانی میں آج کل سب سے گرم موضوع 'کشمیر کی خصوصی حیثیت' کے خاتمے کا ہے۔ کسی دن آپ اچانک سنیں گے کہ پارلیمنٹ نے جموں و کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کردی ہے۔ اب وہ باقاعدہ فیڈریشن کا حصہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ اور فوج کو خصوصی اختیارات مل جائیں گے۔ آپ کچھ بھی کرنے کے لیے مکمل آزاد ہوں گے۔ پورے کشمیر میں مقاصد کے مکمل حصول تک لاک ڈاؤن ہوگا۔ میڈیا، انٹرنیٹ، لینڈ لائنز، موبائل فون سب خاموش ہوں گے۔''
سندیپ ٹھاکر کے لہجے نے رنگ بدلا۔ ''خصوصی اختیارات کے ساتھ مقاصد کے حصول میں جزوی طور پر بھی ناکام رہنے والے اداروں کے بجٹ میں تیس فیصد سے زیادہ کٹوتی کردی جائے گی اور فیصلے کی طاقت کے حامل بہت سے لوگوں کو جبری ریٹائرمنٹ کے نئے قانون کے تحت گھر بھیج دیا جائے گا۔ آپ لوگ جن اداروں کے نمائندے ہیں۔ سو فیصد کارکردگی نہ دینے کی صورت میں سب سے زیادہ متاثر ہوں گے اور کارکردگی دکھانے کی صورت میں سب سے زیادہ مستفید۔'' یہ کہہ کر سندیپ ٹھاکر نے اپنی سیٹ چھوڑ دی اور مزید کہا۔
''اس فائل کی کاپی آپ لوگوں کو مہیا کردی جائے گی اور گزشتہ رات والے واقعے کی رپورٹ فی الحال میں کچھ دن کے لیے مؤخر کررہا ہوں...... آپ لوگوں کے پاس وقت ہے۔ ایلس ہیلز کو ہر قیمت پر بازیاب کروائیں۔ اسے اغوا کرنے والے بھی شاید اس کی اہمیت سے بخوبی واقف نہیں ہیں۔ اس کے میڈیا گروپ نے ایک طوفان اٹھا رکھا ہے۔ شدید پریشر آپ کی طرف چل پڑا ہے۔ میں زیادہ دیر تک اسے روک نہیں پاؤں گا۔ میری نیک خواہشات آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

ایلس ہیلز کی آنکھ ایک نامانوس اور خوف زدہ کردینے والے احساس کے ساتھ کھلی تھی۔ اسے لگا تھا کہ جس مخصوص بستر اور ماحول میں اس کی آنکھیں بند ہوئی تھیں، اب وہ اس سے مختلف ماحول اور جگہ پر ہے۔ وہ گھبرا کر تیزی سے اٹھی تو سر بڑے زور سے چکرایا۔ متلی کے احساس کے ساتھ وہ گرنے لگی تو کسی نے اسے بانہوں میں سنبھال لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ سنبھالنے والا وجود نسوانی ہے۔ اسے آرام سے تکیے پر لٹا دیا گیا۔ ایک پُرلوچ نسوانی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''آرام سے لیٹی رہو، دھیرے دھیرے آنکھیں کھولو اور پھر آرام سے چاہو تو اٹھ بیٹھو۔'' یہ الفاظ صاف انگریزی میں ادا کیے گئے تھے۔
تیز دھڑکن اور ہولا دینے والے اندیشوں کے ساتھ ایلس نے آنکھیں کھول دیں۔ چمک دار آنکھوں، شفاف جلد اور گھنیرے بالوں والی ایک مقامی لڑکی اس پر جھکی ہوئی تھی۔ ایلس کی حسیں لوٹنے لگیں۔ آواز اور لڑکی دونوں اس کے لیے اجنبی نہیں رہے تھے۔ یہ اس کے ہوٹل کی میزبان تھی جس کا نام اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ اسے قدرے اطمینان ہوا۔ ساتھ ہی وہ مخصوص باس اس کے نتھنوں سے ٹکرائی جو زمین دوز جگہوں کا خاصہ ہوتی ہے۔
''میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟'' ایلس نے کمزور سی آواز میں کہا۔ ''اور میں کہاں ہوں؟ یہ ہوٹل تو نہیں ہے۔'' ساتھ ہی وہ اٹھ بیٹھی۔ منظر نمایاں ہوگیا تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں برقی لائٹس روشن تھیں۔ ساخت سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ زمین دوز کمرا ہے۔
ایلس فرشی بستر پر تھی۔ اس کے قریب ہی میزبان لڑکی بیٹھی تھی اور سامنے مضبوط جسم اور گہری سیاہ آنکھوں والا ایک لڑکا کھڑا ہوا تھا۔ ایک کونے میں واٹر کولر رکھا تھا اور دوسری طرف پرانی سی چادر تنی تھی۔ غالباً اس چادر کے دوسری طرف رفع حاجت کا انتظام تھا۔ نکاسی کا بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔
ایلس مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی۔ ہر طرح کے حالات کا اس نے مقابلہ کیا تھا اور اب بھی کرسکتی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ اسے یقین ہوگیا کہ اس کے ساتھ ضرور کوئی انہونی ہوگئی ہے۔ نوجوان لڑکا دو قدم بڑھ کر اس کے قریب آگیا اور بولا۔ ''تم اغوا ہوچکی ہو اور تمہاری میزبان تحریک آزادی جموں و کشمیر ہے۔''
ایلس کو ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی، وہ بولی۔ ''ایک صحافی کو اغوا کرکے تحریک اپنے سینے پر کون سا تمغا سجانا چاہتی ہے۔ یہ حرکت تم لوگوں کو مغربی دنیا کی ہمدردی سے دور کردے گی۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا، مجھے چھوڑ دو۔''
نوجوان کے چہرے پر بظاہر مسکراہٹ کے جو تاثرات نمایاں ہوئے تھے، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی تصویر تڑخ گئی ہو، وہ بولا۔ ''مغربی دنیا کی یہ ہمدردی ہمیں تو 72 سالوں میں کہیں نظر نہیں آئی۔ انسانیت نواز لوگوں کی ہمدردی کو تحریک سلام کرتی ہے۔ خیر یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر دونوں طرف سے خوب بحث کی جاسکتی ہے۔ تم ذرا

روشنی ڈالوگی کہ ہماری ہمدردی میں تمہارا میڈیا گروپ کہاں کھڑا ہے؟ تحریک کو چھوڑ دو۔ عام کشمیریوں کی بات کرو۔“

نوجوان جو علی ڈار تھا، اس کی سیاہ آنکھیں ایلس پر جمی تھیں اور پہلی دفعہ ایلس کو محسوس ہوا کہ اس کے سامنے آزادی کا متوالا محض ایک جذباتی نوجوان نہیں ہے۔ خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے اس نے قریب بیٹھی لڑکی کی طرف دیکھا۔

”کیا نام ہے تمہارا...... آنسہ......“

لڑکی نے اس کا فقرہ کاٹ کر تصحیح کی۔ ”آیت۔“

”ہاں...... آیت، کیا تم بھی اس سر پھرے کے ساتھ ہو؟“

آیت کی آنکھوں کی چمک دوچند ہو گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مجھے فخر ہے اس بات پر۔“

ایلس چند لمحے ہونٹ بھینچے اسے دیکھتی رہی پھر گہرا سانس لے کر علی کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”تم نے بہت اچھی بات کی کہ میرا میڈیا گروپ کہاں کھڑا ہے۔ ہم لوگ بے شک عام کشمیریوں کے ساتھ کھڑے ہیں جو نام نہاد آزادی کی تحریک سے تنگ......“

اس کا فقرہ درمیان میں ہی رہ گیا تھا کہ خانہ ”چٹاخ“ کی زوردار آواز سے گونج اٹھا تھا۔

اٹھنے والا ہاتھ آیت کا تھا جو بھوکی شیرنی کے مانند ایلس پر پل پڑی تھی۔ ایلس نے بھی کمزوری نہیں دکھائی تھی۔ لمحوں میں ہی دونوں لڑکیاں ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگ گئی تھیں۔

علی نے بمشکل دونوں کو جدا کیا۔ اس کوشش میں اسے آیت کو دو تھپڑ بھی لگانے پڑے تھے جو آؤٹ آف کنٹرول ہو رہی تھی۔ اس کی ایک ہی گردان تھی۔ ”اس کتیا نے تحریک کو گالی دی ہے۔ میں زندہ نہیں چھوڑوں گی اسے۔“

علی نے حلق سے مخصوص آواز نکالی تو کمرے کی چھت میں ایک سوراخ نمودار ہوا اور کچھ افراد نے نیچے جھانکا۔ علی کے کہنے پر بانس کی بنی مخصوص سیڑھی لٹکائی گئی جس کے ذریعے آیت کو اوپر بھیج دیا گیا۔ آخری لمحے تک اس کی خشمگیں نظریں ایلس پر جمی رہی تھیں۔

اس سارے عمل کو ایلس نے بغور دیکھا تھا۔ دھینگا مشتی کے دوران اس نے محسوس کیا کہ اس کی پنڈلی کے ساتھ کچھ بندھا ہوا ہے۔ اس نے پنڈلی عیاں کی تو دنگ رہ گئی۔ اس کی شناسا نگاہوں نے دیکھ لیا کہ اس کی پنڈلی ایک جدید ترین ”لاکڈ بم“ سے جکڑی ہوئی تھی۔ اس کا دماغ لٹو کے مانند گھوم گیا۔ کچھ دن پہلے نظروں سے گزرنے والے ایک میگزین کے مندرجات نظروں کے سامنے عیاں ہو گئے۔

150 گرام ٹی این ٹی سے لدے بم کو عرف عام میں ”دلِل بوائے“ کہا جاتا تھا۔ اسے ریموٹ سے بھی کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ دو ڈیوائسز کے درمیان مواصلاتی فاصلے کا تعین کر کے اسے بلاسٹ ہونے کی کمانڈ دی جا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ مخصوص کوڈ کے بغیر اسے کھولنے یا توڑنے کی کوشش بھی اس کے بلاسٹ ہونے کا ایک یقینی سبب تھی۔ فی الحال وہ آف تھا۔

ایلس کا رنگ فق ہو گیا۔ ”یہ...... لگ...... کیا ہے؟“

”تمہارے چہرے کی رنگت بتا رہی ہے۔ تم اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور جانتی ہو۔“

ایلس نے تھوک نگل کر حلق تر کیا۔ ”یہ شاید کوئی ریموٹ کنٹرول بم ہے۔“

علی نے کہا۔ ”اس کے بارے میں بعد میں بات کرتے ہیں۔ میں اپنی ساتھی کے جذباتی پن کے لیے تم سے معذرت خواہ ہوں۔ ہماری تحریک نہتوں پر تشدد کے سخت خلاف ہے خاص طور پر بچے اور خواتین۔“

ایلس نے ہونٹوں سے رسنے والے خون کو انگلی سے صاف کیا۔ ”کوئی بات نہیں۔ کچھ لوگوں کے پاس جب کہنے کو کچھ نہیں بچتا تو وہ مارنے پر اتر آتے ہیں۔ تمہارے بارے میں ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ ممکن ہے تھوڑی دیر میں تم بھی شرافت کا یہ جامہ اتار پھینکو۔“

علی نے بغور اسے دیکھا۔ ”لگتا ہے تمہاری گہرائی ناپنی پڑے گی۔ تم محض صحافی نہیں ہو۔“

ایلس نے بے پروائی سے کہا۔ ”جو مرضی آئے ناپو...... فی الحال میں، تمہاری قید میں ہوں اور خود کو بدترین حالات کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکی ہوں۔“

علی نے کہا۔ ”گڈ! یہ اچھی بات ہے کہ چیخنے، چلانے کے بجائے تم نے خود کو حالات کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ میں کھانے کے لیے کہتا ہوں۔ تم چودہ گھنٹے سے زائد بے ہوش رہی ہو۔“

بھوک اور پیاس کا فطری تقاضا، حالات کی سنگینی کے سبب دب گیا تھا جس نے علی کے یاد دلانے پر دوبارہ سے سر اٹھایا۔

ایلس نے رضامندی ظاہر کی تو تھوڑی دیر میں اس کے لیے تازہ کھانا آ گیا۔

کھانے کے بعد ایلس نے چائے کے لیے منع کر

دیا۔ علی کے لیے چائے آگئی۔ وہ کپ تھام کر آلتی پالتی مار کر ایلس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''ہاں تو آیت کے جھگڑا کرنے سے پہلے ہم کہاں تھے۔ تم غالباً عام کشمیریوں کو آزادی کی تحریک کا مخالف قرار دے رہی تھیں۔''

ایلس نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''بالکل یہی کہا تھا میں نے۔ میں، تم سے سوال کرتی ہوں کہ تحریک نے عام کشمیریوں کو کیا دیا ہے...... جذباتی نعروں کے سوا؟'' اس نے بڑے اعتماد سے علی کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑیں۔

''تحریک اور عام کشمیریوں کو جدا، جدا دیکھنا۔ منفی پروپیگنڈے کا حصہ ہے جس سے تم متاثر ہو۔ رہی یہ بات تحریک نے عام کشمیریوں کو کیا دیا ہے تو۔ تحریک شروع ہی عام لوگوں نے کی ہے۔ آزادی کا خواب تمہیں ہر کشمیری کی نگاہوں میں نظر آئے گا۔ میں پھر کہوں گا تحریک اور عام کشمیری کو جدا جدا نہیں دیکھا جاسکتا۔'' علی کے سینے میں کچھ جلنے سا لگا تھا۔

ایلس کو اپنی مضبوطی کا احساس ہوا، وہ بولی۔ ''میں اور میری ٹیم درجنوں عام کشمیریوں سے ملے ہیں۔ ان کے انٹرویوز بھی ہم نے کیے ہیں۔ وہ بھی آزادی کی تحریک سے بیزار تھے۔ ان لوگوں کے خیال میں تحریک کی وجہ سے عام کشمیریوں کا روزگار ٹھپ ہوا۔ کشمیریوں کے لیے روزگار کا سب سے بڑا اور اہم ذریعہ سیاحت تھی۔ جو اب نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ پھلوں کی فصل منڈیوں میں پڑی برباد ہو رہی ہے۔ پنجاب اور مشرقی ہندوستان سے آنے والے بیوپاری اب کشمیر کی منڈیوں کا رخ نہیں کر رہے۔ ان بیوپاریوں کو خوف ہے کہ ''آزادی کے متوالے'' نہ صرف ان سے رقم چھین لیں گے بلکہ قتل بھی کر دیں گے۔''

علی کے سینے میں طوفان مچل رہے تھے جنہیں بمشکل دباتے ہوئے وہ بولا۔ ''جن عام کشمیریوں سے تم ملی ہو، انہیں باقاعدہ منصوبہ بندی سے تیار کر کے تم سے ملوایا گیا تھا۔

''تم بندوقوں کے سائے سے نکل کر عام کشمیریوں سے ملتیں تو تمہیں ہر طرف پیلٹ گنز سے چھلنی چہرے ملتے جن کی آنکھوں میں بسیرا کیے خواب بھی پیلٹ گنز سے چکنا چور ہو چکے ہیں۔ تمہیں بے نور آنکھوں والے ایسے ہزاروں بوڑھے والدین ملتے جن کے جوان بیٹے قابض فوجی اٹھا کر لے گئے اور ان کی واپسی کی راہ تکتے تکتے ان کی آنکھیں بے نور ہو گئیں۔ تمہیں دنیا و مافیہا سے بے بہرہ ایسے نوجوان ملتے جن کی جوان بہنوں کی فوجی کیمپوں میں اجتماعی آبروریزی کی گئی اور ان کی چیخ و پکار لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سارے اہلِ علاقہ نے سنی۔ تمہیں دانے، دانے کو ترستے ایسے لوگ ملتے جو باغات کے مالک تھے مگر اب ان کے باغات فوجی کیمپوں میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ تم درجنوں کشمیریوں سے تو ملی ہو مگر لاکھوں کشمیریوں سے تمہیں دور رکھا گیا ہے۔ ایلس ہیلو اور ان لاکھوں لوگوں سے میں اب ملواؤں گا تمہیں اور تصویر کا یہ دوسرا رخ تمہارے میڈیا گروپ کو دنیا کو دکھانا پڑے گا۔'' طوفانوں کو دباتے، دباتے وہ اپنے عزائم آشکار کر گیا۔

نوجوان کے عزائم اس کے اندازوں سے زیادہ خطرناک اور تباہ کن تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی رہائی کے بدلے اپنے کچھ ساتھیوں کی رہائی کا مطالبہ کرے گا۔ جسے پورا کرنا اس کے میڈیا گروپ کے لیے معمولی بات تھی۔ اس لیے وہ کچھ زیادہ ہی پُراعتماد تھی۔ اس کے علاوہ اس کے کچھ اور مقاصد بھی تھے، وہ فوری رہائی کی خواہش مند بھی نہیں تھی۔

''کیا ہوا مس صحافی! تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے۔ صحافت کی اعلیٰ اقدار کے مطابق تمہارے میڈیا گروپ کو تصویر کا دوسرا رخ دکھانے میں کوئی مضائقہ تو نہیں ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک...... کیوں نہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ بشرطیکہ میں آزادانہ رپورٹنگ کروں۔''

علی کی آنکھوں سے زہریلا تمسخر جھانکنے لگا۔ ''دل پر ہاتھ رکھ کر بولو! تم نے اب تک جو رپورٹنگ کی ہے، وہ آزادانہ رپورٹنگ کے زمرے میں آتی ہے؟''

ایلس کی نظریں خود بخود ہی جھک گئیں۔ اسے احساس ہوا نوجوان، اس سے ایک قدم آگے ہے۔

علی بولا۔ ''تمہاری جھکی نظریں، میرے سوال کا جواب ہیں۔'' ایک طویل اور افسردہ سی سانس لے کر اس نے مزید کہا۔ ''تمہارے میڈیا گروپ کو نہ جانے کن شرائط کے ساتھ کشمیر میں لایا گیا، میں نہیں جانتا۔ تمہاری اب تک کی ''کارکردگی'' سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے تم نے صرف اور صرف بھارتی حکومت کے مفاد کا ہی تحفظ کیا ہے مگر میں، تمہیں تصویر کا دوسرا رخ ضرور دکھاؤں گا جو پیلٹ گنز سے چھلنی ہے۔ شاید تمہارے ضمیر کو ٹھوکر لگے اور وہ جاگ جائے۔''

ایلس نے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا۔ ''میری رہائی کے بدلے تمہارے مطالبات کیا ہیں؟''

علی نے ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کا کپ نیچے رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اتنی جلدی بھی کیا ہے؟“ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی کے ڈائل سے کچھ چھیڑ چھاڑ کی تو ایلس کو محسوس ہوا۔ اس کی دائیں ٹانگ میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی ہے۔ ساتھ ہی ”بپ......بپ“ کی مخصوص آواز ابھری تو اس نے گھبرا کر اپنی ٹانگ اوپر اٹھائی جس پر ”لعل بوائے“ جما بیٹھا تھا۔

”یہ...... یہ کیا ہوا ہے؟“ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

علی نے بے پروائی سے کہا۔ ”کچھ خاص نہیں، تمہاری پنڈلی سے بندھا بم ایکٹی ویٹ ہو گیا ہے۔ میری کلائی پر بندھی گھڑی اور اس بم کا درمیانی فاصلہ دس میٹر ہوتے ہی بم خود بخود پھٹ جائے گا اس لیے اپنی کسی بھی نقل و حرکت کی ذمے دار تم خود ہو گی۔“

ایلس کو اپنا حلق خشک ہوتا محسوس ہوا۔ ٹھنڈے پسینے کے قطرے پیشانی پر نمودار ہو گئے۔ اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ”یہ فاصلہ تمہاری طرف سے بھی تو بڑھ سکتا ہے۔“

علی نے مسکراتے ہوئے حلق سے مخصوص آواز نکالی۔ ”بے فکر رہو، یہ گھڑی ہمیشہ ایسی کسی کلائی میں رہے گی جو تمہارے قریب ترین ہو۔“

چھت کھل گئی تھی۔ بانس کی سیڑھی نیچے لٹکا دی گئی۔ علی نے اس پر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ ”کوشش کرنا اس بم کے پھٹنے کی نوبت نہ آئے۔ ایک ”عام کشمیری“ نے اپنا باغ اونے پونے داموں بیچ کر اس بم کو خریدنے کے لیے فنڈنگ کی ہے۔“

ایلس ہونٹ بھینچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

وہ رات سرینگر کی مسلمان آبادیوں کے لیے قیامت کی رات تھی۔ سرچ آپریشن کے نام پر قابض افواج بھوکے درندوں کے مانند ان پر ٹوٹ پڑی تھی۔ سیکڑوں فوجیوں نے تاؤبٹ نامی اس بستی کو بھی گھیر لیا تھا جہاں ایلس ایک زمین دوز تہ خانے میں موجود تھی۔

گھر، گھر تلاش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ خواتین سے دست درازی ہو رہی تھی۔ مردوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا اور نوجوان لڑکوں کے ہاتھ پشت پر باندھ کر انہیں ایک میدان میں اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ علی تہ خانے میں اترا تو اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور ہاتھوں میں MI رائفل تھی۔ اس کی کمر سے بندھی بیلٹ سے دستی بم بھی جھول رہے تھے۔

”آؤ، تمہیں تصویر کا دوسرا رخ دکھاؤں۔“

اس کے لہجے میں ایسی قطعیت اور مسخر کر دینے والی قوت تھی کہ کوشش کے باوجود ایلس کی زبان انکار نہ کر سکی۔ اسے تہ خانے سے نکال کر کشمیری لباس پہنایا گیا اور سر کے بالوں کو ڈھانپنے کے لیے مخصوص کپڑا باندھ دیا گیا۔ اس معمولی سی تبدیلی نے ہی ایلس کی شناخت کو کافی حد تک چھپا لیا تھا۔ اسے ایک چھوٹا مگر جدید ترین کیمرا تھما دیا گیا۔ ایلس نے پہچان لیا، یہ کیمرا انہی کے سازوسامان کا حصہ تھا۔

علی نے اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

ایلس نادیدہ زنجیر سے جکڑی تیزی سے اس کے پیچھے ہو لی۔ ایک چھوٹے سے صحن سے گزر کر اور پھر چوبی سیڑھیوں کے ذریعے وہ چھت پر آ گئے۔

چھت پر آتے ہی ایلس کی سماعت سے آہ و بکا کا مدھم شور ٹکرایا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے سیکڑوں مرد و زن مل کر آہ و بکا کر رہے ہوں۔ دور کہیں آگ کا انعکاس بھی نظر آ رہا تھا۔ وقفے وقفے سے فائرنگ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔

علی کی پُرسکون مگر زہر خند آواز ابھری۔ ”تمہاری تلاش میں قابض فوجی بھیڑیوں کے مانند ”عام کشمیریوں“ پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ میرے ساتھی بھی صف بندی کر رہے ہیں۔ تم دیکھو گی کہ یہ ”سورما“ نہتوں کا کیا حال کرتے ہیں اور بندوق کے سامنے کیسے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔“

گنجان آباد آبادی کی چھتوں کے ساتھ چھتیں ملی ہوئی تھیں۔ علی کے پیچھے چھتیں پھلانگتی ایلس کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اچانک ہی اسے اندازہ ہوا کہ وہ قابض فوج کے سرچ آپریشن کے مرکزی حصے میں ہے۔ اس نے گلی کے نکڑ پر ایک چیختی چلاتی لڑکی کو دیکھا جو دیوانہ وار بھاگ رہی تھی اور دو فوجی اس کے تعاقب میں تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے لڑکی کو جا لیا۔

ایلس کا کیمرا حرکت میں آ گیا۔

لڑکی بری طرح سے چیختے ہوئے ان فوجیوں کے سامنے مزاحمت کر رہی تھی جو اسے جانوروں کے مانند بھنبھوڑتے ہوئے ایک طرف گھسیٹ رہے تھے۔

علی چھت پر اپنی موجودگی کو مخفی رکھنا چاہتا تھا مگر جو کچھ سامنے ہو رہا تھا، اس سے بھی نگاہ نہیں چرائی جا سکتی تھی۔ اس کی MI سنگل شارٹ پر دو دفعہ گرجی اور درندوں کا روپ دھارے دونوں فوجی اپنے ہی خون میں نہا گئے۔

لڑکی اپنی پھٹی اوڑھنی کو سنبھالتے ہوئے ایک کھلے

دروازے میں غائب ہوگئی۔

علی نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جلدی آؤ۔''

تھوڑی دیر میں وہ چھتیں پھلانگتے موقع سے کافی دور نکل گئے۔ بہت سی چھتوں پر انہیں ہراساں چہروں پر مرد و زن اور خوف زدہ بچے بھی نظر آئے۔ علی کشمیری زبان میں انہیں حوصلہ اور ہمت سے کام لینے کا کہتے ہوئے آگے بڑھا تھا۔

جس چھت سے علی نے فائرنگ کی تھی، وہ علاقہ بھارتی فائرنگ کی زد میں تھا اور اس فائرنگ نے لوگوں کے خوف و ہراس میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں ایک مسجد کی چھت پر پہنچ گئے۔ چھت پر ایک بلند چوبی مینار تھا جس کی انتہائی بلندی پر لاؤڈ اسپیکر لگے ہوئے تھے۔

علی نے جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکال کر جلائی اور چوبی مینار کی جڑ میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ چند لمحوں بعد ایلس حیرت زدہ رہ گئی۔ ڈیزائن دار چوبی مینار کے نچلے حصے میں سے تین فٹ کا ایک ٹکڑا علی نے علیحدہ کر لیا تھا۔ وہاں تاریک خلا نظر آ رہا تھا۔

علی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''اوپر چڑھنے کا راستہ تمہیں مل جائے گا۔ یہاں سے دور، دور تک تمہارا کیمرا کام کر سکے گا۔''

ایلس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''اور تم......؟''

ملگجے اندھیرے میں علی کے دانت چمکے۔ ''بے فکر رہو۔ میں آس پاس ہی ہوں۔ ویسے چاہو تو بھاگنے کے لیے یہ سنہری موقع ہے۔''

''تم طنز کرنے سے باز نہیں رہ سکتے۔'' ایلس نے تلخی سے کہا اور جھک کر مینار کے تاریک خلا میں داخل ہوگئی۔

''سوری۔'' علی نے ٹکڑا واپس اپنی جگہ رکھتے ہوئے کہا۔

ایلس کی وحشت زدہ آواز ابھری۔ ''سوری، اپنے پاس رکھو۔ مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا۔ اوپر کیسے چڑھوں گی؟''

''ہاتھ سے ٹٹولو۔ مینار کی چوڑائی، تمہاری ٹانگوں کی چوڑائی کے بمشکل نصف ہے۔ دونوں طرف نیچے سے اوپر فٹ فٹ کے فاصلے پر لکڑی کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ ان پر پاؤں جماتے ہوئے آرام سے چڑھ جاؤ گی۔''

''لعنت ہو۔'' ایلس بڑبڑائی۔ تھوڑی سی کوشش سے اس نے دونوں طرف ٹکڑے ڈھونڈ لیے۔ ان پر پاؤں جما کر اوپر چڑھنا کچھ خاص مشکل نہیں تھا۔

کچھ ہی دیر میں وہ خاصی بلندی پر پہنچ گئی۔ مینار کے ڈیزائن دار حصوں سے باہر جھانکنا آسان تھا۔ سارا علاقہ اس کے سامنے کھلی کتاب کی طرح تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ ساتھ ہی دل کو دھڑکا سا بھی تھا۔ کہیں وہ نوجوان...... جس نے اپنا نام علی بتایا تھا..... بھارتی فوجیوں کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔

علی اور اس کے درمیان فاصلہ دس میٹر سے زیادہ ہوتے ہی اس کے چیتھڑے اڑ جانا یقینی تھا۔ ''لعل بوائے'' زہریلے سانپ کے مانند اس کی پنڈلی کے گرد لپٹا ہوا تھا۔

ذہن سے اس خوف کو جھٹکتے ہوئے وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ علی کے ساتھ بحث و مباحثہ اس نے محض اس لیے کیا تھا کہ خود کو غیر جانبدار ثابت کر سکے۔ ورنہ اسے وادی کے حالات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وادی کے لوگ ظلم و جبر کی چکی میں پس رہے تھے۔ اس حوالے سے اس کا ضمیر پہلے بھی کچوکے لگا رہا تھا مگر اس مینار کی بلندی سے اس نے جو کچھ دیکھا، اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

گھر گھر تلاشی کے دوران قابض فوجی معصوم بچوں کو اٹھا، اٹھا کر پٹخ رہے تھے۔ علی کے ہاتھوں اپنے دو ساتھیوں کی ہلاکت نے جیسے انہیں دیوانہ کر دیا تھا۔ عورتوں اور بوڑھوں کو رائفلوں کے بٹ مار مار کر ادھ موا کر دیا گیا تھا۔ نوجوانوں پر تو تشدد کی انتہا کی جا رہی تھی۔ انہیں ہاتھ باندھ کر ایک میدان میں اکٹھا کیا جا رہا تھا اور درجنوں فوجی پوچھ گچھ کے نام پر...... بے طرح تشدد کر رہے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو نوجوانوں کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ لکڑی کے بنے دو مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا تھا غالباً قابض فوجیوں کے خیال میں وہاں آتنک وادی چھپے ہوئے تھے۔

دو نوجوانوں کی ہلاکت نے اہلِ علاقہ کے خوف کو اشتعال میں بدل دیا۔ مجتمع ہو کر انہوں نے قابض فوج کے خلاف نعرے بازی شروع کر دی تھی۔

قابض فوج نے اس مجمع کے خلاف بے دریغ طاقت کا استعمال کیا۔ ان پر آنسو گیس کے شیلوں کی بارش کر دی گئی۔ اس دوران ایلس نے بدنام زمانہ پیلٹس گنز کا گھناؤنا استعمال دیکھا۔ باریک ذروں جیسے ہزاروں چھرے مینہ کی طرح برسے اور انہوں نے درجنوں نہتے کشمیریوں کو زخمی کر دیا۔ یہ خطرناک گن، اسرائیلیوں کی مکروہ ایجاد تھی۔ ہلاک یا شدید زخمی کرنے کے بجائے اس گن سے فائر ہونے والے

کارتوسوں میں مقید سیکڑوں باریک چھرے، نشانہ بننے والے کے لیے شدید اذیت کا باعث بنتے تھے۔ نصف انچ تک جسم میں دھنس کر یہ انگارے کی طرح دہکنے لگتے تھے۔ ہزاروں کشمیریوں کے چہرے ان گنز نے داغ دار کردیے تھے اور سیکڑوں کو بینائی سے محروم کردیا تھا۔

انسانی حقوق کے علم برداروں کی جانب سے اس گن کے استعمال پر پابندی تھی مگر قابض افواج جہاں دیگر پابندیوں کو ہوا میں اڑا چکی تھی۔ اس معمولی پابندی کو کہاں خاطر میں لاتی۔ وہ جانتی تھی۔ زبانی جمع خرچ کے علاوہ کشمیریوں کی مدد کرنے کے لیے کسی کو کچھ نہیں کرنا۔

ایک انسان کا دوسرے انسان پر وحشیانہ تشدد دیکھ کر ایلس لرز کر رہ گئی۔ سنی سنائی اور آنکھوں سے دیکھی میں بہت فرق ہوتا ہے۔ جو کچھ کانوں سے سنا تھا، آج آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

اپنے رخساروں پر نمی محسوس ہوئی تو اس نے چھو کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز بہنے والے آنسو اس کا چہرہ بھگو رہے تھے جو اس بات کی نشانی تھے کہ ابھی اس کے اندر کا انسان زندہ تھا۔ ضمیر کروٹیں لے کر بیدار ہو رہا تھا۔

ایلس نے دھندلا جانے والی آنکھیں مسلیں اور نئے عزم کے ساتھ اپنے کام میں لگ گئی۔

ظلم بڑھتا ہے تو مٹ بھی جاتا ہے۔ آزادی کے متوالے اپنی صف بندی کر چکے تھے۔ یکے بعد دیگرے دستی بموں کے دھماکے ہوئے اور ظالم درندوں میں کھلبلی مچ گئی۔ آزادی کے متوالوں نے تین اطراف سے درندوں پر بڑی منصوبہ بندی سے ہلا بول دیا تھا۔

آگ اور خون کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بھارتی سورما ہتھیاروں کے سامنے واقعی بھیگی بلی بن گئے تھے۔ مینار کے نچلے حصے میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور پھر مینار کی گھٹن زدہ فضا میں علی کی مدھم آواز ابھری۔ ”نیچے آجاؤ، ہمیں اس علاقے سے نکلنا ہے۔ وقت بہت کم ہے۔ آزادی کے متوالے اپنی جانیں دے کر ہمارے لیے محفوظ راستہ بنا چکے ہیں۔“

☆☆☆

داخلی سلامتی کے تین اداروں کے بہترین ایجنٹوں پر مشتمل اسپیشل ٹاسک فورس راتوں رات تشکیل دے دی گئی تھی جس کا سربراہ کرنل دیپ راج کو بنایا گیا تھا۔

کرنل دیپ کا سابقہ ریکارڈ شاندار تھا۔ اسے وسیع تر اختیارات کے ساتھ...... ایلس ہیلو کی بازیابی، اسے اغوا کرنے والے گروپ کا قلع قمع اور ان چار افغانیوں کی کھوج کا ٹاسک دیا گیا تھا جو اسلحہ سازی میں مہارت رکھتے تھے۔

دیپ راج بڑی سرعت سے حرکت میں آچکا تھا۔ سرینگر ہوٹل کا وہ اسسٹنٹ منیجر زیرِ عتاب تھا جس نے بوگس شناختی دستاویزات پر آیت وغیرہ کو ملازم رکھ لیا تھا۔ اس اسسٹنٹ منیجر کے علاوہ دو ویٹر بھی زیرِ عتاب تھے جن سے ان تینوں کی علیک سلیک تھی۔

ویٹروں سے تو کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ البتہ اسسٹنٹ منیجر کی ٹھکائی کے بعد یہ عقدہ کھلا تھا کہ اس نے ان تینوں کو برائے نام معاوضے پر ملازم رکھا تھا اور ان کی تنخواہ کا ایک معقول حصہ خود ہڑپ کر رہا تھا۔ اسی سبب اس نے زیادہ چھان بین نہیں کی تھی۔

ہوٹل سے مکمل ناکامی کے بعد دیپ راج کی توپوں کا رخ تاؤبٹ کی طرف ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ہوٹل میں کامیاب کارروائی کے بعد مطلوب گروپ نے تاؤبٹ کا رخ کیا ہوگا اور ابھی تک وہیں پناہ لیے ہوئے ہوں گے۔

تاؤبٹ کا محاصرہ جاری تھا۔ گزشتہ رات جس طرح آزادی کے متوالوں نے پلٹ کر قابض افواج پر وار کیا تھا جس میں درجن بھر سے زائد قابض فوجی جہنم واصل ہوئے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ مطلوب گروپ کے علاوہ دیگر آزادی کے متوالے بھی اس علاقے میں موجود ہیں۔

تاؤبٹ میں مقامی مخبروں کو ریڈ الرٹ کیا جا چکا تھا اور مطلوب گروپ کے بارے میں مصدقہ اطلاع دینے والے کے لیے بھاری انعام کا اعلان ہو چکا تھا۔

دیپ راج کی ٹیم کا ایک حصہ خاص قسم کے پیپر ورک میں مصروف تھا۔ یہ لوگ تاؤبٹ کو چار زون میں تقسیم کرنے کا کام کر رہے تھے۔ ان کا ارادہ رکاوٹیں لگا کر ہر زون کو دوسرے زون سے کاٹ کر گھر گھر تلاشی کا تھا۔ اس مقصد کے لیے زیرِ زمین تہ خانوں کی نشان دہی کرنے والے جدید ترین اسرائیلی اسکینر جموں سے سرینگر پہنچ گئے تھے۔

پوری ٹاسک فورس کو مختلف ذمّے داریاں سونپ کر کرنل دیپ راج اپنے چھوٹے سے آفس میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ اونچا، لمبا اور مضبوط کاٹھی کا مالک تھا۔ اس کا تعلق مہاراشٹر کے ایک انتہا پسند ہندو گھرانے سے تھا اور مسلم دشمنی اس کی گھٹی میں شامل تھی۔

فی الوقت اس کا دماغ گھڑسواری کا میدان بنا ہوا تھا۔ مقامی آزادی کے متوالوں کی اسے زیادہ فکر نہیں تھی۔ ان سے اب تک بڑی کامیابی سے نمٹا جا رہا تھا اور یہ سلسلہ

آگے بھی جاری رہنا تھا مگر آزادی کی اس تحریک کو چند اسلحہ ساز کا مل جانا بے حد تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا۔

مقامی آزادی کی تحریک چھوٹے ہتھیاروں میں خودکفیل ہو جاتی تو بے پناہ جوش وخروش، قابض افواج سے انتہا درجے کی نفرت اور آزادی کی شدید خواہش...... یہ سب مل کر قابض افواج کا جینا دوبھر کر دیتے۔

قابض افواج کے بڑھتے تابوتوں کی تعداد دہلی سرکار کے لیے ایک نیا دردسر بن سکتی تھی۔ میڈیا ایک طوفان کھڑا کر دیتا۔

دوسری طرف ایلس ہیلو کی بازیابی بھی ایک بڑا چیلنج تھا۔ اس کے میڈیا گروپ کا بے حد دباؤ تھا۔ ابھی تک کسی گروپ نے اس کے اغوا کی ذمّے داری قبول کی تھی اور نہ ہی اس کے حوالے سے کوئی مطالبہ سامنے آیا تھا۔

دیپ راج کو اپنی داخلی کمزوریوں کا احساس ہورہا تھا۔ لائن آف کنٹرول پر بھی ان کا سارا دھیان تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں فوجی لائن آف کنٹرول پر مورچا زن تھے۔ اس کے علاوہ نگرانی کا حساس ترین اسرائیلی سسٹم بھی پور طرح فعال تھا۔ درجنوں جاسوس ڈرون اور ہیلی کاپٹر چوبیس گھنٹے کنٹرول لائن کی نگرانی پر مامور تھے۔ پروپیگنڈے سے ہٹ کر بھارتی نیتا اور جرنیل نجی محفلوں میں بڑے فخر سے یہ اعلان کرتے تھے کہ لائن آف کنٹرول کے دوسری طرف سے انسان تو کیا چڑیا کا بچہ بھی مقبوضہ کشمیر میں دراندازی نہیں کرسکتا۔

دیپ راج کو احساس ہورہا تھا کہ ملک کے دیگر داخلی راستوں پر نگرانی کا نظام اتنا فعال نہیں تھا یقینا اسلحہ ساز افغانی ایسے ہی کسی کمزور راستے سے داخل ہوئے تھے اور پورے ملک کو پاٹتے ہوئے مقبوضہ کشمیر میں آدھمکے تھے۔

دیپ راج نے سوچا۔ اس مسئلے کو قومی سلامتی کے کسی بڑے فورم پر اٹھائے گا مگر پھر خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ مسئلہ کئی دفعہ زیر بحث آچکا تھا اور اس سلسلے میں اقدامات بھی اٹھائے گئے تھے مگر زمینی حقیقت یہ بھی کہ انڈیا کی سرحدیں بلاشبہ ہزاروں کلومیٹر طویل تھیں۔ دشوار گزار ریگستان، دلدلی جنگلات، اونچے پہاڑ اور تند سمندر۔ ان سب کی سوفیصد نگرانی تقریباً ناممکن تھی۔

دیپ راج اپنے مختصر سے آفس کے پتھریلے فرش کو قدموں سے کوٹ رہا تھا جب کیپٹن سندیپ اپنے سیاہ رو چہرے پر دبا دبا جوش لیے اندر داخل ہوا۔ سیلوٹ کے بعد اپنی دو صفحات پر مشتمل رپورٹ کی فائل میز پر رکھتے ہوئے وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

''سر! جھیل میں گشت پر تعینات آرمڈ بوٹس کی یونٹ کی طرف سے یہ رپورٹ ہے۔ اس میں ایک کلیدی کلیو ہے جو ایلس ہیلو کے اغوا کاروں تک پہنچنے میں معاون ہوسکتا ہے۔''

دیپ راج نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کیپٹن سندیپ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سندیپ نے شکریہ ادا کر کے سیٹ سنبھال لی۔

دیپ راج نے میز پر پڑی فائل پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یہ رپورٹ میں زبانی سننا چاہوں گا۔'' سندیپ نے الفاظ کو ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے کہا۔ ''جس رات ایلس ہیلو کا اغوا ہوا، اسی دوپہر ایک کشمیری نوجوان بظاہر تفریح کی غرض سے ڈل جھیل میں سرینگر ہوٹل کے قریب پایا گیا تھا۔''

دیپ راج نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کشمیری اور ڈل میں تفریح۔''

سندیپ نے اس کی بات آگے بڑھائی۔ ''جی سر، اسی سبب ایک ''ہوم گارڈ'' نے اسے مشکوک جان کر اس کی رپورٹ کردی۔''

دیپ راج نے مطمئن انداز میں سرہلایا۔

سندیپ نے مزید کہا۔ ''آرم بوٹ کے جوانوں نے اسے گھیر کر پوچھ گچھ کی تو اس نے مستند شناختی دستاویزات پیش کیں اور چرب زبانی سے غالباً جوانوں کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے اپنا تعلق بھی ہندسرکار کی ایک وفادار فیملی سے بتایا۔ اس رپورٹ کو سامنے رکھ کر میں نے جو تحقیق کی ہے، اس کے مطابق اس وفادار فیملی میں جتنے بھی ''علی ڈار'' نام کے نوجوان ہیں سبھی اپنے گھروں میں پائے جارہے ہیں۔ گزشتہ چند دنوں میں کسی نے بھی سرینگر کا سفر نہیں کیا۔''

دیپ راج کا چہرہ بگڑ سا گیا۔ اس نے آرمڈ بوٹس کے پورے یونٹ کو ایک شاہکار گالی سے نوازتے ہوئے کہا۔ ''ان کی بے پروائی سے آتنگ وادی، ایلس ہیلو کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ یقینی طور پر تفریح کے بہانے ریکی کررہا تھا۔'' پھر اس کا لہجہ تبدیل ہوا۔

''جن جن لوگوں نے اس نوجوان کو دیکھا ہے، سب کو اٹھا کر لے آؤ۔ اس کا کمپیوٹرائزڈ خاکہ بنواؤ، ضرور ہمارے ریکارڈ سے اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ نکل آئے گا۔''

سندیپ نے تن کر کہا۔ ''سر! میرے دماغ میں بھی یہی خیال آیا تھا۔ خاکہ بن رہا ہے اور جس شکارے پر وہ ہوٹل کے قریب گیا تھا اور جس اقامتی شکارے پر اس کا قیام تھا، ان کے مالکان سے ہیڈ کوارٹر میں پوچھ گچھ کا آغاز ہو چکا ہے۔ مجھے یقین ہے جلد ہی آپ کو سنانے کے لیے میرے پاس اچھی خبر ہوگی۔''

دیپ راج نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''ویل، مجھے پسند آئی تمہاری مستعدی۔''

سندیپ کا چہرہ چمک اٹھا۔ اس نے شکریہ ادا کر کے جانے کی اجازت چاہی۔

☆☆☆

علی اپنے گروپ کے ساتھ سرینگر کے ایک نواحی دشوار گزار پہاڑی علاقے میں خیریت سے پہنچ چکا تھا۔ ایلس میلر بھی اس کے ساتھ تھی۔

اس دفعہ ان کا مسکن پہاڑی ڈھلان پر چنار کے درختوں سے گھرا ہوا ایک باغ تھا۔ ڈھلان اور پہاڑی چوٹی سے باغ کی طرف آنے والے راستوں کی نگرانی بے حد آسان تھی۔ چھپنے کے لیے ایک پہاڑی کھوہ بھی تھی جسے دن رات کی مشقت سے وسعت دی گئی تھی۔

یہ ایک تاریک شب تھی۔ علی، پہاڑی کی چوٹی پر ایک چٹان سے پشت لگائے سینے پر ہاتھ باندھے سامنے دیکھ رہا تھا۔ سرینگر شہر کی روشنیاں یہاں سے صاف نظر آرہی تھیں۔ علی کے سینے میں الاؤ سا جل رہا تھا جس کی تپش سے اس کی آنکھیں بھی سُلگ رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا ان ہی روشنیوں میں کہیں تاریکی کے جزیرے بھی تھے۔ جہاں آزادی کے متوالوں پر قیامت ڈھائی جارہی تھی۔

آسمان پر دمکتے ستارے بھی جیسے اس جنت نظیر خطے اور اس کے باسیوں کی حالتِ زار پر افسردہ سے تھے۔ ایلس ہاتھ میں لکڑی کا کپ تھامے اس کے قریب چلی آئی۔ کپ سے بھاپ سی اٹھ رہی تھی۔ ایلس کو خاصا تیز زکام ہو گیا تھا۔ پہاڑی یونٹ کے میزبانوں میں سے ایک خاتون نے جڑی بوٹیوں کا قہوہ سا بنا کر ایلس کو دیا تھا۔ اس کی بھاپ لینے اور قدرے ٹھنڈا ہونے پر پی لینے سے ایلس کو خاصا افاقہ محسوس ہوا تھا۔ یہی سبب تھا جس کے باعث اس وقت بھی لکڑی کا بڑا سا کپ اس کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔

ان دونوں سے تھوڑے فاصلے پر ایک اور ہیولا بھی نظر آرہا تھا۔ یہ آیت تھی۔ ایلس کی تمام تر ذمے داری اسی کے سپرد تھی۔ ایلس کی پنڈلی سے چپکے بم سے منسلک گھڑی

سر! مجھے مبارکباد دیں.... آپ میرے پہلے مریض ہیں

بھی آیت کی کلائی پر تھی۔ دونوں لڑکیوں کے درمیان کشیدگی کے آثار ابھی تک باقی تھے۔ آیت اس سے سختی سے پیش آتی تھی اور ایلس اسے مکمل طور پر نظرانداز کرنے کی کامیاب کوشش میں لگی رہتی تھی۔

ایلس نے ایک گہری نظر علی پر ڈالی۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

علی کی جذبات سے عاری آواز ابھری۔ ''ایک کشمیری کے پاس سوچنے کے لیے اب کچھ رہ ہی نہیں گیا۔''

''تمہاری کیفیت میں سمجھ سکتی ہوں۔'' ایلس کے لہجے میں ہمدردی در آئی۔ ''تم لوگ جسمانی اذیت کے ساتھ ساتھ نہ ختم ہونے والی ذہنی اذیت کے شکنجے میں بھی جکڑے ہوئے ہو۔ میرے لیے یہ کہنا آسان ہے کہ اس وادی کے باشندوں کی اکثریت ذہنی مریض بن چکی ہے۔''

علی کے لہجے میں تلخی آمیز طنز در آیا۔ ''لیکن تمہاری اب تک کی نشر ہونے والی رپورٹس تو اس کے برعکس تاثر دیتی رہی ہیں۔''

''طنز مت کرو۔'' ایلس جھنجلا گئی پھر ایک گہرا سانس لے کر اس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''یاد ہے پہلی ملاقات میں تم نے کچھ کہا تھا؟''

علی کی سوالیہ نظریں ایلس کے چہرے پر جم گئیں۔

ایلس چند لمحے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''میرے بارے میں تم نے خیال آرائی کی تھی کہ میں محض صحافی نہیں ہوں۔''

علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

ایلس نے دھماکا کرنے کے انداز میں کہا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے۔''

علی نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔

ایلس نے مزید کہا۔ ''اور تمہاری یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں کہ میرا میڈیا گروپ جو بظاہر ایک معتبر ادارہ اور

آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کرنے کا علم بردار نظر آتا ہے، ویسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ بکاؤ مال ہے۔ تم لوگ سمجھ رہے ہو ہم نے اب تک جو رپورٹنگ کی ہے، وہ بھارتی اداروں کے مہیا کیے ہوئے مصنوعی ماحول میں کی ہے۔ تم لوگ بالکل غلط سمجھ رہے ہو۔ یہ سب کچھ پلاننگ کے تحت ہوا ہے۔ میرے میڈیا گروپ نے منہ مانگے معاوضے پر یہ خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے گروپ کی ذیلی لابنگ فرمز بھی بھارتی حکومت کو اپنی خدمات دے رہی ہیں۔ جھوٹ کو اس طرح خوشنما لبادوں میں لپیٹ کر فیصلہ ساز ملکوں کے حکمرانوں اور عوام کو دکھایا جا رہا ہے کہ کہیں بھی تم لوگوں کی شنوائی نہیں ہوگی۔ کہیں سے کوئی مضبوط آواز تمہارے حق میں نہیں اٹھے گی۔'' آخر میں ایلس کچھ جذباتی سی ہوگئی۔

علی کی آنکھیں اس کی گہرائی ناپ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا کہ برف تیزی سے پگھل رہی ہے۔ انسانیت سوز مظالم دیکھ کر ایلس کے وجود کی گہرائیوں میں سویا ہوا ''انسان'' بیدار ہو رہا ہے۔

علی کا چہرہ بے تاثر ہو گیا۔ ''ہم دوفریق حالتِ جنگ میں ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں اور ہر ممکنہ ہتھکنڈا آزما رہے ہیں۔ ہمارا دشمن اپنا تسلط برقرار رکھنے کی مجنونانہ خواہش کے ساتھ ہم سے نبردآزما ہے اور ہر مکروہ ہتھکنڈا آزما رہا ہے۔ ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت اور خواہش نہیں ہے۔ ہماری صرف ایک ہی خواہش ہے ہماری ''آواز'' آزاد دنیا تک پہنچے۔ ہمارا موقف دنیا تک پورے سیاہ وسباق سے پہنچے۔ ہمیں دہشت گرد نہیں، حریت پسند کہا جائے اور ہمارے مقابل جو دنیا کی چوتھی بڑی طاقت ہے۔ اس کے دہشت ناک ہتھکنڈوں کی خبر دنیا تک پہنچے کہ مقامی آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے وہ کسی ملکی و عالمی قانون، کسی ضابطے اور اخلاق کو خاطر میں نہیں لا رہی۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کا ''مکروہ چہرہ'' دنیا دیکھے۔ ہماری اس خواہش کو صرف اور صرف غیر جانبدار اور آزاد صحافت ہی پورا کر سکتی ہے۔ تمہارے ادارے کا لوگو چونکہ یہی ہے اسی سب تمہیں اغوا کیا گیا اور تم یہاں پر ہو۔ تمہاری بات درست ہے کہ ہم لوگ یہی سمجھتے رہے کہ جس مصنوعی ماحول تک تمہیں رسائی دی جا رہی ہے۔ تمہاری رپورٹنگ کی بنیاد وہی ہے۔ اب تم نے خود ہی بتا دیا ہے کہ یہ صرف سنہری سکوں کا کھیل ہے۔''

ایلس کا سر ندامت کے احساس کے ساتھ جھک گیا۔

علی نے اس کے جھکے ہوئے سر پر نظر ڈالی اور مزید کہا۔ ''تمہارا اعتراف ظاہر کر رہا ہے کہ تمہارے اندر انسانیت زندہ ہے۔ تم نے جو کچھ دیکھا ہے، غالباً اس نے تمہاری کایا پلٹ دی ہے اور ہماری یہ خواہش کہ ہماری آواز اور حالات وواقعات دنیا تک غیر جانبداری سے پہنچیں...... اس کی گہرائی میں جاؤ گی تو تمہیں اس خواہش کی ''وجہ'' کا اندازہ ہوگا۔ سچ لوگوں کے ضمیر کو جھنجوڑے گا پھر ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہمارے لیے آواز بلند کرنے والے کروڑوں عام لوگ ہوں گے پھر غلامی کی آتشیں زنجیروں کو ٹوٹنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

ایلس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ وہ بڑے جذب سے بولی۔ ''میں تم لوگوں کی آواز دنیا تک پہنچاؤں گی۔''

علی بولا۔ ''اگر تم صدقِ دل سے کہہ رہی ہو تو کشمیر کا بچہ بچہ تمہارا احسان مند رہے گا۔''

''اس کے علاوہ میں تمہاری جو مدد کر سکتی ہوں، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔'' ایلس کی آواز لرز اٹھی تھی۔

''مم...... میں سمجھا نہیں۔'' علی حقیقتاً بوکھلا سا گیا۔

ایلس بھیگی آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ ''مسٹر حریت پسند! تم پھر بھول رہے ہو کہ تم نے میرے محض صحافی ہونے پر سوال اٹھایا تھا اور میں نے اس سے انکار نہیں کیا تھا۔''

علی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ کاسۂ سر میں بھونچال سا مچا تھا۔ صرف اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی انکشاف کے دہانے پر کھڑی ہے۔

ایلس نے ڈرامائی انداز میں انکشاف کیا۔ ''صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ میں سی آئی اے کی فعال رکن بھی ہوں اور سی آئی اے کی جانب سے کشمیر میں ایک مشن پر بھی ہوں۔''

علی کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ سنسنی کی ایک بلند لہر نے اسے سر سے پاؤں تک بھگو دیا تھا۔

دوسری طرف ان کی طویل ہوتی گفتگو نے آیت کو بے آرام سا کر دیا تھا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی اور تاریکی میں علی کے چہرے پر بار بار کچھ پڑھنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

علی کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ایلس نے خوش ذائقہ قہوے کی چسکی لی۔ دونوں کے درمیان سنسنی خیز خاموشی در آئی۔

علی کو اپنی کیفیت پر قابو پانے میں چند لمحے لگے اور

پھر اس نے ایک نئے زاویے سے وار کیا۔ ''خود کو سی آئی اے کی ایجنٹ بتا کر تم بعد میں ''را'' کی ایجنٹ نکل آئیں تو؟'' علی کی سوالیہ نظریں اس کے چہرے پر جم گئیں۔

ایلس کے اندر جیسے کچھ بجھ سا گیا۔ اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تمہیں یقین نہیں آیا؟''

علی کو لگا وار غلط پڑ گیا ہے۔ اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اس بات کو چھوڑو، اپنے ''مشن'' کے متعلق بتاؤ۔''

ایلس کے چہرے پر نظر آنے والی بشاشت غائب ہو گئی تھی۔ وہ جیسے بڑی تیزی سے اپنے خول میں سمٹ سی گئی۔ ''کوئی مشن وغیرہ نہیں ہے۔'' اس نے بڑی بیگانگی سے کہا۔ ''بکواس کی تھی میں نے۔'' وہ تیزی سے واپسی کے لیے مڑ گئی۔

آیت نے اسے پلٹتا دیکھا تو تیزی سے اس کے ہمرکاب ہو گئی۔ ایلس کا رخ پتھروں سے بنے اپنے لیے مخصوص کمرے کی طرف تھا۔ آیت بے شک اس کا سایہ بنی رہتی تھی۔ اس کے علاوہ ایلس کی چھٹی حس اسے احساس دلاتی تھی کہ کچھ اور نادیدہ نظریں بھی اسے اپنے سامنے رکھتی ہیں مگر اس کی محدود نقل و حرکت پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی تھی۔ اس کا سبب یقیناً اس کی پنڈلی سے چپکا لعل بوائے تھا۔

اس پل ایلس کی کیفیت شعلہ جوالہ کی سی تھی۔ چند لمحے پہلے اپنے اپنے سے لگنے والے یہ آزادی کے متوالے کوسوں دور کھڑے نظر آرہے تھے۔ ساری ہمدردی ہوا ہو گئی تھی۔ علی کی بے یقین نگاہیں...... بے اعتبار لہجہ بڑی تکلیف دے رہے تھے۔

چلتے چلتے ہی ایلس نے یہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ آزادی کے متوالوں کا نگرانی کا انتظام خاصا سخت ہے۔ علی، رضا اور حمدان کے علاوہ بھی نصف درجن کے قریب نوجوان آس پاس ہی ہیں مگر جذباتی کیفیت میں اس نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا۔

چنار کے اونچے درختوں کے سائے میں سے گزرتے ہوئے آیت بولی۔ ''علی کے ساتھ اتنی دیر کیا راز و نیاز ہوتے رہے ہیں؟'' اس کا انداز معنی خیز تھا۔

ایک، دو دفعہ ایلس نے محسوس کیا تھا کہ یہ لڑکی، علی میں دلچسپی لیتی ہے۔ تاریک رات میں یہ اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''بے فکر رہو، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں کہ علی کو تم سے چھین لیا جائے۔'' یہ کہہ کر وہ یک دم ہی جھک گئی۔ اس کے ہم قدم آیت اپنی جھونک میں آگے نکل گئی۔

جھکے جھکے ایلس دوڑی اور تیزی سے پلٹتی آیت کو لے کر پتھریلی زمین پر گری۔ گرنے کے سبب آیت کی کمر اور سر پر زور کی چوٹ لگی۔ آنکھوں کے آگے ستارے سے ناچ گئے۔

ایک غصیلی غراہٹ کے ساتھ ایلس اس کے سینے پر سوار ہو بیٹھی۔ ''کتیا!'' ایلس غرائی اور ایک کہنی موڑ کر آیت کی گردن پر رکھتے ہوئے اس بازو کو اپنی گرفت میں لے لیا جس پر لعل بوائے سے منسلک گھڑی بندھی تھی۔ گھڑی ہاتھ میں آتے ہی ایلس ہلاکت خیز لعل بوائے کی نادیدہ زنجیر کو اپنی مرضی کے تابع کر سکتی تھی۔

آیت نے بازو چھڑانے کے لیے زور مارا مگر گردن پر پڑنے والے شدید دباؤ نے جیسے اس کی جسمانی طاقت سلب کر لی تھی۔ اسے سانس رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دوسرے حربے کے طور پر اس نے ٹانگوں کو ہوا میں قوس کے مانند گھما کر خود کو پلٹنا چاہا مگر ایلس کے عیارانہ داؤ کے سبب یہ بھی ممکن نہیں تھا۔ گردن پر پڑنے والا دباؤ اسے اندھیروں کی طرف دھکیل رہا تھا۔

ایلس نے وحشیانہ طاقت صرف کی اور آیت کے گھڑی والے بازو کو کھینچ کر اپنے دوسرے ہاتھ کے قریب لے آئی جس کی کلائی آیت کی گردن پر دباؤ بنائے ہوئے تھی۔

ایلس کے ہاتھ مجنونانہ انداز میں گھڑی سے الجھے۔ اسی وقت ایک چٹان کے اوپر سے ایک سایہ سا جھپٹا۔ ہوا میں تیرتے ہوئے اس سائے کے بازو ایلس کی کمر سے لپٹے اور اگلے ہی پل اس سائے نے ایلس کو آیت کے اوپر سے کسی عقاب کے مانند اچک لیا۔ ٹائمنگ اور مہارت کا یہ جادوئی لمحہ دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا۔ سانس کی آمد و رفت بحال ہوتے ہی آیت کو کھانسی کا دورہ سا پڑا تھا۔ اس کی کلائی سے گھڑی غائب تھی۔ چٹان کے اوپر سے جھپٹنے والا علی تھا۔ وہ اور ایلس ایک، دو لڑھکنیاں کھا کر رک گئے تھے۔ اس دوران ایلس کی کہنیوں کی متعدد ضربیں علی کو سہنی پڑی تھیں۔

علی نے گھما کر ایلس کو رانوں کے نیچے دبایا اور گھڑی والی کلائی جکڑ لی۔ ایلس نے قینچی کی طرح ٹانگیں چلا کر اس کی گردن ٹانگوں میں جکڑنا چاہی مگر علی نے آگے کی طرف جھک کر یہ وار بچایا اور ایلس کے ہاتھ سے گھڑی چھڑا لی۔

ایلس جنگلی بلی کے مانند غرا کر اس پر جھپٹی مگر طرح دے کر علی دور جا کھڑا ہوا۔ ”فرار ہونے کی یہ اچھی کوشش کہی جاسکتی ہے۔“

ایلس کی توجہ علی کی طرف تھی۔ آیت خفت سے سرخ چہرے کے ساتھ اس پر جھپٹی تھی۔ اس دوران قریب ہی نگرانی پر تعینات پہاڑی یونٹ کے دو لڑکے موقع پر پہنچ گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پرانی ساخت کی رائفلیں تھیں۔ دونوں لڑکیوں کو جنگلی بلیوں کے مانند لڑتا دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ اس لڑائی میں واضح طور پر ایلس کا پلڑا بھاری تھا۔

علی کے اشارے پر دونوں لڑکوں نے بمشکل انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کیا۔ دونوں ہی جنونی کیفیت میں غرا رہی تھیں۔

ایلس کو بمشکل پتھریلے کمرے میں بند کیا گیا۔ علی نے رضا کو بلا کر ایلس کی نگرانی اور لعل بوائے سے منسلک گھڑی اس کے سپرد کر دی۔ آیت کو جب کچن کی ذمے داریوں میں حصہ دیا گیا تو وہ آنسو بہاتی ہوئی وہاں سے رخصت ہوگئی۔

ان معاملات سے نمٹ کر علی نے کنکریوں سے اٹے ایک دشوار گزار راستے پر قدم بڑھا دیے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک مسطح حصے تک پہنچ گیا۔ یہ پتھروں سے بنی قبروں والا چھوٹا سا قبرستان تھا۔ یہاں ہوا پہاڑی سے ٹکرا کر نیچے گرتی تھی اور فراٹے بھرتی ہوئی وادی کی طرف نکل جاتی تھی۔

ایک چٹان کی اوٹ میں کسی سادھو، فقیر کی کٹیا نظر آرہی تھی۔ اندر دِیا جل رہا تھا جس کا انعکاس دور سے نظر آرہا تھا۔

علی نے جوتے اتارے اور ٹاٹ کا بوسیدہ سا پردہ ہٹا کر کٹیا میں داخل ہوگیا۔ کٹیا کے فرش پر دوہری تہ والی صاف، ستھری کشمیری دری بچھی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں گاؤ تکیے کے سہارے ایک دبلے پتلے سفید ریش بزرگ نیم دراز تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں اور انگلیاں ہاتھ میں پکڑی تسبیح پر رواں تھیں۔ دیے کی لرزتی روشنی نے ماحول کو پُراسرار سا بنا دیا تھا۔

علی دوزانو ہو کر ادب سے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس کے سامنے ایک روحانی ہستی تھی۔ جنہیں دنیا میر علی شاہ کے نام سے جانتی تھی۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ میر علی شاہ نہ صرف اس پہاڑی یونٹ کے سربراہ تھے بلکہ آزادی کی تحریک کے بانیوں میں سے بھی تھے۔

میر شاہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ ”کیسے ہو علی بیٹا!“ ان کی گمبھیر آواز کٹیا کی محدود فضا میں گونجی۔

”خدا کا شکر ہے۔“ پھر علی کی آواز میں اضطراب در آیا۔ ”جمیل تک کی کیا خبریں ہیں؟“

میر شاہ کی آنکھیں دوبارہ بند ہوگئیں اور ٹھوڑی سینے پر جا ٹکی۔

علی کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔

لحظے بعد میر شاہ بولے۔ ”آزادی کی خاطر اور آزادی کے متوالوں کو محفوظ رکھنے کی خاطر حاجی شاہ، رحمان نانبائی، نصرت بی بی اور ایک نوجوان نے درندوں کے ہاتھ آنے سے پہلے اپنی جان خدا کے حوالے کر دی ہیں۔ ان کی قربانی نے بہت سے آزادی کے متوالوں کو درندوں کی گرفت سے دور کر دیا ہے۔ خدا ان کے عمل کو قبول کرے اور اپنی رحمت کے سائے میں جگہ دے۔“ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھ گئے۔

علی کی آنکھوں میں دھواں سا بھر گیا اور سینے میں انگارے سے دہک اٹھے۔ اس نے بھی ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیے۔ سینے کی اتھاہ گہرائیوں میں چار اور قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

دعا کے بعد ان کے درمیان گمبھیر خاموشی کا وقفہ آگیا پھر اس خاموشی کو میر شاہ نے توڑا۔ ”تمہاری روانگی کے انتظامات مکمل ہیں۔ ایک قافلہ صبح نکلے گا۔ ایک دو دن کے بعد کیا پروگرام ہے تمہارا؟“

علی نے فوراً فیصلہ کیا۔ ”صبح ہی نکل جاتا ہوں۔“

میر شاہ نے اثبات میں سر ہلایا تو علی نے اجازت چاہی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میر شاہ نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے خاص مہمانوں کا کیا حال ہے؟“

”بالکل خیریت سے اور محفوظ ہیں۔“ علی نے ایک محتاط سوال کا محتاط ترین جواب دیا۔

میر شاہ اس جواب سے مطمئن ہوگئے۔

تھوڑی دیر بعد علی سلگتے سینے اور جلتی آنکھوں کے ساتھ ایلس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس تبدیلی کو ایلس نے فوراً بھانپ لیا تھا۔ وہ بولی۔ ”کیا ہوا ہے؟ تمہیں دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہو رہا ہے۔“

”تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔“

ایلس نے چونک کر سوالیہ نظریں اس پر جما دیں۔

”تحریکِ آزادی جموں و کشمیر سے تمہارے میڈیا گروپ سے مطالبہ کرنے جا رہی ہے کہ تمہاری رہائی کے

بدلے تمہاری ''نئی رپورٹ'' دنیا کے سامنے پیش کرے اور مجھے وہ رپورٹ دو گھنٹوں میں چاہیے۔''

علی کے لہجے میں جو کچھ تھا، اس نے ایلس کو لرزا دیا مگر وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی۔ اس نے لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر چینل نے یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا تو پھر تمہارا ردِّعمل کیا ہوگا؟'' دل کی دھڑکنیں بمشکل سنبھالتے ہوئے لیمپ کی مدھم روشنی میں اس نے علی کے تاثرات دیکھنے کی غرض سے اس کے چہرے پر نظریں جمائیں جہاں صرف آگ کی تپش ہی محسوس ہو رہی تھی۔

علی نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ ''اس بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔''

ایلس طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''فیصلہ نہیں ہوا یا تم بتانا نہیں چاہتے کہ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔''

علی کا لہجہ گرم ہوا۔ ''قیاس آرائیاں مت کرو۔ تحریک نہتے، عورتوں اور بچوں پر تشدد کی سخت مخالف ہے۔'' پھر اس کے لہجے نے وہ رنگ پکڑا جو پتھروں کو بھی پگھلانے کی طاقت رکھتا تھا۔ ''تحریک کے ایک ادنیٰ کارکن کا تم سے وعدہ ہے۔ اپنی سی کوشش کے بعد کچھ حاصل نہ ہوا تو تمہیں بحفاظت واپس پہنچا دیا جائے گا۔''

سچائی سے معمور ان الفاظ نے اپنا اثر دکھایا۔ اس کا چہرہ کھِل اٹھا۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''مجھے یقین ہے۔ تمہارا وعدہ سچا ہے۔''

علی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ہاتھ جو گرم جوشی سے بھرا ہوا تھا۔

ایلس نے کہا۔ ''رپورٹ تیار کرنے کے لیے مجھے لیپ ٹاپ چاہیے۔''

علی بولا۔ ''مل جائے گا مگر ہر مواصلاتی رابطے سے کٹا ہوا۔''

''چلے گا۔'' ایلس نے بڑی ادا سے کہا۔

علی واپسی کے لیے مڑا تو ایلس بولی۔ ''تمہاری بدلی ہوئی کیفیت کا سبب پوچھ سکتی ہوں؟ ایسا لگتا ہے تم بے حد طیش میں ہو اور بمشکل اپنی کیفیت پر قابو پائے ہو؟'' ایلس کی نظریں اس پر جم سی گئیں۔

''تحریک کے کچھ جاں نثاروں نے دشمن کے ہاتھ آنے سے پہلے اپنی جان دے کر ہم تک پہنچنے کا راستہ بند کر دیا ہے۔ ان کی شہادت کا بوجھ ہے۔ جسے تم نے محسوس کیا ہے۔''

ایلس کا سر جھک گیا۔ ''افسوس ہوا یہ جان کر۔'' اس نے افسردہ سے انداز میں کہا۔

''افسوس کی ضرورت نہیں۔ ہم اپنے شہدا کا سوگ نہیں مناتے۔'' آنکھوں کی جلن چھپانے کے لیے علی نے منہ پھیرا اور واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔

''میری بات سنو۔'' ایلس کی مضطرب آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

ایلس گھوم کر اس کے سامنے آگئی اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیے۔ اس کے چہرے پر دبا دبا سا جوش تھا۔

''میں مدد کر سکتی ہوں تمہاری۔''

''کر تو رہی ہو۔'' علی نے نرمی سے اس کے ہاتھ کندھوں سے ہٹائے۔

ایلس نے جھنجلا کر ہاتھ جھٹکے۔ ''بے وقوف لڑکے، مدد سے بہت زیادہ مدد۔''

علی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

ایلس نے قدرے مدھم آواز میں کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ میں سی آئی کی طرف سے بھی ایک مشن پر ہوں اور تم نے اس بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا۔''

علی کو جھٹکا سا لگا۔ یہ اہم ترین بات تو وہ یکسر ہی نظرانداز کر بیٹھا تھا، وہ بولا۔ ''اگر تمہارا یہ دعویٰ درست بھی ہے تو ہماری مدد کا اس میں کون سا پہلو نکلتا ہے؟''

''بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔'' ایلس دوبارہ پرجوش ہوگئی۔

وہ آمنے سامنے بیٹھ چکے تو ایلس نے کھوجنے کے انداز میں پوچھا۔ ''تمہاری تحریک کا منشور کیا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں۔'' علی اس سوال سے الجھ سا گیا۔

ایلس نے اپنے خیالات کو مجتمع کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ اگر تمہیں انڈیا سے آزادی مل جائے تو تمہاری تحریک کا منشور کیا ہے؟ خودمختار کشمیر یا تم پاکستان کے ساتھ الحاق چاہتے ہو؟''

آزادی کے سہانے خواب نے علی کی آنکھیں لمحے بھر میں پُرنم کر دیں۔ وہ بھیگی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ظاہر ہے، ہم پاکستان کے ساتھ الحاق کے خواہش مند ہیں۔ ہمارا ایک حصہ پہلے بھی تو پاکستان کے ساتھ ہے۔ ہمارا مذہبی، ثقافتی، جغرافیائی...... ہر رشتہ پاکستان کے ساتھ ہے۔''

ایلس کا چہرہ بجھ سا گیا۔ اس کیفیت کو فوراً ہی علی نے بھانپ لیا، وہ بولا۔ ''ہم مظلوموں کی مدد کی ٹھان لی ہے تو کھل جاؤ۔ جو دل میں ہے زبان پر لے آؤ۔''

اس کے دل گرفتہ لہجے نے ایلس کے دل کی آخری گانٹھ بھی کھول دی۔ وہ گہرا سانس لے کر دھیمے سے مسکرائی اور بولی۔ ”سی آئی اے کی تمام تر دلچسپی خودمختار کشمیر میں ہے۔ چائنا کے سر پر بیٹھنے کے لیے انڈیا جیسے دو منہ والے سانپ کو پالنے کے بجائے امریکا، خودمختار ریاست جموں و کشمیر میں ڈیرا ڈالنا چاہتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی نظریں علی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ ”کیوں، چونک گئے نا؟“

علی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”امریکا کی یہ خواہش کوئی اتنی ڈھکی چھپی بھی نہیں ہے۔ انڈیا چونکہ اس کا فطری حلیف ہے اس لیے وہ اس خواہش کو دبائے ہوئے ہے۔“

ایلس نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”اس خواہش نے پھر شدت سے سر اٹھایا ہے۔ سی آئی اے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی سربراہی میں ایک بے حد خفیہ ڈیسک قائم ہو چکا ہے اور وہ فعال بھی ہو چکا ہے اور اب دل تھام کر سنو۔“ ایلس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ”میرا تعلق اسی ڈیسک سے ہے اور مجھے ایسے کسی طاقتور گروپ سے رابطے کا ٹاسک دیا گیا ہے جو خودمختار کشمیر کا حامی ہو۔“ اب کی بار علی نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کی چمک اور لہجے کی مضبوطی بتا رہی تھی کہ وہ سچ کہہ رہی ہے۔

ایلس نے مزید کہا۔ ”تمہاری تحریک کا جو بھی ایجنڈا یا منشور ہے۔ میں اس پر بحث نہیں کروں گی صرف ایک مشورہ دوں گی کہ فی الحال امریکیوں کو استعمال کر لو۔ ڈھیروں ڈھیر فنڈنگ تمہارے بہت سے مسائل حل کر دے گی۔“

یہ وہ تیر تھا جو سیدھا جا کر علی کے دل پر لگا۔ اس نے نیم رضامندی سے کہا۔ ”تمہارا مشورہ بہت اچھا ہے۔ میں اپنے بڑوں سے بات کروں گا۔“

ایلس نے اس کا کندھا تھپکا۔ ”میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔“

علی، ایلس کے کمرے سے نکلا تو شدید کشمکش کا شکار تھا۔ موجودہ مشن کچھ دیر کے لیے اس کے ذہن سے محو ہو گیا تھا۔

امریکیوں کو وہ اچھی طرح سے سمجھتا تھا۔ وہ بے حد کائیاں تھا۔ انہیں استعمال کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ لازمی طور پر چاہیں گے کہ تحریک عوامی سطح پر خودمختار کشمیر کا نعرہ لگائے اور اپنے منشور میں تبدیلی کرے۔ ایسا کرتے ہی تحریک عوامی مقبولیت کھو دیتی اور یہ بہت بڑا نقصان تھا۔ علی نے سر جھٹک کر اپنی توجہ موجودہ مشن کی طرف مرکوز کی۔ اس معاملے کو بعد میں دیکھا جا سکتا تھا۔

صبح سویرے علی ہندو یاتری کے روپ میں کمبل لپیٹے ایک کھٹارا بس کی چھت پر سوار تھا۔ امرناتھ یاترا سے واپس جانے والے یاتریوں سے بس اوپر، نیچے تک لدی ہوئی تھی۔

☆☆☆

کرنل دیپ راج اور کیپٹن سندیپ کی محنت رنگ لائی تھی۔ علی کی شناخت ہو گئی تھی۔ اس کی شناخت ہوتے ہی سرینگر سے نئی دہلی تک کھلبلی مچ گئی تھی۔

اس کا اصلی نام علی ڈار ہی تھا۔ وہ سرینگر یونیورسٹی کا ہونہار طالب علم اور ہر کشمیری کی طرح سے کشمیر کی آزادی کا حامی تھا۔

ایک جلوس کی قیادت کرتے ہوئے وہ پیرا ملٹری والوں کے ہاتھ چڑھ گیا تھا۔ تین دن کے بدترین تشدد کے بعد جب یقین ہو گیا کہ اس کے اندر سے ساری ”آزادی کی خواہش“ کشید کر لی گئی ہے تو اسے رہا کر دیا گیا۔

اس کے بعد وہ منظر سے غائب ہو گیا۔ اب تین سال سے زائد عرصے کے بعد وہ دوبارہ کشمیر میں دیکھا گیا تھا۔ ہاں، ان تین سالوں میں اس نے پورے بھارتی پنجاب میں سیکیورٹی فورسز کو اپنی بھرپور موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

قوی شبہ کیا جاتا تھا کہ اس کی پشت پر خالصتان کی تحریک ہے۔ سیکیورٹی کے نام نہاد ادارے مسلسل اس کے تعاقب میں تھے۔ پھر اچانک وہ پنجاب سے بھی غائب ہو گیا۔ دوبارہ اسے افغانستان میں دیکھا گیا تھا۔ پاکستان کے خلاف ایک دہشت گردی کی تربیت دینے والے کیمپ کو اس نے تہس نہس کر دیا تھا۔ اس موقع پر ایک سیکیورٹی کیمرے میں اس کی چند سیکنڈ کی فوٹیج ریکارڈ ہو گئی تھی جو اس کی شناخت کا باعث بنی تھی۔

اور اب ہند سرکار کی زبان میں اس خطرناک اور مطلوب ترین آتنگ وادی کو پھر سے کشمیر میں نہ صرف دیکھا گیا تھا بلکہ قوی ترین امکان تھا کہ ایلس میلو کے اغوا میں بھی اسی کا ہاتھ ہے اور افغان اسلحہ سازوں کو کامیابی سے کشمیر لانے کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔

علی کی فوٹیج تیزی سے پھیل رہی تھی۔ جموں و کشمیر کے داخلی اور خارجی راستوں پر خصوصی توجہ دی جا رہی تھی۔ مقامی جاسوسوں کو بھاری انعام کے لالچ کے ساتھ علی کی مخبری کا ٹاسک سونپا جا رہا تھا۔

دوسری طرف قسمت نے پورا ساتھ دیا۔ علی، گرفت مضبوط ہونے سے پہلے جموں و کشمیر کی حدود سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ دو جگہوں پر اسے چیکنگ کے کڑے مراحل سے گزرنا پڑا تھا مگر وہ اور چاروں افغان مہمان ہندو یاتریوں کے روپ میں ہی کشمیر میں داخل ہوئے تھے اور علی مقررہ وقت پر ہی واپس جا رہا تھا۔

☆☆☆

گرداسپور پہنچ کر علی نے حلیہ دوبارہ تبدیل کر لیا تھا۔ اب وہ ایک نوجوان سکھ کے حلیے میں تھا۔ گہما گہمی سے بھرپور گرداسپور کے ریلوے اسٹیشن پر وہ ایک پتھر کی سلیب پر بیٹھا چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ دہلی کے لیے نکلنے والی پسنجر ٹرین کی روانگی میں ابھی خاصا وقت تھا۔

تھوڑی دیر پہلے ایک ادھیڑ عمر قلی نے اس سے ٹائم پوچھا تھا اور نظر بھر کے اسے دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے علی کا دل بے کل سا ہو رہا تھا۔ چھٹی حس خطرے کا الارم بجا رہی تھی۔ علی نے بے چین ہو کر اپنی جگہ چھوڑ دی۔ چور نظروں سے اس نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ بظاہر سب نارمل تھا۔ رات گہری ہو چلی تھی۔ پورا اسٹیشن روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ مسافروں کی بھاگم بھاگ، قلیوں کی دوڑیں۔ ابھی ابھی ایک ٹرین نے اسٹیشن چھوڑا تھا۔ اس کے انجن کا شور، فولادی پہیوں کی گڑگڑاہٹ اور پلیٹ فارم کی لرزش۔

چھٹی حس کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی۔ چھپا ہوا خطرہ اچانک ہی سامنے آگیا۔ علی کے پاس سے گزرنے والا ایک بھاری بھرکم سکھ لڑکھڑا کر گرنے لگا تو غیر ارادی طور پر علی نے اسے سنبھال لیا۔ ''دیکھ کر سردار جی! کیا ہوا؟''

جواب میں بھاری بھرکم سردار جی...... جونک کے مانند اس سے چپک گئے۔ خطرے کے احساس کے ساتھ ہی علی کے جسم میں بجلی سی بھر گئی تھی۔ اس کے سر کی زوردار ٹکر جونک بننے والے سردار کی ناک پر لگی۔ بھاری بھرکم گالی کے ساتھ سردار جی کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ جگہ بنتے ہی علی نے کندھے کی ضرب سے سردار جی کو دور اچھال دیا۔

اسی وقت قریب پہنچ جانے والے سیکیورٹی اہلکار جو سادہ لباس میں ملبوس تھے، وہ، علی پر ٹوٹ پڑے۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ وہ بھڑوں کے مانند علی سے چمٹ گئے تھے۔ علی کے بازو عقب سے ایک حیوانی طاقت کے حامل اہلکار کے شکنجے میں آگئے تھے اور وہ اہلکار اپنی حیوانی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے علی کو اٹھا کر پٹخنے کی کوشش میں تھا۔ دیگر اہلکار قدرے پیچھے ہٹ گئے تھے۔

ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کے ایک کونے میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ حیرت زدہ مسافر تیزی سے ایک طرف سمٹ گئے تھے۔

علی کے ہاتھوں ضرب کھانے والے سردار جی...... زمین بوس تھے اور اب اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اور دہن سے گالیوں کا فوارہ چلائے اپنے لباس میں ہاتھ ڈالے غالباً کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش میں تھے۔ حیوانی طاقت والے اہلکار نے زور لگا کر علی کے پاؤں زمین سے اٹھا لیے۔ اس کی ہانپتی ہوئی فاتحانہ سرگوشی علی کے کان کے قریب سنائی دی۔ ''سب کرا اکڑ سنگھ! تیری کہانی ختم۔''

علی نے کہا۔ ''اتنی جلدی نہیں۔'' ساتھ ہی اس نے سر گھمایا۔ ہلکی سی ٹکر پیچھے والے اہلکار کے رخسار پر لگی۔ اس نے جوش سے جے بجرنگ کا نعرہ لگایا اور علی کو گھما کر پلیٹ فارم پر پٹخ دیا۔

کوئی اناڑی ہوتا تو اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی۔ علی پہلے سے تیار تھا۔ اس نے وجود کو سمیٹتے ہوئے کندھا جھکا لیا۔ ضرب کی شدت سے اس کا کندھا جھنجھنا اٹھا۔ درد کی تیز لہر پہلو میں اٹھی تھی مگر وہ ایک پل کے لیے آزاد تھا۔

پل بھر میں اس نے مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ سردار جی اٹھ گئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں چھوٹے کیلبر کا پسٹل نظر آ رہا تھا۔ جسے وہ ہونقوں کے مانند اِدھر اُدھر گھما رہے تھے۔ اپنے ایک ساتھی اہلکار کی واضح برتری دیکھ کر دیگر اہلکار اپنی جگہ رک گئے تھے۔ اسے پٹخنے والا اہلکار بڑے اعتماد سے اس پر جھپٹا۔ پلیٹ فارم پر پڑے علی کی ٹانگیں ہوا میں برق کی طرح لہرائیں۔ قوس سی بنی اور زد میں آئے حملہ آور کی ٹانگوں سے جا ٹکرائی۔ وہ ''اوغ'' کی آواز کے ساتھ بے توازن ہو کر منہ کے بل پلیٹ فارم پر گرا۔ اگلے ہی پل علی نے جست بھری اور نیچے ریلوے لائنوں پر کود گیا۔ اس کی پھرتی اور مہارت نے جیسے ہر چیز کو ایک لمحے کے لیے مبہوت کر دیا تھا۔

دیگر اہلکار جیسے اچانک ہی ہوش میں آئے اور بھاگو، پکڑو کا شور مچاتے پلیٹ فارم سے نیچے کودے۔ اس وقت تک علی سبقت لے جا چکا تھا۔ خطرہ صرف عقب سے آنے والی گولی سے تھا۔ سب سے پہلے ہتھیار نکالنے والے سردار جی نے بدحواسی میں ہوائی فائر جھونک دیا۔ گولی چلتے ہی ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔

پتھروں پر تیزی سے زِگ زیگ دوڑتے ہوئے علی نے چھلانگ لگائی اور دوسری لائن پر کھڑی پسنجر ٹرین کے

ڈبے کے پائندان تک پہنچ گیا۔ اسی وقت عقب سے فائر ہوا اور علی کے قدموں میں پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔

ڈبے کے دروازے میں کھڑا ہونق سا نوجوان گولی کی آواز کے ساتھ ہی بدحواس ہو گیا اور پلٹ کر بھاگا۔ علی کے لیے راستہ صاف تھا۔ اگلے ہی پل وہ ٹرین کے اندر تھا۔ بدحواس مسافروں کو دھکیلتا دوسرے دروازے سے اس نے پلیٹ فارم پر چھلانگ لگا دی۔ اس کے اور سیکیورٹی اہلکاروں کے درمیان ایک ٹرین حائل تھی۔ اس نے علی کے اعتماد کو دوچند کر دیا تھا۔ اس کے قدموں میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں۔ ایک لمبے تڑنگے لڑکے نے دبکا مار کر اسے پکڑنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش اسے مہنگی پڑی۔ اپنی طرف بڑھتے اس کے بازو کو ہوا ہی میں تھام کر علی نے زوردار جھٹکا دیا۔ اپنے مومینٹم میں جیسے اڑتا ہوا وہ نوجوان کھڑی ٹرین سے جا ٹکرایا۔ اس کا انجام دیکھنے کا علی کے پاس ٹائم نہیں تھا۔

پلیٹ فارم کے دوسری طرف جیسے پڑیوں کا جال سا بچھا تھا۔ ہر طرف ناکارہ پنجر اور مال گاڑیوں کے ڈبے نظر آرہے تھے۔ علی کو یقین تھا کہ وہ ان ڈبوں تک پہنچ گیا تو اہلکار اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکیں گے۔ اس نے طویل جست بھری۔ عقب سے اس دفعہ متعدد گولیاں چلیں جو سیٹی سی بجاتے ہوئے اس کے سر پر سے گزر گئیں۔

اس کے قدموں نے ٹرین کی فولادی پٹری کو چھوا اور وہ دوبارہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ جینز کے ساتھ جوگرز اسے بھاگنے میں مدد دے رہے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ مصنوعی داڑھی اور مونچھیں مارا ماری میں اپنی جگہ چھوڑ چکی ہیں۔ اس نے دوڑتے دوڑتے داڑھی، مونچھ کے ساتھ پگڑی بھی اتار پھینکی۔

دوڑتے دوڑتے اس نے یکلخت رخ تبدیل کیا اور لائن کے ساتھ بنے متروک لائٹ ہاؤس کو اپنی پشت پر لے لیا۔ اس دفعہ آنے والی گولیوں نے لائٹ ہاؤس کی قدیم اینٹوں کو ادھیڑ دیا۔

اگلے ہی پل علی ڈبوں کی بھول بھلیوں میں تھا۔ جب تک اہلکار وہاں تک پہنچتے، علی سامنے ایک گودام کی چھت سے کود کر ریلوے اسٹیشن سے باہر تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں جیسے گرداسپور کی تاریک سڑکوں نے اسے نگل لیا تھا۔

اس واقعے کے ٹھیک تین دن بعد وہ نئی دہلی میں تھا۔ اب وہ بے حد محتاط ہو چکا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی شناخت چھپی نہیں رہ سکی تھی۔ بھوکے بھیڑیے اس کی خوشبو پا چکے تھے۔

☆☆☆

علی کے چکنی مچھلی کے مانند ہاتھ میں آ کر نکل جانے کے سبب کرنل دیپ شدید ڈپریشن کا شکار ہو گیا تھا۔ یہ معما بھی حل ہوتا نظر نہیں آرہا تھا کہ کشمیر میں داخل ہونے کے بعد علی ڈار واپس کیوں گیا ہے؟ واپسی کن مقاصد کے لیے ہے؟

چیک پوسٹوں سے ملنے والے فوٹیج سے یہ پتا چل گیا تھا کہ علی ڈار، ہندو یاتری کے روپ میں کشمیر سے نکلا ہے اور اس سے یہ بھی پتا چل گیا کہ وہ کشمیر میں وارد بھی ہندو یاتری کے روپ میں ہوا ہے۔

اس کھوج کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ علی والے گروپ میں سے چار یاتری لاپتا ہیں۔ کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ نقشہ واضح ہو رہا تھا۔

علی، چاروں اسلحہ ساز افغانیوں کے ساتھ ہندو یاتریوں کے روپ میں آیا تھا اور انہیں محفوظ ٹھکانے پر پہنچا کر کسی نامعلوم مقصد کے لیے واپس چلا گیا۔

علی والے سارے گروپ کے یاتریوں کو اٹھا لیا گیا تھا۔ ان کی مدد اور فوٹیج سے اب چاروں لاپتا ہونے والے یاتریوں کے خاکے بنائے جا رہے تھے۔ جن کے بارے میں یقین کی حد تک شبہ تھا کہ وہی چاروں افغان اسلحہ ساز ہیں۔

یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ چوتھے دن نئی دہلی سے تہلکہ خیز خبر آگئی۔ ایلس ہیلو کو اغوا کرنے والے ذمے داروں کی طرف سے ایک میموری کارڈ کے ساتھ ایک مطالبہ ایلس ہیلو کے میڈیا گروپ کے مقامی آفس کو موصول ہو گیا تھا۔ مطالبہ تھا کہ ایلس ہیلو کی بخیریت رہائی مطلوب ہے تو اس رپورٹ کو پوری دنیا میں آن ایئر کر دیا جائے۔

فوراً ہی میڈیا گروپ اور بھارتی وزارتِ خارجہ کے درمیان ایک ہنگامی میٹنگ کا آغاز ہو گیا۔ دوسری طرف کرنل دیپ کو پتا چل گیا تھا کہ علی کے کشمیر سے روانہ ہونے کی کیا وجہ تھی۔ اس نے کیپٹن سندیپ کو ذمے داریاں سونپیں اور فوراً نئی دہلی کا رخ کیا جہاں اس کا نیا ٹھکانا سیف سٹی پروجیکٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

☆☆☆

نئی دہلی کا ریلوے اسٹیشن اور اس سے ملحقہ ریلوے ملازمین کی رہائشی کالونی وسیع و عریض رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ علی اسی رہائشی کالونی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں مقیم تھا۔ اسے، ایلس ہیلو کے میڈیا گروپ کے ردِعمل کا

انتظار تھا۔

رات نو بجے کے لگ بھگ کوارٹر کا تالا کھول کر ایک ادھیڑ عمر دُبلا پتلا شخص اندر داخل ہوا۔ اس کی آمد مکمل طور سے علی کی نظروں میں رہی تھی۔ یہ ریلوے کے ورکشاپ کا فورمین غازی عبداللہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا اور ایک درمیانے سائز کا شاپنگ بیگ تھا۔ تھوڑی دیر بعد غازی اور علی کمرے میں بچھی دری پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ان کے درمیان اشیائے خورونوش والا شاپنگ بیگ کھلا ہوا تھا اور غازی کے چہرے پر دبا دبا سا جوش نظر آرہا تھا۔

علی نے اس کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے چاچا کوئی خاص ہی خبر ہے۔''

غازی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''ہاں، مگر پہلے کھانا کھالو۔ تم نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔''

علی نے کہا۔ ''ایسی بات بھی نہیں ہے۔ درجن بھر سے زائد کیلوں پر ہاتھ صاف کیا ہے۔''

غازی نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کیلوں سے کیا بنتا ہے۔'' ساتھ ہی اس کے ہاتھ مصروفِ عمل ہو گئے۔

کھانا تقریباً خاموشی سے کھایا گیا۔ کھانے کے بعد غازی نے بشاشت بھرے انداز میں کہا۔ ''علی بیٹا! آج ''کام'' مکمل ہوگیا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے وطن کے کسی کام آسکا۔'' آخر میں اس کا لہجہ آزردہ ہوگیا تھا۔

کامیابی کی خوشی نے علی میں توانائی کی نئی لہر دوڑا دی۔ اس نے ممنونیت بھرے انداز میں غازی کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ ''چاچا! آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان دو ہاتھوں نے اپنے وطن کے لیے کتنا بڑا کام کیا ہے۔'' بے اختیار اس نے غازی کے کھردرے ہاتھ چوم لیے۔ ہاتھ چھڑاتے ہوئے غازی کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے تھے۔

جذباتی لمحے گزر گئے تو علی نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں وہ سب دیکھ سکتا ہوں؟''

غازی بولا۔ ''مجھے یقین تھا تم یہ خواہش ضرور کرو گے۔'' اس نے ساتھ لائے بڑے سے شاپر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ پہن لو۔''

علی نے شاپر کھولا تو اس میں ریلوے ورکشاپ کے ملازمین کی مخصوص وردی اور ہیلمٹ تھا۔ وردی پر جگہ جگہ گریس اور تیل کے دھبے تھے۔

غازی کی مدد سے علی نے وردی پہنی، وردی پر لگی گریس چہرے پر لگائی اور اوپر سے مخصوص ہیلمٹ پہن لیا۔ بادی النظر میں اسے پہچاننا ناممکن ہوگیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ورکشاپ نمبر 7 میں داخل ہورہے تھے۔ جہاں کا فورمین غازی عبداللہ تھا۔ ورکشاپ میں نائٹ شفٹ کے چند ہی ورکر تھے۔ جنہوں نے ہاتھ اٹھا کر اپنے فورمین کو سلام کیا تھا۔ علی پر کسی نے کچھ خاص توجہ نہیں دی تھی۔

☆☆☆

ایلس ہیلو کے میڈیا گروپ کا ردِعمل سامنے آگیا تھا۔ رپورٹ کی جانچ پڑتال کے نام پر انہوں نے چند دن کی مہلت مانگی تھی اور درخواست کی تھی اس دوران ایلس ہیلو کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

درحقیقت حالیہ میٹنگ میں بھارتی وزارتِ خارجہ کے گھاگ افسران بمشکل میڈیا گروپ سے ایلس ہیلو کی بہ خیریت بازیابی کے لیے چند دن مانگنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے علی کے چہرے پر کامیابی مسکراہٹ بن کر ابھری تھی۔ بساط پر بچھی ہر چال اس کے من چاہے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اس نے غازی کی طرف سے مہیا کیا جانے والا شاپنگ بیگ کھولا۔ نئی جینز، شرٹ اور پی کیپ۔ اس نے پی کیپ کو سر پر لگا کر آئینے میں بغور جائزہ لیا۔ وہ جانتا تھا خونخوار دشمن اس کے تعاقب میں ہے اور اس کے پاس وسائل بے بہا ہیں۔ اس کی شناخت ہونے کے بعد اسے سب سے بڑا خطرہ سیکیورٹی کیمروں سے تھا۔ کیمرے زیادہ تر بلندی پر لگے ہوتے تھے۔ پی کیپ لگا کر ان سے خاصی حد تک بچا جاسکتا تھا۔

شام گہری ہونے پر وہ ریلوے کالونی سے باہر نکل آیا۔ دہلی جگمگا رہا تھا۔ بے فکروں کی ٹولیاں، جھلملاتے سائن بورڈ، دکانوں اور مالز میں خریداروں کا ہجوم۔ گاہے بگاہے نظر آنے والے غیر ملکی سیاح، ہر طرف رونق میلا لگا ہوا تھا مگر علی کا دل بجھا ہوا تھا۔ اس کے وطن کشمیر میں تو اس وقت در و دیوار پر جیسے آسیب کا سایہ اُتر آتا تھا۔ سہمے ہوئے کشمیری گھروں میں دُبک جاتے تھے۔ فوجی گاڑیوں کا شور اور فوجیوں کی آمدورفت سے دل ہول سے جاتے تھے۔ ہر پل دھڑکا لگا رہتا تھا کہ فوجیوں کی صورت میں کوئی مصیبت ہی نہ نازل ہوجائے۔

اسی کیفیت میں اس نے بس پکڑی اور پرانی دہلی کے علاقے میں آگیا۔ یہ مسلم اکثریتی علاقہ تھا اور ہر چیز پر مسلم چھاپ نمایاں تھی۔ مسلمانوں اور پسماندگی کا بھارت میں چولی دامن کا ساتھ تھا اس لیے یہاں بھی پسماندگی نمایاں تھی۔

علی نے سائیکل رکشا پکڑا اور اس بدنامِ زمانہ علاقے میں آگیا۔ جہاں سرِشام بھاؤ تاؤ کی دکانیں سج جاتی تھیں۔

فوراً ہی پیشہ ور دلالوں نے علی کو گھیر لیا۔ ان سے بمشکل پیچھا چھڑوا کر علی ایک تنگ اور نیم تاریک اسٹریٹ پر ہولیا۔ تھوڑی دور آیا تو ایک تھڑے پر جینز میں ملبوس ایک لڑکی موبائل فون پر اونچی آواز میں بھاؤ تاؤ کر رہی تھی۔

علی قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔ لڑکی پیشہ ور تھی۔ اس نے فوراً گاہک کو تاڑ کر فون بند کر دیا۔

"آ میرے شاہ رخ! شرما کیوں رہا ہے۔" لڑکی نے بازاری انداز میں بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

علی بولا۔ "میں کھلے دل سے خرچا کروں گا لیکن جگہ کوئی پرسکون ہونی چاہیے۔"

لڑکی کی باچھیں کھِل گئیں۔ "بے فکر رہو۔ نہ پولیسیوں کا خوف نہ کوئی اور ٹینشن...... چل میرے ساتھ۔"

تھوڑی دیر بعد علی اس کال گرل کے ساتھ ایک پرانی سی تین منزلہ عمارت کے دڑبا نما کمرے میں تھا۔ کمرے کی لائٹ جلاتے ہی لڑکی نے ہاتھ پھیلایا۔ "نکال میری فیس اور کمرے کا کرایہ...... اور شرو......" بقایا الفاظ اس کے حلق میں ہی رہ گئے تھے۔ علی نے لپک کر اس کی گردن بازو کے شکنجے میں کس لی تھی۔ لڑکی کا دبلا پتلا جسم مچھلی کی طرح تڑپا مگر حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔

علی نے اس کی پتلی سی گردن کی ایک مخصوص رگ دبائی۔ اس کا مچلتا جسم اینٹھ کر ساکت ہوگیا۔ علی نے آرام سے اسے بدبودار پلنگ پر لٹا دیا۔ اس کے منہ سے رال سی بہنے لگی تھی۔ اس کیفیت میں وہ بڑی قابلِ رحم لگ رہی تھی۔

اسے لٹا کر علی نے سُن گن لی۔ دور کسی فلیٹ سے زن و مرد کے جھگڑنے کی آواز آرہی تھی۔ اس کے علاوہ عمارت میں لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

علی نے پرس نکال کر اس میں سے پانچ پانچ سو کے دو نوٹ نکال کر لڑکی کے گریبان میں اڑسے اور اس کا موبائل فون پرس میں سے نکال لیا۔ موبائل میں اتنا بیلنس تھا کہ علی کا کام چل جائے۔

علی نے دماغ میں محفوظ ایک لینڈ لائن... نمبر ملایا۔

چوتھی بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔ "ہیلو!" ایک دبنگ سی مردانہ آواز اُبھری۔

علی نے کہا۔ "میں کسی بھی وقت دوبارہ کال کروں گا۔ ایلس ہیلز اغوا کیس کا جو بھی انچارج ہے، مجھے اس نمبر پر ملنا چاہیے۔"

دوسری طرف جو بھی تھا اسے جیسے ہزاروں وولٹیج کا جھٹکا لگا تھا۔ "کک......کون ہے؟"

"تم سب کا باپ......!" علی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "اور یہ نمبر ایک پیشہ ور لڑکی کا ہے۔ اسے تنگ بھی نہ کرنا۔" یہ کہہ کر علی نے کال کاٹی اور تیزی کے ساتھ کمرے اور پھر عمارت سے باہر نکل آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ پرانی دہلی کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔

علی جس منصوبے پر عمل پیرا تھا۔ اس پر وہ گزشتہ 9 ماہ سے کام کر رہا تھا۔ اس کا ہوم ورک مکمل تھا۔ وہ اس وقت دہلی سے دور ایک نیم پہاڑی علاقے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ چوٹی پر ایک سیلولر کمپنی نے ٹاور لگایا تھا۔ اس ٹاور کے ساتھ ہی الیکٹرک سپلائی کا دس ہزار کے وی کا کھمبا بھی تھا۔ دور دراز علاقے تک بجلی پہنچانے کے لیے الیکٹرک سپلائی کمپنی نے یہ اسٹرکچر حال ہی میں مکمل کیا تھا ابھی بجلی کی سپلائی شروع نہیں ہوئی تھی۔

سیلولر کمپنی کے ٹاور پر تعینات گارڈ اور جنریٹر آپریٹر کو علی نے بےبس کر کے باندھ دیا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی اس نے بجلی کے کھمبے پر چڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی پشت پر ایک بڑا سا تھیلا بندھا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ سیلولر کمپنی کے ملازمین میں سے ایک کا موبائل بھی اسی کے پاس تھا۔

☆☆☆

ایک حساس ادارے کے آفس میں کی جانے والی... کال نے خوب اثر دکھایا تھا۔ وہ لائن سیف سٹی پروجیکٹ کے ہیڈ کوارٹر سے ڈائریکٹ کر دی گئی تھی۔ جہاں سیکڑوں ٹی وی اسکرینز کے درمیان رکھے فون سیٹ کے قریب کرنل دیپ راج جلے پاؤں کی بلی کے مانند ٹہل رہا تھا۔

پرانی دہلی سے علی کی فوٹیج مل گئی تھی۔ اس کی مدد سے دہلی میں اس کا ممکنہ ٹھکانا کھوجا جا رہا تھا۔ کم از کم دس جگہ وہ سیف سٹی کے کیمروں کی زد میں آیا تھا۔ ان دس جگہوں پر سادہ لباس اہلکار تعینات ہو چکے تھے۔ پچاس کلومیٹر کے دائرے میں چار عدد کوئیک رسپانس ٹیمیں چوبیس گھنٹے تیار تھیں۔ چاروں ٹیموں کے پاس ہیلی کاپٹرز اور بلیک کیٹ کمانڈوز تھے جو سرعت کے ساتھ ہیلی کاپٹرز سے کہیں بھی

ڈراپ کیے جاسکتے تھے۔

اس کے علاوہ مواصلاتی سیارے کی بھی مدد حاصل تھی۔ دو افراد پر مشتمل ٹیم کال کے آتے ہی تیس سیکنڈ کے قلیل وقت میں کال کرنے والے کی پن پوائنٹ لوکیشن دینے کی ذمے دار تھی۔

☆☆☆

بلندی پر ہوا خاصی تیز تھی۔ اس کے علاوہ اندھیرے کا بھی راج تھا۔ علی نے چھوٹی سی ٹارچ آن کر کے منہ میں دبالی اس کے بعد اس نے کمر پر بندھا تھیلا کھولا۔ اس میں مخصوص قسم کا جھولا اور جھولے سے منسلک ہونے والی جیکٹ تھی۔

ٹارچ کی روشنی کے مختصر سے دائرے میں اس نے جھولے کی فولادی پٹری، ہوا میں جھولتی بجلی کی فولادی تار پر جمائی۔ دونوں کا سائز ایک تھا۔ پٹری اپنی جگہ پر بالکل فٹ بیٹھی تھی۔ علی نے جھولے کو بریک لگائی اور جھولے سے منسلک ہونے والی جیکٹ کس کر اسے جھولے کے مخصوص ہک سے جوڑ دیا۔ وہ مکمل طور سے تیار تھا۔

موبائل سنبھال کر اس نے نمبر ملایا۔ فوراً ہی کال پک کر لی گئی۔ دوسری طرف موجود بے چینی کو محسوس کر کے علی کے خشک ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''ہیلو، کرنل دیپ راج بات کر رہا ہوں۔'' مضبوط لب و لہجے کی حامل آواز علی کی سماعت سے ٹکرائی۔

علی بولا۔ ''یقیناً مجھے ایلس ہیلو کیس کے انچارج سے بات کرنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔''

لہجے میں تمسخر محسوس کر کے کرنل دیپ کا حلق کڑوا ہو گیا۔ خون نے کنپٹیوں کی طرف جوش مارا۔ خود کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا اندازہ درست ہے۔ تم کون ہو؟ اور مجھ سے کیوں بات کرنا چاہتے تھے؟''

علی نے کہا۔ ''ایلس ہیلو کو میں نے اغوا کیا ہے۔ اس کی رہائی کے بدلے میرا ایک چھوٹا سا مطالبہ ہے جسے نہ ماننے کی صورت......''

کرنل نے اس کی بات کاٹی۔ ''تم ایک مطالبہ ایلس ہیلو کے میڈیا گروپ سے بھی کر چکے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے کرنل کی بے چین نظریں گھڑی کی سوئیوں پر تھیں۔ تیس سیکنڈ کا مختصر سا سفر اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا۔

علی نے اپنے ترکش کا اہم ترین تیر چلایا۔ ''میں اس مطالبے سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ رپورٹ جہاں میڈیا گروپ کے لیے بہت مشکل امتحان ہے وہاں تمہاری عیارانہ ڈپلومیسی اس کے مقابلے میں دس جھوٹی رپورٹیں لے آئے گی۔ اس رپورٹ کے آن ائر ہونے کا کشمیر اور کشمیری عوام کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہونا۔''

تیس سیکنڈ پورے ہو گئے تھے۔ علی کی لوکیشن ٹریس ہو گئی تھی مگر چھاپا مار ٹیم کے نائب انچارج کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ یہ لوکیشن ان کے بنائے دائرے سے باہر کی تھی۔ وہ تیزی کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

نائب انچارج سے اشاروں، کنائیوں میں بات کرتے ہوئے کرنل نے کہا۔ ''یہ فیصلہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ ویسے بھی تم لوگ مطالبے کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ بہتر ہے ایلس ہیلو کو غیر مشروط طور پر رہا کر دو۔'' کرنل کو وہ قدرے کمزور محسوس ہوا تھا۔

علی نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں فون بند کر دیتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں پنہاں دھمکی نے کرنل کو بوکھلا دیا۔ وہ جلدی سے بولا۔

''نہیں، تم اپنا مطالبہ بتاؤ، ہم ایلس ہیلو کی بہ خیریت رہائی چاہتے ہیں۔''

اس دوران ہاتھ سے لکھا ہوا ایک کاغذ کرنل کے سامنے آ گیا جس پر لکھا تھا۔ دہلی سے دو سو ساٹھ کلومیٹر دور اندر کوٹ کا ایک پہاڑ...... پولیس چوکی بتیس کلومیٹر......فوجی چھاؤنی بیالیس کلومیٹر......ائر ڈیفنس کی ایک بیٹری......نو کلومیٹر۔ کہاں سے مدد لی جائے؟

کاغذ دیکھتے ہی کرنل جھنجلا گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ علی، ان سے ایک قدم نہیں کئی قدم آگے تھا۔ اس نے کاغذ دور پھینکا اور ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر غرایا۔ ''سب کو بولو، علاقے کو گھیر لیں۔'' ماؤتھ پیس پر رکھے ہاتھ کی خفگی بھری خاموشی کو علی نے محسوس کر لیا۔

وہ بولا۔ ''مجھ تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کر لو۔ اس حوالے سے میں کوئی دھمکی نہیں دوں گا۔ تم مکمل طور سے آزاد ہو۔''

اس دفعہ کرنل خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ ''شٹ اَپ! ہم ایسا کچھ نہیں کر رہے۔ تم اپنا مطالبہ سامنے لے آؤ جو سانپ نکالنا ہے نکالو۔''

کرنل کے طیش اور جھنجلاہٹ کی وجہ علی خوب سمجھ رہا تھا۔ وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''ایلس ہیلو کے بدلے ہمارے رہنما بشیر نبی آزاد کی رہائی۔''

کرنل دیپ کے سینے میں خاص قسم کی اتھل پتھل مچ

گئی۔ اس نے بمشکل اپنے ہیجان کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تمہارا مطالبہ اپنے بڑوں تک پہنچا دیتا ہوں۔ تم تھوڑا سا وقت دو۔“

علی نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تمہارے پاس 72 گھنٹے ہیں۔ 72 گھنٹے بعد جب میں رابطہ کروں تو آزاد صاحب تہاڑ جیل سے سرینگر میں ہونے چاہئیں۔ اگر منظور نہ ہو تو ایلس ہیلو کی لاش تمہیں مل جائے گی۔“

”دیکھو...... جذباتی......“

علی نے اس کی بات کاٹی۔ ”ٹھیک 72 گھنٹے بعد دوبارہ بات ہوگی۔ اپنی فوج کا لانگ رینج اور قابلِ اعتماد وائرلیس سیٹ ”دھرماتما“ اپنے قریب رکھنا۔ میری بی ٹیم اس پر رابطہ کرے گی۔“ یہ کہہ کر علی نے کال کاٹ کر موبائل پہاڑی پر پھینکا اور بریک والا لیور اٹھا دیا۔ اگلے ہی پل وہ بلندی سے پستی کی جانب حقیقت میں ہوا سے باتیں کرتا ہوا جا رہا تھا۔

ٹھیک چار گھنٹوں کے بعد وہ اپنے دوسرے میزبان کے پاس حفاظت سے پہنچ گیا تھا۔ اس کے پہنچتے ہی وہ میزبان جو زعفران اور خشک میوہ جات کا بیوپاری تھا۔ علی کا تفصیلی پیغام لے کر جموں و کشمیر کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کرنل دیپ کو ایک دفعہ پھر علی تک پہنچنے میں ناکامی ہوئی تھی مگر اب اسے کامیابی کا راستہ نظر آ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ نہ صرف علی اور افغان اسلحہ سازوں تک پہنچ جائے گا بلکہ آزادی کی خواہش مند تحریک کے بھی پرخچے اڑا دے گا۔

سینے پر سجنے والے تمغوں کے احساس کے ساتھ اس کا سینہ ابھی سے چوڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹر کی پھڑپھڑاہٹ سنی تو طمانیت کے احساس کے ساتھ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش میں لگ گیا۔ اسے طویل سفر کرنا تھا۔

☆☆☆

وزارتِ داخلہ کے دو اور ایک فوجی آفیسر پر مشتمل ٹیم جھاڑکھنڈ کی فوجی چھاؤنی کے ایک پُرسکون حصے میں داخل ہوئی۔ یہاں افسران کے لیے بنگلوز بنے ہوئے تھے۔

ٹیم جس بنگلے میں داخل ہوئی اس کے گیٹ پر کرنل منوہر جوشی کی تختی لگی ہوئی تھی۔ ٹیم کو اندر آتا دیکھ کر سفید آرام دہ لباس میں ملبوس شخص جو ہاتھ میں بڑی سی قینچی پکڑے پودوں کی کاٹ چھانٹ کر رہا تھا، چونک سا گیا۔ وہ پچاس سال کا بھاری جسم کا سرخ و سفید شخص تھا جس کے چہرے پر رنگی ہوئی سیاہ چھوٹی چھوٹی مونچھیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔

ٹیم کے ارکان اس کے قریب چلے گئے۔

جونیئر فوجی آفیسر نے گفتگو کا آغاز کیا۔ ”مسٹر آزاد! وزارتِ داخلہ کے یہ افراد خصوصی اجازت نامے کے ساتھ آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔“

سرخ و سفید شخص جو بشیر نبی آزاد تھا اور ساری دنیا کی نظروں میں تہاڑ جیل کی صعوبتیں کاٹ رہا تھا۔ کسی انہونے خوف سے لرز سا گیا۔ اس نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وزارتِ داخلہ کے افسران کے ساتھ خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ کیا اور انہیں اندر چلنے کی دعوت دی۔

ایک آفیسر نے لان چیئرز کی طرف دیکھا۔ ”میرے خیال میں یہاں بیٹھنا مناسب ہے۔ ہم زیادہ وقت نہیں لیں گے آپ کا۔“

آزاد نے اس خواہش کے احترام میں سر جھکایا۔ وہ سب لان چیئرز پر جا بیٹھے۔ حسبِ فرمائش آزاد نے چائے کے لیے بول دیا۔

چائے کی آمد سے پہلے ہی آزاد نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔ ”آپ لوگوں کی آمد مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ محسوس ہو رہی ہے، کیا خیال ہے آپ لوگوں کا؟“

وزارتِ داخلہ کا ایک گھاگ آفیسر مسکرایا۔ ”طوفان تو نہیں آزاد صاحب! ہلچل ضرور کہہ سکتے ہیں۔ ایک غیر ملکی خاتون صحافی کی رہائی کے بدلے میں ”آپ“ کے لوگوں نے آپ کی رہائی کا مطالبہ کر دیا ہے۔“

آزاد کو محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں کے نیچے سے کھسک سی گئی ہے۔ اس نے کرسی کے ہتھے تھام لیے۔

وزارتِ داخلہ کے آفیسر نے مزید کہا۔ ”بھگوان سے اور زیادہ کیا مانگیں۔ غیر ملکی صحافی بھی رہا اور آپ بھی کشمیری آتنگ وادیوں کی صفوں میں۔ ہمارا کام کتنا آسان ہو جائے گا۔“ دوسرے آفیسر نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

آزاد کے چہرے پر خوف اور تذبذب نمایاں تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں بولا۔ ”سونا رہل اسٹیشن والے واقعے کے بعد وہ، میری طرف سے مشکوک ہو گئے تھے۔ یہ ان کی کوئی چال بھی ہو سکتی ہے۔“

”کم آن...... مسٹر آزاد۔“ آفیسر کا لہجہ روکھا ہوا۔ ”دیش کو آپ کی ضرورت ہے۔ رہی بات آتنگ وادیوں کے نزدیک مشکوک ہونے کی تو یہ خدشہ ذہن سے نکال

دیں۔ اسے بھی ہمارے سوشل میڈیا ونگ کا کمال سمجھیں۔ گاہے بگاہے آپ کی صعوبتیں، مصیبتیں اور تشدد برداشت کرتی تصویریں اور کہانیاں تہاڑ جیل سے ''لیک'' ہو کر پورے جموں و کشمیر میں پھیلتی رہتی ہیں۔ آپ ان لوگوں کے ہیرو ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو آننگ وادی کسی اور کی رہائی کا بھی مطالبہ کر سکتے تھے اور آپ کو وہاں کون سی صدیاں گزارنی ہیں۔ ایک، دو ٹاسک ہیں...... وہ پورے ہوتے ہی آپ کو دوبارہ ''گرفتار'' کرلیں گے اور آپ دوبارہ سے اس گوشۂ عافیت میں اپنی تیسری بیوی کے پاس آموجود ہوں گے۔''

دوسرے آفیسر نے شگفتہ انداز میں گرہ لگائی۔ ''اور یہ بھی ممکن ہے چوتھی بیوی آپ کشمیر سے ہی ساتھ لے آئیں۔''

جونیئر فوجی آفیسر کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

آزاد کو اپنی پیشانی پر نمی محسوس ہوئی' اس نے چور نظروں سے اندرونی عمارت کی طرف دیکھا۔ جہاں اس کی کم عمر بیوی اور نو ماہ کا بچہ موجود تھے۔ اس نے گہرا سانس لے کر ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

عرصے بعد، اس کی زبان بار، بار اس کھوکھلے دانت کو چھونے لگی تھی جہاں ایک خاص چپ لگائی جا سکتی تھی۔

☆☆☆

کرنل دیپ، سرینگر کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں موجود تھا۔ آزاد بھی اس کے ساتھ تھا۔ آزاد نے پرانا سا کشمیری چغا پہن لیا تھا۔ اس کا حلیہ ممکنہ حد تک ایک صعوبت زدہ قیدی کا سا بنا دیا گیا تھا۔

کرنل دیپ راج بے حد مطمئن تھا۔ ترپ کا پتّا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس دفعہ آزاد کو ریسیو کرنے والوں کو چھاپنے کا کوئی پروگرام نہیں بنایا گیا تھا۔ کشمیری حریت پسند خود ہی ایک تباہ کن ''ٹائم بم'' کو گود میں لینے کے لیے تیار تھے۔ کرنل کو اس ٹائم بم کو صرف انہیں ڈیلیور کرنا تھا۔

علی کے دیے 72 گھنٹے پورے ہونے والے تھے۔ مخصوص وائرلیس سیٹ اس کے سامنے میز پر رکھا تھا اور پوری طرح سے فعال تھا۔ اسرائیلی ٹیکنالوجی پر مشتمل ''دھرماتما'' نامی یہ سسٹم خاصا محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی لوکیشن اور فریکوئنسی ٹریس کرنا آسان نہیں تھا۔ کرنل نے ایسی کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔

یہ وائرلیس سسٹم بھارتی آرمی بہت بڑی تعداد میں استعمال کرتی تھی۔ یہ سسٹم مختلف واقعات میں صرف کشمیر میں درجن بھر سے زائد تعداد میں چھینے جا چکے تھے۔ یقیناً ایسا ہی کوئی آپریٹس ایلس ہیلو کے اغوا کاروں کے ہاتھ بھی لگا تھا اور وہ اس کی افادیت سے بھی بخوبی واقف تھے۔

72 گھنٹے پورے ہو چکے تھے۔ آپریٹس ابھی تک کسی مخصوص پیغام سے محروم تھا۔ جنرل فریکوئنسی پر دیگر معاملات سن سن کر کرنل کا سر چکرانے لگا تھا۔ اس کی بے چینی عروج پر تھی۔

اچانک ہی جنرل فریکوئنسی پر ایک نوجوان کی پُرسکون آواز ابھری۔ ''کرنل دیپ راج! جلدی سے بتا دو، آزاد صاحب، تمہارے ساتھ ہیں اوور......''

کرنل جلدی سے بولا۔ ''ہاں، تمہارا مطالبہ مان لیا گیا ہے۔ بتاؤ، قیدیوں کا تبادلہ کہاں ہوگا؟ اوور......''

''تم...... آزاد صاحب کے ساتھ سرینگر ریلوے اسٹیشن پہنچو، اپنے علاوہ تمہارے پاس ایک اضافی آپریٹس بھی ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ ہمیں فضا میں کوئی ڈرون اور ہیلی کاپٹر بھی نظر نہیں آنا چاہیے۔ ایک دوربین بھی رکھ لینا، اوور......''

کرنل نے پوچھا۔ ''یہ تبادلہ ریلوے اسٹیشن پر ہوگا؟ اوور......''

نوجوان ہنسا۔ ''تم سے اس احمقانہ بات کی توقع نہیں تھی کرنل، جلدی پہنچو۔ تمہارے پاس وقت کم ہے۔'' اس کے ساتھ ہی رابطہ منقطع ہو گیا۔

خفت کے شدید احساس سے کرنل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے واقعی احمقانہ بات کر دی تھی۔ جنرل فریکوئنسی کے سبب یہ ''یادگار چھترول'' مزاح بن کر انڈین آرمی میں پھیلنے والی تھی کرنل نے زوردار گھونسا میز پر مارا۔ ''دیکھ لوں گا تمہیں۔'' اس نے دانت نکوسے۔

آزاد کو لے کر سخت سیکیورٹی میں دو بکتر بند گاڑیاں سرینگر ریلوے اسٹیشن پہنچ گئیں۔ ان کا پڑاؤ وی، آئی، پی مومنٹ کے لیے مخصوص ایک لاؤنج میں تھا۔

کرنل نے دو اضافی آپریٹس بھی ساتھ لے لیے تھے۔ اس کا ذہن ہر طرف سے ہٹ کر ایلس ہیلو کی رہائی اور آزاد کو نشانے تک پہنچانے میں لگا ہوا تھا۔ ایلس ہیلو کے میڈیا گروپ کا دباؤ بے حد شدید تھا۔

کرنل گلے میں دوربین اور ہاتھ میں آپریٹس پکڑے لاؤنج میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

آپریٹس پر کھڑ کھڑاہٹ اُبھری۔ فوراً ہی پہلے والے نوجوان کی آواز کھڑکھڑاہٹ پر غالب آ گئی۔ ''پہنچ گئے

اسٹیشن کرنل؟ اوور......"

"ہاں، اب کیا کرنا ہے؟ اوور۔"

"سامنے دیکھو، دہلی سے بالنیان کول پاور پلانٹ کے لیے کوئلہ لے کر آنے والی گاڑی، پلیٹ فارم نمبر دو پر نظر آرہی ہے؟ اوور۔"

کرنل نے بے اختیار نظریں اٹھائیں۔ پرانا سا انجن اور معدنی کوئلے سے بھری ٹرالیوں والی ٹرین صاف نظر آرہی تھی۔ وہ بولا۔ "نظر آرہی ہے، کرنا کیا ہے؟ اوور۔"

"دھیرج کرنل دھیرج۔" نوجوان کی آواز کے سکون میں ذرا بھی جذباتی تلاطم نہیں آیا تھا۔ حالانکہ حالات ہنگامہ خیز محسوس ہو رہے تھے۔ نوجوان کی دوبارہ آواز ابھری۔ "ٹرین کا اسٹاپ پندرہ منٹ کا ہے۔ آزاد صاحب کے ہاتھ اگر بندھے ہیں تو کھول کر ایک آپریٹس انہیں دے دو۔ تم ٹرین ڈرائیور کے ساتھ انجن میں سوار ہو جاؤ۔ آزاد صاحب کو سب سے آخری ڈبے میں سوار کروا دو اوور۔"

کرنل طنزیہ انداز میں ہنسا۔ "تاکہ آزاد صاحب، جب چاہیں مکمل "آزاد" ہو کر ٹرین سے چھلانگ لگائیں اور یہ جا اور وہ جا۔" کرنل کا لہجہ سخت ہوا۔ "آتنک وادیوں کے سامنے جھکنا ہمیں کسی صورت منظور نہیں۔ یہ صرف ایک غیر ملکی خاتون مہمان کا معاملہ ہے جو ہم نے اتنی لچک دکھائی ہے۔ تبادلہ صرف آمنے سامنے ہوگا۔ منظور نہیں تو جاؤ بھاڑ میں اوور۔"

دوسری طرف چند لحظے کے لیے خاموشی چھا گئی پھر نوجوان کی آواز اُبھری۔ "تمہاری بات تسلیم کی جاتی ہے کرنل! تم اپنے اہلکار آزاد صاحب کے ساتھ سوار کر سکتے ہو مگر ان کے ہاتھ آزاد ہوں اور آپریٹس ان کے پاس ہونا چاہیے اوور۔"

کرنل کا چہرہ چمکنے لگا مگر اس نے سخت لہجہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہمیں خاتون مہمان کی سلامتی عزیز ہے۔ ہماری طرف سے کوئی "مس ایڈونچر" نہیں ہوگا۔ تمہاری طرف سے ایسا کچھ ہوا تو یاد رکھنا بھسم کر دیے جاؤ گے اوور......"

"بے فکر رہو کرنل! ہمیں بھی آزاد صاحب کی بہ خیریت رہائی مطلوب ہے اوور اینڈ آل۔"

یہ مکالمہ سنتے ہوئے آزاد قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ واقعی آزادی کے متوالوں کا ہیرو تھا جو گزشتہ ڈھائی سال سے تہاڑ جیل کی صعوبتیں کاٹ رہا تھا۔

ٹرین روانہ ہوئی تو کرنل انجن روم میں ڈرائیور اور معاون ڈرائیور کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں سہمے سہمے سے تھے۔ انہیں بے چوں و چرا کرنل کے احکامات ماننے کا پابند کر دیا گیا تھا۔

سب سے پیچھے گارڈ والے ڈبے میں جدید ترین ہتھیاروں سے لیس چار اہلکار آزاد کے ساتھ تھے۔ بیک اپ کے طور پر سرینگر ائیربیس پر ایک گن شپ اور ایک تیز رفتار ٹرانسپورٹ ہیلی کاپٹر ریڈ الرٹ پر تھے۔ ٹرین روانہ ہوئی تو نوجوان نے آزاد کو مخاطب کر کے کہا۔

"آزادی مبارک ہو آزاد صاحب اوور۔"

آزاد نے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "خیر مبارک، یہ صرف تم جیسے شیر دل جوانوں کی ہمت اور جوانمردی کے سبب ممکن ہوا ہے۔ کشمیر کی مائیں تم جیسے بیٹوں پر فخر کریں گی اوور۔" آزاد نے خوب لفاظی کا مظاہرہ کیا۔

نوجوان بولا۔ "آپ کی ذرہ نوازی ہے صاحب! ہمارا رول ماڈل تو آپ ہیں۔ جنہوں نے دشمن کے سامنے کبھی گردن نہیں جھکائی۔ کشمیر کا بچہ بچہ آپ کو سلام کرتا ہے۔ آپ آئیں اور ہماری قیادت سنبھالیں اوور۔"

یہ مکالمہ سُن کر مسلح اہلکار اپنی ہنسی دبائے ایک دوسرے کو معنی خیز اشارے کر رہے تھے۔ آزاد کے دل سے سارے شکوک و وہم مٹ گئے تھے۔ وہ پُرجوش انداز میں بولا۔ "جیتے رہو میرے بچے۔ میں جلد ہی آ کر تمہیں سینے سے لگاؤں گا اوور۔"

"جی ضرور، میں بھی اس لمحے کے لیے بے تاب ہوں اوور۔"

بالنیان سے بیس کلومیٹر پہلے نوجوان نے کرنل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ڈرائیور سے کہو ٹرین کی رفتار 10 کلومیٹر فی گھنٹا کر کے اور اگلے کانٹے سے ٹرین کو سونارل اسٹیشن کی طرف موڑ لے اوور۔"

کرنل نے من و عن یہی ہدایت ڈرائیور کو دے دی۔

ڈرائیور نے ٹرین کی رفتار کم کرتے ہوئے تذبذب سے کہا۔ "صاحب! یہ متروک راستہ ہے، آگے کوئی رکاوٹ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اسٹیشن سے پہلے ایک گہری کھائی پر قدیمی برج ہے۔ ٹنوں کوئلے کے ساتھ مشکل ہے کہ برج ٹرین کا وزن سنبھال سکے۔"

کرنل نے بے پروائی سے کہا۔ "تم چلو، جنہوں نے بلایا ہے انہوں نے بھی اس بارے میں سوچا ہوگا۔ ان کا بھی ایک بے حد خاص بندہ ٹرین میں ہے۔"

ڈرائیور کے پاس حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ٹرین سالخوردہ پٹریوں کو کراس کرتی دھیمی رفتار سے آگے بڑھنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ قدیم برج نظر آنے لگا۔ جس کی کمزوری اور بوسیدگی کا ذکر ٹرین ڈرائیور نے کیا تھا۔

گاڑی نے خم کاٹا تو کھڑکی سے لگے کھڑے آزاد کو بھی وہ برج نظر آگیا۔ اس کا دل لرزنے لگا۔ اسی کی مخبری کے سبب اسی برج کے اطراف ان چودہ حریت پسندوں کو فورسز نے گھیر لیا تھا جنہوں نے BSF ہیڈکوارٹر پر حملے کے لیے اپنی جانیں قربان کر دینے کی قسم کھائی تھی۔

ان چودہ جوانوں کو فورسز نے ایک تنگ درے میں گھیر کر ان پر فاسفورس بموں کی بارش کر دی تھی۔ وہ چودہ بارودی آگ میں جل کر شہید ہو گئے تھے۔

نوجوان نے کرنل سے کہا۔ ”دوربین سنبھال لو کرنل! سامنے کی طرف گول چٹان پر تمہیں ایلس ہیلو نظر آنے والی ہے اوور۔“

کرنل نے جلدی سے دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ جلد ہی اسے ایک گول اور اوپر سے مسطح چٹان پر ایلس ہیلو نظر آ گئی۔ وہ اسی لباس میں تھی۔ جس میں اسے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ اطمینان سے ٹانگیں کھڑی کر کے ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ ڈالے ٹرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کرنل نے اطراف میں دوربین گھمائی اور حیران رہ گیا۔ ایلس کے اردگرد مسلح تو کیا کسی ذی روح کا نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اسی وقت ٹرین گڑگڑاتی ہوئی برج میں داخل ہو گئی۔ ٹرین کے وزن سے واقعی برج لرز اٹھا تھا۔ ڈرائیور کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگی تھیں۔

کرنل نے دانتوں پر دانت جما لیے۔

نوجوان نے آزاد کو پکارا تو آزاد نے کہا۔ ”جی میرے بچے!“

نوجوان بولا۔ ”آپ کو یہ علاقہ اور برج دیکھ کر کچھ یاد آ رہا ہے اوور۔“ اس کا انداز بڑا سنسنی خیز تھا۔

نوجوان کے لہجے کو ٹٹولتے ہوئے آزاد نے مصنوعی ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جگہ تو میرے سینے پر گھاؤ کی طرح نقش ہے۔ یہیں ہمارے جوانوں کو ظالموں نے جلا کر مارا تھا اوور۔“

نوجوان کا لہجہ یکلخت تبدیل ہوا۔ اسی وقت ٹرین کا آخری ڈبا بھی برج میں داخل ہو گیا۔ خود پر بمشکل قابو رکھا نوجوان گرجا۔ ”تیرے منہ میں کتے کی زبان ہے۔ وطن کے غدار۔ تیرے لالچ کے سبب وہ شیر جوان بے بس کر کے گھیر لیے گئے تھے۔“

آزاد کو ٹرین اور برج کے ساتھ پوری کائنات بھی لرزتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے بمشکل تھوک نگل کر کہا۔ ”ک ک...... کیا کہہ رہے ہو تم...... بب...... بیٹا۔“

نوجوان پھنکارا۔ ”مت کہو اپنی بدترین زبان سے مجھے بیٹا۔“

جنرل فریکوئنسی کے سبب کرنل بھی یہ گفتگو سن رہا تھا۔ ایک پل کے اندر اس پر انکشاف ہو گیا کہ جسے وہ اپنی فتح سمجھتا رہا ہے، وہ درحقیقت اس کی شکست ہے۔ اسے صرف ایک مہرے کی طرح استعمال کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اس کی چھٹی حس نے خطرے کا سنگین الارم بجایا۔ انجن اور تین ابتدائی ڈبے برج سے نکل چکے تھے۔

کرنل نے پل بھر میں فیصلہ کیا اور آپریٹس سنبھال کر ٹرین سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس کی دیکھا دیکھی ڈرائیور اور معاون ڈرائیور نے بھی چھلانگ لگا دی۔

نوجوان آتشیں لہجے میں آزاد سے کہہ رہا تھا۔ مرنے کے لیے تیار ہو جا۔ یہاں بھٹکتی ان چودہ شہیدوں کی روحیں تیرا استقبال کرنے کو بے چین ہیں۔“

آزاد کی زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی۔ اس کے ساتھ موجود اہلکاروں کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔

اسی وقت مہیب گڑگڑاہٹ گونجی پھر یکے بعد دیگرے دو دھماکے ہوئے اور آزاد والا ڈبا آگ کے گولے میں تبدیل ہو گیا۔

برج کا ایک ستون منہدم ہوا تو برج اس طرف سے بیٹھ گیا۔ ٹرین اپنے پورے وزن کے ساتھ برج کے جنگلوں سے ٹکرائی اور اسے توڑتی ہوئے نیچے گہری کھائی میں جا گری۔ ایک دھماکے نے برج پار کر جانے والے انجن اور چند ڈبوں کو باقی ٹرین سے جدا کر دیا۔ انجن اور ڈبے اختتامی رکاوٹوں کو روندتے ہوئے ایک پہاڑی سے جا ٹکرائے تھے اور وہیں تھم گئے تھے۔ آزاد کی چیخیں بڑی دردناک تھیں۔ وہ اور اس کے ساتھ موجود اہلکاروں کی جلتی ہوئی باقیات باقی ماندہ ٹرین کے ساتھ کھائی میں تنکا تنکا ہو کر بکھر گئی تھیں۔

کرنل دیپ راج ایک پتھر سے کمر ٹکائے گم صم تھا۔ لمحوں میں ٹرین اور برج تنکے کے مانند بکھر گئے تھے۔ اسے یہ سب فلمی سین لگ رہا تھا۔

اس کے قریب رکھے آپریٹس پر نوجوان مسلسل چیخ رہا

تھا۔ ”تم زندہ ہو کرنل!اوور۔“

کرنل نے خود کو سنبھال کر آپریٹس اٹھایا۔ ”تم نے مارنے میں کوئی کسر چھوڑی تو نہیں تھی اوور۔“

”تمہیں مارنا اب بھی بے حد آسان ہے مگر یہ ہمارے ایجنڈے میں فی الحال نہیں ہے۔ غدار کے ساتھ چلنے والوں کی ذمے داری تمہارے سر ہے۔ ایلس ہیلو کو ہم نے رہا کر دیا ہے۔“ اس کے ساتھ ہی نوجوان کی آواز آنا بند ہو گئی۔

چار اہلکاروں اور ایک ”مہرے“ کی موت کے بدلے ایلس ہیلو کی کامیابی کا کریڈٹ......سودا بُرا نہیں تھا۔ کرنل دیپ راج کے جسم میں جیسے بجلی سی بھر گئی تھی۔

☆☆☆

چار ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ پھر رفتہ رفتہ کھائی میں بکھرا معدنی کوئلہ اور سونار بل اسٹیشن پر بیکار کھڑے پرانے سے ٹرین انجن کے کل پرزے ایک پہاڑی غار میں منتقل ہونے لگے۔

فورمین غازی عبداللہ کے کاریگر ہاتھوں نے کچھ خاص پرزے اور مشینری اس طرح سے انجن میں نصب کی تھی کہ اسے علیحدہ سے شمار کرنا بے حد مشکل تھا۔ یہ سب بھی رفتہ رفتہ پہاڑی غار میں پہنچ گیا تھا۔

معدنی کوئلہ فولاد پگھلانے میں بے حد کارآمد تھا۔ اس پہاڑی غار میں ایک چھوٹی سی اسلحہ ساز فیکٹری معرض وجود میں آرہی تھی۔ جہاں جلد ہی چھوٹے ہتھیار بنانا شروع ہو جاتے۔

☆☆☆

حالات سازگار ہوتے ہی علی کشمیر آیا تو آیت نے اسے ایلس ہیلو کا لکھا خط تھما دیا۔ خط تھماتے ہوئے اس کی ستارہ آنکھوں میں شرگیں شوخی اور چہرے پر سرخی تھی۔ جس کی فوری سمجھ علی کو نہیں آئی تھی۔

خط تھما کر آیت فوراً ہی وہاں سے بھاگ گئی تھی۔

شستہ انگریزی میں ایلس نے لکھا تھا۔

”میں بہت سی تلخ اور کچھ شیریں یادیں لے کر یہاں سے جا رہی ہوں لیکن میں......تم سب لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھوں گی، خاص طور پر تمہیں......

تمہارے جانے کے بعد میری آیت سے دوستی ہو گئی تھی۔ اس کی مدد سے میں نے کشمیری عورتوں کی بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں عصمت دری اور ہراساں کیے جانے کے واقعات پر ایک رپورٹ تیار کی ہے۔ میں درجنوں متاثرہ لڑکیوں اور عورتوں سے ملی ہوں۔ ان پر ہونے والے مظالم جان کر میری بنیادیں تک ہل گئی ہیں۔ مہذب معاشرے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک انسان دوسرے انسان پر اتنا ظلم کر سکتا ہے۔

مجھ سے جو بن پڑا، میں تم لوگوں کے لیے کروں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے پورے کشمیر سے... اور میری پیشکش پر غور ضرور کرنا۔ مجھ سے جب بھی رابطہ کرنا چاہو، دنیا کے کسی بھی ملک سے اس نمبر پر کال کر لینا۔ ایک نمبر لکھنے کے بعد اس نے دوبارہ لکھا تھا۔ معذرت کے ساتھ تمہاری ذاتی زندگی میں دخل دے رہی ہوں۔ آیت بہت پیاری اور معصوم لڑکی ہے۔ بہت پیار کرتی ہے تم سے۔ اسے پلیز، اپنی زندگی میں شامل کر لو۔ اب میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ تم دونوں ازدواجی بندھن میں بندھ کر میرے ملک میں میرے مہمان بنو، کاش......میری یہ خواہش پوری ہو جائے۔

میری نیک خواہشات تم دونوں اور تمہاری آزادی کی تحریک کے ساتھ ہیں۔ مجھے یقین ہے بہت جلد تمہارا وطن دشمن کے تسلط سے آزاد ہو جائے گا۔ اجازت چاہتی ہوں......تم سب کی ایلس ہیلو۔“

آزادی کے خواب کے ساتھ ہی علی کی آنکھیں جل اٹھی تھیں۔ وہ جیسے اپنے آپ سے بولا۔ ”ایلس ہیلو! مجھے بھی وہ ستارہ آنکھوں والی لڑکی اچھی لگتی ہے۔ تمہاری خواہش سر آنکھوں پر مگر ہمارے خواب تک ظالم درندوں نے چھین لیے ہیں یا پھر آنکھوں کے ساتھ ساتھ خواب بھی چھلنی کر دیے ہیں۔ فی الحال ہماری آنکھوں میں آزادی کے سلگتے خواب ہی ہیں۔

تمہاری زبان مبارک ہو۔ ہمیں آزادی مل جائے تو ضرور تمہاری مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوں گے۔ اگر دیر ہو گئی تو پھر ہماری قبروں پر دیا جلانے کے لیے تم آجانا۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھیں بیدردی سے مسل ڈالی تھیں۔ قریب ہی ایک دیوار کی اوٹ میں کھڑی آیت نے بمشکل اپنی سسکیاں روکی تھیں اور علی کی تقلید میں آنکھیں مسل ڈالی تھیں۔

دونوں کی بھیگی آنکھوں میں ایک نیا عزم اور آزادی کے سلگتے خواب چمک رہے تھے۔ ایسے خواب وہ برسوں سے دیکھتے آرہے تھے......ان کی آنکھوں کے سامنے نئے سال کا سورج طلوع ہو رہا تھا......اس کے ساتھ ہی ان کے دلوں میں اُمیدوں کے نئے چراغ جل اٹھے تھے۔

❖❖❖